غالب نمبر
مسلک
1998
گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن ۔ ملتان

پیش کردہ
خلیق انجم

علمی وادبی مجلّہ

1998ء

مسلک

غالب نمبر

سیشن
1996-97ء

سرپرست

پروفیسر ڈاکٹر طاہر تونسوی
(پرنسپل)

مجلس ادارت (اردو)

پروفیسر ڈاکٹر مختار ظفر
نوشی انجم (متعلمہ بی ایڈ)

مرتب

پروفیسر ڈاکٹر مختار ظفر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ○

القرآن

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

اِنَّمَآ اَنَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا

کمپیوٹر کمپوزنگ : قمر خاں کمپوگرافک بابر مارکیٹ ملتان

مطبع: علی بھائی پریس، شاہین مارکیٹ ملتان

ناشر: پرنسپل گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن ملتان

عکس ترتیب

صفحہ نمبر

اقبالیات

تعلیمات

اخلاقیات

تنوعات

شعریات

کالجیات

معروضات

گزشتہ سال مسلک (۹۶-۱۹۹۵ء) کی اشاعت پر ہم نے لکھا تھا کہ اسے ۱۹۹۷ء میں شائع ہونا تھا مگر ہم اسے ۱۹۹۸ء میں پیش کر رہے ہیں -- ایک سال بعد اسی پرانی بات کو پھر دہرا رہے ہیں--- اب سیشن ۹۷-۱۹۹۶ء کا ہے لیکن سال ۱۹۹۹ء کا' سوال یہ ہے کہ یہ دو سال کہاں غائب ہو گئے ؟----- ایک سال تو ہم سے ہوا------ اور ایک سال بہت پہلے قریباً" بائیس سال قبل سے----- تب سے بی ایڈ کا سیشن ایک سال پیچھے ہے اور وقت ایک سال آگے۔ ہم اسے وقت رواں کے ساتھ ملانے' قدم بقدم چلانے اور منزل بمنزل پہنچانے کی کوشش کرتے رہے ہیں' لیکن وقت اور سیشن کا فرق مٹائے مٹتا نہیں اور ملائے ملتا نہیں' اگر ایسا کرتے ہیں تو

اہل گلشن' اسے گلشن کا زیاں جانتے ہیں

اس پس منظر میں' کالج میگزین کی اشاعت میں بعض اوقات ایک آدھ ہاتھ لب بام رہ جاتا ہے مگر نہ تو ہم کمند کو ٹوٹنے دیتے ہیں اور نہ ہی "عشق کی ایک جست میں طے کردیا قصہ تمام" پر عمل کرکے دو سالوں کے سفر کو ایک سال میں طے کرتے ہیں بلکہ زینہ بزینہ منزل تک پہنچتے ہیں------ آہستہ پاسی' لیکن راہ طلب میں محوکار تو رہتے ہیں اور یوں منزل کھوٹی نہیں کرتے------ اور داناؤں کا قول بھی ہے کہ "سہج پکے سو میٹھا ہو" کیونکہ-------

ہوا کرتا ہے خوشبو کا سفر آہستہ آہستہ

چنانچہ یہ شمارہ جسے ہمیں ۱۹۹۸ء میں پیش کرنا تھا' اسے ۱۹۹۹ء میں شائع کررہے ہیں۔ اس طرح کی تاخیر پر گزشتہ سال ہم نے اعتذار سے کام لیا تھا ------------- اس سال توجیہہ سے ....

پچھلا شمارہ پاکستان "گولڈن جوبلی نمبر" تھا جو پاکستان کی پیدائش سے نصف صدی بعد شائع ہوا مگر سرکاری تحریک پر' گو یہ سرکاری تحریک' ادارہ ہذا کی طبعی افتاد میں' وطن دوستی کے موجزن جذبوں کی بناء پر طبعی تحریک کا رنگ اختیار کر گئی جس کے نتیجے میں ہماری یہ قلمی کاوش اہل دانش کے حلقوں میں بڑی سراہی گئی-------- یہ "غالب نمبر" ہے۔ اور اس میں گوشہ غالب شناس بھی شامل ہے جو غالب کی پیدائش سے دو صدیاں اور (دو سال بعد) شائع کیا جا رہا ہے' مگر کسی بیرونی تحریک پر نہیں' بلکہ ادارہ ہذا کے علمی مزاج کی خالصتاً" ادب پروری اور سربراہ ادارہ کے ادبی مزاج کی خاص غالب دوستی کی بناء پر-------- گو یہ بڑی بات نہیں' کہ علمی ماحول میں ادبی مزاج یہی کام کیا کرتے ہیں-------- مگر بات بڑی بھی ہے کیونکہ جنوبی پنجاب کے تعلیمی اداروں میں اسی درسگاہ کا اعزاز ہے کہ یہاں غالب کی دو سو سالہ ولادت منانے کے لئے ایک "بزم غالب" تشکیل ہوئی ------- ایک سیمینار منعقد ہوا --------- اور مجلّے کا ایک خصوصی نمبر نکالا گیا' محض اس تخلیقی ہستی کی عظمتوں کو سلام کرنے اور اس کے افکار نو کو عام کرنے کے لئے ----- نہ ستائش کی تمنا' نہ صلے کی پروا ------- یہ امتیاز کی بات ہے' کوئی دعویٰ مقصود نہیں کیونکہ ایسا کرکے ہم اپنی کاوش کے معیار اور وقار کو گھٹانا نہیں چاہتے۔

مجلّہ ہذا میں شامل اشاعت "غالبیات" کی تشکیل میں' ہم نے اپنی کوششوں کو ادارے کے طلبہ و طالبات اور اساتذہ کی کاوشوں تک محدود نہیں رکھا بلکہ ان نقادان فکروفن کی جستجوؤں کو بھی شامل کیا ہے جو مطالعہ غالب میں اختصاص یا نقد و نظر میں معیار خاص کا درجہ رکھتے ہیں ----- اس بناء پر یہ طویل حصہ' غالب کے فکروفن کے بہت سے پہلوؤں پر محیط ہو گیا ہے ----- جس کے لئے ہم ان تمام کرم فرماؤں کے سپاس گزار ہیں جن کی نگارشات سے ہم نے خوشہ چینی کی ہے۔

"گوشہ سلیم اختر' ڈاکٹر" کے عنوان سے جو نگارشات شامل ہیں' وہ اس لئے نہیں کہ موصوف سے سربراہ ادارہ کی سعادت مندی یا ہماری ان سے نیاز مندی ہے بلکہ اس لئے' کہ تفہیم غالب میں موصوف نے ایسا

زاویہ نظر فراہم کیا ہے جس سے غالب کی فکر نو کے اسرار کھلنے اور تہہ در تہہ کیفیات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے' چنانچہ یہ اظہار عقیدت بھی درحقیقت غالب فہمی کی توسیع کے حوالے سے ہے۔

یہ ادارہ' چونکہ معلم ساز ہے' اس لئے اس کے مزاجی تقاضوں کے مطابق' مجلّے میں تعلیمی مضامین کی عکس ریزی زیادہ ہوتی ہے' لیکن زیر نظر شمارے میں' ایسے مضامین کی گرانباری کم ہے مگر گرانقدری کم نہیں۔ چنانچہ "تعلیمات" کے زیر عنوان جتنے مضامین بھی ہیں' وقت کے تقاضوں کا جواب ہیں' ان کے علاوہ' بہت سے دیگر موضوعات اور ادب و شاعری نے اسے بوقلموں بنا دیا ہے' اس کے باوجود ہمیں تشنہ لبی کا احساس ہے۔ اور

تشنہ لب ہیں جستجوئے بحر میں ---- قطرہ شبنم ہو یا دریا کوئی

اس درسگاہ میں ہر نئی کلاس کے ایک ہی سیشن کو تعطیلات گرما کی انتہاء سے لے کر ابتداء تک ہی مکمل کرنا ہوتا ہے لہٰذا اس عرصہ قلیل میں ایک نصاب طویل کی تدریس کے علاوہ ہم نصابی سرگرمیوں کا اہتمام اور ان کے انعقاد کی تربیت کرنا ہوتی ہے ----- اس کے لئے یہاں ایک باقاعدہ اور منضبط ٹیوٹوریل سسٹم جاری ہے۔ چنانچہ مباحثے' مذاکرے' ایکسٹرنل لیکچرز' ادبی پروگرام' قومی دنوں کی تقریبات کا انتظام اور بین الکلیاتی تقریبات میں شرکت اور نمایاں کامرانیاں اسی سسٹم اور اس کے تحت سوسائٹیوں کی دین ہیں۔ حاصل یہ کہ گزشتہ تین سال سے یہ کالج زنانہ بین الکلیاتی تقریبات میں چیمپئن' ٹرائی جیت رہا ہے۔ پھر Mid-Session میں ایک امتحان بھی منعقد ہوتا ہے' کھیلوں کی سالانہ تقریبات بھی اور ایک جلسہ تقسیم انعامات بھی -------- ان تمام سرگرمیوں کی تفصیل کے لئے ایک الگ رسالے کی ضرورت ہے۔ اسی لئے زیر نظر شمارے میں ان سرگرمیوں کا تذکرہ اور تفصیل بہت کم ہے ------ مثلاً" جلسہ تقسیم انعامات کی رپورٹ اور جناب پرنسپل کا خطبہ استقبالیہ شامل نہیں کیا جا سکا۔ اسی طرح کھیلوں کی رپورٹ اور اس کے متعلقات کی تفصیل سے بھی صرف نظر کیا گیا ہے ------ دیگر تقریبات کے تذکرے بھی شامل نہیں۔

مضامین کی ترتیب میں حکمت کو بنیاد بنایا گیا ہے مثلاً" ابتدائیہ (تغنیات) دیکھئے۔ حمد باری اور نعت سے آغاز حسب معمول ہے۔ لیکن وطن عزیز اور پھر ادارے کے لئے بھی نظمیں' یہ نئی بات ہے۔ یوں کل سے اکائی کی طرف سفر کر کے' اکائی کی علمی و ادبی کارکردگی پیش کی گئی ہے۔ جس کا آغاز نظم "دائرہ" سے ہوتا ہے۔ اس خوبصورت نظم کی تخلیق اور ہمیں عنایت پر ہم جناب تاثیر وجدان کے شکرگزار ہیں ------ میں جناب ڈاکٹر اسلم انصاری کا بے حد شکرگزار ہوں کہ آپ نے میری درخواست پر غالب کی فارسی نعت اور آئیہ نور (القرآن) کا منظوم ترجمہ کیا جو قارئین کے لئے دلچسپی اور بصیرت افزائی کا باعث ہوگا۔

معروف ادیب' محقق اور نقاد اور سربراہ ادارہ جناب ڈاکٹر طاہر تونسوی جو ادبی توسیع کا بڑا حوالہ ہیں' کا میں احسان مند بھی ہوں کہ آپ کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی مجلّہ ہذا کی ترتیب' تشکیل اور اشاعت کا باعث بنی ------- اور ان سے معذرت خواہ بھی' کہ آپ کی خواہش اور کوشش کے باوجود' ہم اس شمارے کو بروقت مرتب نہ کر سکے۔

آخر میں تمام احباب کا شکریہ جنہوں نے جس حوالے سے بھی اس شمارے کی ترتیب و اشاعت میں معاونت کی' قمر خاں اور جناب اختر عزیز بھی لائق تشکر ہیں کہ انہوں نے حسن و خوبی کے ساتھ اسے کمپوزنگ اور طباعت کے مرحلوں سے گزارا۔

حرف آخر یہ کہ بزعم خویش' ہم اس شمارے کا جو بھی معیار سمجھیں' لیکن فیصلہ بہرحال ناقدین اور قارئین کے ہاتھ میں ہے ----- ہم تو یہی کہہ سکتے ہیں کہ

طے کیا ہمت نے میری منزل مقصود کو

ڈاکٹر مختار ظفر

تغنیات

شخصیات (خاکہ۔ پرنسپل)

نورِ تحمید

(آیۂ نور کا منظوم ترجمہ)
ڈاکٹر اسلم انصاری

خدا ہے
زمینوں کا اور آسمانوں کا نور،
مثل نور کی اس کے ایسے ہے
جیسے کہ اک طاق ہے............
اور اس طاق میں جل رہا ہے چراغ............
چراغ ایک فانوس میں ہے،
وہ فانوس ایسے ہے جیسے چمکتا دمکتا ستارہ
یہ روشن ہے، اس تیل سے (جل رہا ہے)
جو ہے اک درختِ مبارک کا تیل
درختِ مبارک کہ زیتون ہے،
جو مشرق کا ہے اور نہ مغرب کا ہے
اور ایسا ہے جیسے کہ آتش کے چھونے سے
پہلے ہی جل اٹھتا ہے اس کا روغن
(یہ سمجھو کہ) ہے نور پر اور نور!
خدا اپنے اس نور سے رہ دکھاتا ہے،
جس کو بھی چاہے ہے
وہ راہ دینا!

نعت بزبان فارسی

از: مرزا اسد اللہ خاں غالب

حق جلوہ گر ز طرزِ بیانِ محمد است
آرے، کلامِ حق بزبانِ محمد است
آئینہ دارِ پرتوِ مہر است ماہتاب
شانِ حق آشکار زشانِ محمد است
تیرِ قضا ہر آئینہ از ترکشِ حق است
اما کشاد آں زکمانِ محمد است
دانی، اگر بہ معنیٔ لولاک وارسی
خود ہر چہ از حق است از آنِ محمد است
ہر کس قسم بدانچہ عزیز است، می خورد
سوگندِ کردگار بہ جانِ محمد است
واعظِ حدیثِ سایۂ طوبیٰ فروگذار
کاینجا سخن زسروِ روانِ محمد است
بنگر دو نیمہ گشتنِ ماہِ تمام را
کان نیمہ جنبشی زبنانِ محمد است
ورخود زنقشِ مُہرِ نبوت سخن رود
آں نیز نامور زنشانِ محمد است
غالب، ثنائے خواجہ بہ یزداں گذاشتم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمد است

(غزلیاتِ غالب، مطبوعاتِ مجلسِ یادگارِ غالب، پنجاب یونیورسٹی، لاہور 1969ء۔ ص۔68)

منظوم ترجمۂ اردو

از: ڈاکٹر اسلم انصاری

حق جلوہ گر ہے طرزِ بیانِ حضور سے
بے شک، کلامِ حق ہے زبانِ حضور سے
آئینہ دار، پرتوِ خورشید کا ہے ماہ
شانِ حق آشکار ہے شانِ حضور سے
تیرِ قضا بر آئینہ ترکش میں حق کے ہے
پر ہے کشاد اس کی کمانِ حضور سے
جانو، جو تم پہ معنئ لولاک کھل سکیں
تخلیق کا فروغ ہے آنِ حضور سے
اپنی عزیز چیز کی کھاتے ہیں سب قسم
سوگندِ کردگار. ہے جانِ حضور سے
واعظ، تو ذکرِ سایۂ طوبیٰ کو چھوڑ دے
ہے اب تو بحث سروِ روانِ حضور سے
کس طور سے دو نیم ہوا چاند، دیکھیے
یہ نیم جنبش آئی بنانِ(1) حضور سے
گر بات نقشِ مُہرِ نبوت کی چل پڑے
وہ خود بھی نامور ہے نشانِ حضور سے
غالب، خدا پہ چھوڑی مدحت رسول کی
آگاہ بس وہی تو ہے شانِ حضور سے

تصریح: (1) بَنان (ف) بنانہ (بمعنی سرانگشت) کی جمع، مراد ہے انگلیوں کے سِرے۔
(یہ ترجمہ ڈاکٹر مختار ظفر صاحب کی فرمائش پر کیا گیا۔)

میرے پیارے وطن

عاصی کرنالی

میرے پیارے وطن! چشمِ اقوام میں تیری عزت رہے، تیری حرمت رہے
میرے پیارے وطن! ارضِ اسلام پر تیرا سایہ رہے، تیری برکت رہے
دیکھ کتنے شہیدوں کی ضو تجھ میں ہے، کن مقدس چراغوں کی لَو تجھ میں ہے
تیرے انفاس میں یہ حرارت رہے، تیرے جذبات میں یہ تمازت رہے
تیری تشکیل کا واقعہ ہو گیا، اس صدی میں بھی اِک معجزہ ہو گیا
اپنی تاریخ کا یہ تسلسل رہے، اپنی تہذیب کی یہ روایت رہے
اپنے فکر و نظر، اپنے علم و خبر، اپنے فضل و ہنر سب میں تو جلوہ گر
اپنی گفتار کو، اپنے کردار کو، اپنے افکار کو تجھ سے نسبت رہے
ہم قدم سے قدم کو ملاتے چلیں، راہ در راہ پرچم اڑاتے چلیں
منزلوں منزلوں جگمگاتے چلیں، دل میں روشن چراغ محبت رہے
تو کہ خطہ ہے اللہ کے نام کا، تو کہ گڑھ ہے شریعت کے پیغام کا
تو کہ مضبوط قلعہ ہے اسلام کا، تیری رفعت رہے، تیری وسعت رہے
تیری صبحیں فروزاں رہیں، تیری شامیں چراغاں رہیں
تیرے شاداب موسم سلامت رہیں، ہم سلامت رہیں، تو سلامت رہے

اگر تم سے ہو سکے تو عالم بنو، یہ نہ ہو تو متعلم بنو، یہ نہ ہو تو کم از کم ان سے بغض تو نہ رکھو۔
(عمر بن عبدالعزیز)
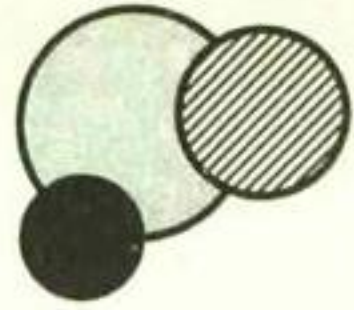
شاعر: پروفیسر تاثیر وجدان

یہ نظم اقبال کے تعلیمی نصب العین "بچے کی انفرادیت کی نشو و نما" کے زیر اثر لکھی گئی ہے۔ دائرہ دراصل دائرۃ العلم ہے جس سے مراد مثالی استاد ہے تاہم ثانوی حیثیت میں اس سے مراد مثالی درسگاہ بھی ہے۔ علم کی وسعتوں کو دائرہ بن کر اپنے اندر گھیر لینے والا یہ مثالی استاد جو تعلیم کی مثالیت پسندی کو واقعیت سے مربوط رکھتا ہے، میری نظر میں، خود ہی مدرسہ بھی ہے، مدرسے کا نصاب بھی اور مدرسے کا ہمدرد اور سازگار ماحول بھی ...... تعلیمی نظام میں اگر.. متحرک ہے تو نسلِ موجودہ کی افق تا افق پھیلی ہوئی پوری کائنات متحرک ہے اور اگر خدانخواستہ وہ ساکن اور خاموش ہے تو پھر سب کچھ ساکن اور خاموش ہے، درسگاہیں بھی، درسگاہوں کی لائبریریاں بھی اور درسگاہوں کی سائنسی تجربہ گاہیں بھی کیونکہ سارے نظامِ زندگی میں انقلاب کا نقطہ ماسکہ وہی ہے۔ جس ہستی ﷺ نے "بعثت معلماً" فرمایا تھا وہ ساری انسانی کائنات میں انقلاب کا واحد مرکز بن کر ابھری تھی۔ وہ ہستی ہر طرح سے بے مثال اور یگانہ روزگار تھی، جو ماضی اور مستقبل کے زمانوں کو آخری سرحدوں تک اپنی دور رس رحمت ماب شعاعوں سے ہمیشہ کے لئے منور کر گئی۔

اے جہاں بیں!

اے اسیرِ گردشِ پیہم

مرے سیّار دوست!

سیرِ گل کے والہانہ شوق میں تو بھی کبھی

دیکھ آ کر نسلِ نو کے نازِ خودرو کے چمن

دیکھ خود کو ڈھونڈتی کمسن بہاروں کا فروغ
رفعتوں کی سمت اٹھتی، نارسیدہ نُدرتوں کا ایک منظر
تازگی کی زرفشاں بالیدگی کا سروزار
عصر زندہ کی نئی تابندگی کی جلوہ گاہ
دائرہ جس کے لئے ابرِ بہار، ابرِ کریم
دائرہ کی مہربان، ہمدرد سانسیں
اس کے ناآسودہ خوابوں، آرزوؤں کے لئے
نم سے معمور، ایک بادِ سازگار
روح کے پردوں میں چپکے چپکے آنکھیں کھولتے
نیم خوابیدہ، غنودہ تازگی کے طائروں کو
پَرکشائی کی نوید
نیلگوں نکھرے خلا میں پرفشانی کا پیام
عصرِ نو کی خام نسلیں سبز بیجوں کا ہجوم بیکراں
جن کے اندر ہیں جہانِ برگِ گل سمٹے ہوئے
جن کی فطرت میں ابلتا ہے تقاضائے نمود
دائرہ ان قیمتی بیجوں کو دیتا ہے کشود
اور ان کے نازِ پنہاں سے اٹھاتا ہے نقاب
پالتا ہے ان کے باطن کی تہوں میں
شعلہ حرفِ کتاب
جاں میں سوئے رنگِ یکتا کو جگا دیتا ہے وہ
جوہرِ مضمر کے شعلے کو ہوا دیتا ہے وہ
دائرہ وہ خود شناسی کی حریمِ رنگ و بو
جس کی مٹی میں ہے نادیدہ زمانوں کی بہار

جس کے گہوارے میں فردا کی رتیں ہیں محو خواب
(سایہ افگن اس کے آنگن پر ہوں رحمت کے سحاب)
روز و شب نشو و نما کا اک سفر
دیکھ یہ پیہم خرام
دیکھ یہ پیہم خرامِ ارتقاء
اے جہاں بیں
اے اسیرِ گردشِ پیہم
مرے سیار دوست!

• روزنامہ خبریں، ادبی ایڈیشن، 8 مارچ 1999ء

"مسلک" کی اشاعت

اردو کے معروف محقق اور معلم پروفیسر ڈاکٹر مختار ظفر کے زیر ادارت گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن ملتان کے مجلہ "مسلک" کا 1997ء کا شمارہ 1998ء کے بالکل آخر میں طباعت کے مرحلے سے اور 1999ء کے بالکل شروع میں اشاعت کی منزل سے گزرا ہے۔ اس شمارے میں پاکستان کی گولڈن جوبلی کا گوشہ پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ جس میں حضرت اسد ملتانی کے شعری تبرکات کے علاوہ ڈاکٹر مختار ظفر، ولی مظہر ایڈووکیٹ، پروفیسر محمد سعید احمد اور شوذب کاظمی سمیت بہت سے لکھاریوں کی تحقیقی، تجزیاتی اور شعری نگارشات شامل ہیں۔ مجلے کے دیگر مشمولات میں کالج آف ایجوکیشن کے سابق طالب علم اور معروف شاعر اعزاز احمد آذر کا مضمون "یادوں کی چلمن" کالج کے پرنسپل ڈاکٹر طاہر تونسوی کا تفصیلی انٹرویو، تدریسیات کے حوالہ سے پروفیسر عمر دین قادری کا مضمون اور ڈاکٹر شمیم حیدر ترمذی کا انشائیہ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ "مسلک" کا حالیہ شمارہ اپنے سائز، سرورق، مضامین کے انتخابات و ترتیب اور طباعت کے معیار میں روایتی تعلیمی مجلوں سے یکسر مختلف ہے۔

غزل

نوشی انجم رول نمبر ۱۹۷

مدیرہ مسلک

قربتوں کے فاصلے ہیں اور ملن میں تشنگی
اس جہاں میں دوستو ہم کو ملی یہ زندگی
اپنے ہی نیلام کو ٹھہرا سربازار وہ
اس سے بڑھ کر اور کیا انسان کی ہے بے بسی
آؤ چل کر اک جہاں ایسا بنائیں ہم جدھر
جھومتی ہو چار سو بس زندگی ہی زندگی
جو مقدر میں مرے چاہے گا لکھ دے گا وہ شخص
روشنی ہی روشنی یا تیرگی ہی تیرگی
تو ملا تو پیار کا احساس بھی جانا گیا
چاہ پہنچے عشق تک تو پھر ہی ہو گی بندگی

ادارتی بورڈ

(دائیں سے بائیں) نوشی انجم (طالبہ علم مدیر اردو) پروفیسر نزہت امجد (انچارج انگریزی سیکشن) پروفیسر ڈاکٹر طاہر تونسوی (پرنسپل کالج) پروفیسر ڈاکٹر مختار ظفر (انچارج شعبہ اردو اور مرتب) حماد الرحمن (مدیر انگریزی)
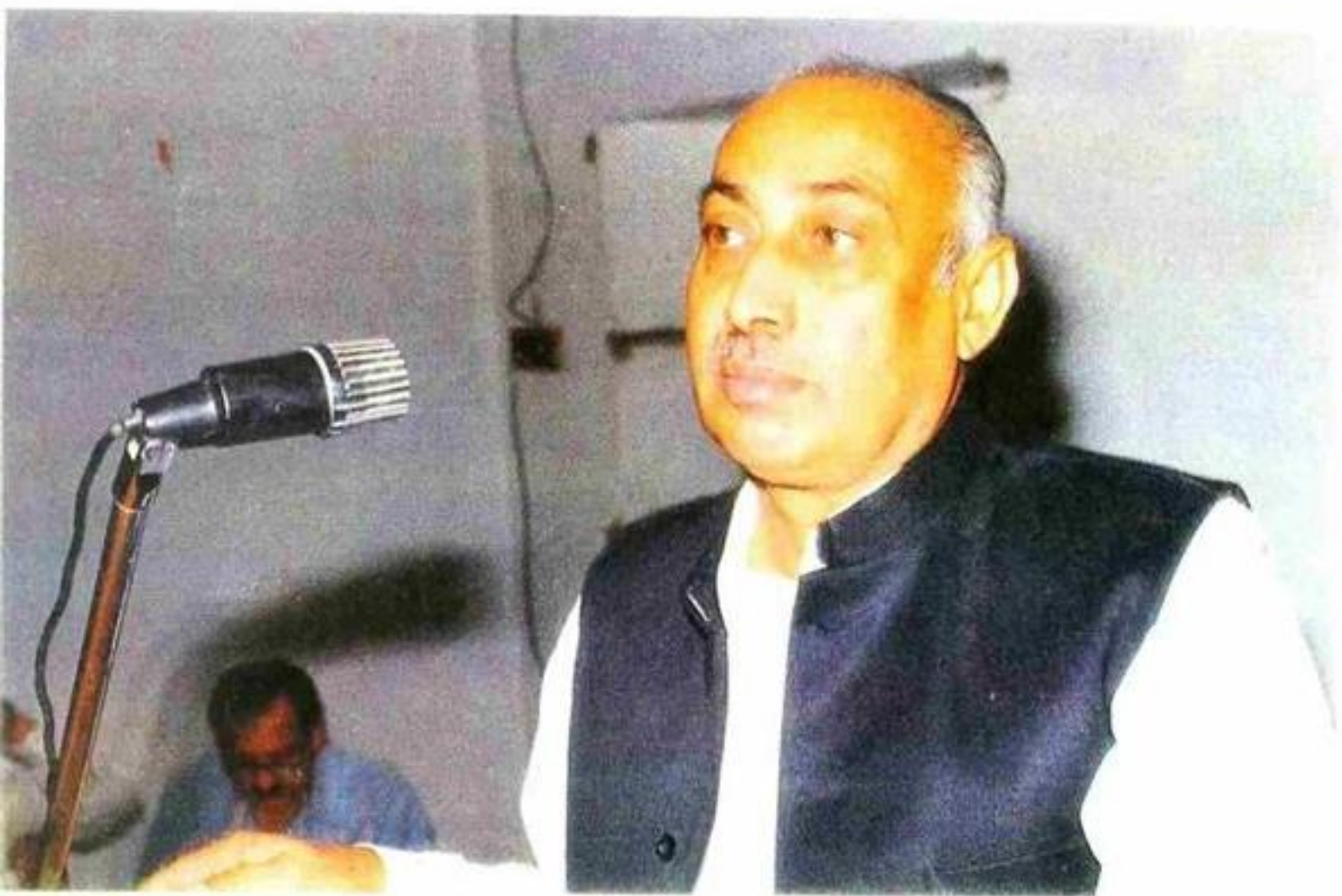
جناب پروفیسر ڈاکٹر طاہر تونسوی (پرنسپل)

ہے ولی پوشیدہ

اُمراؤ طارق

عثمانیہ ریستوران کی پہلی منزل پر شیشے کی دیوار سے لگے، یونیورسٹی روڈ پر تیسرے پہر کی تیز رفتار ٹریفک دیکھتے ہوئے ہم بڑی کابلی کے ساتھ لیٹ لنچ کر رہے تھے۔ کھانا ختم ہوا تو چائے کی پیالی سامنے آتے ہی چائے کی خوشبو کا ایک جھونکا کیتلی سے نکل کر ہمیں چھوتا ہوا گزر گیا۔ پیالی میں کیتلی سے چائے ڈالی گئی تو یوں جیسے گہری نیند سے بیدار ہوئے ہوں ڈاکٹر طاہر تونسوی کی آواز قدرے بلند ہو گئی۔ اس سے قبل بھی بول تو وہی رہے تھے مگر آواز میں ایسی غنودگی اور اتنا دھیما پن تھا جیسے وہ ہم سے نہیں اپنے آپ سے مخاطب ہوں۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی سے یہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔ عثمانیہ ریستوران کا ہال قریب قریب خالی تھا۔ لنچ کے بعد بیرے بھی ادھر ادھر ہو گئے تھے۔ کمرہ خنک اور پرسکون تھا اور ڈاکٹر طاہر تونسوی کی آواز سماعت پر شبنمی پھوار کی طرح برس رہی تھی ہم ان کے لہجے کے دھیمے پن اور اپنائیت کے سحر کے اسیر کبھی ان کے چہرے پر نظریں گاڑے ان کی آنکھوں کی چمک کو دیکھتے رہتے کبھی ان کی مضبوط انگلیوں کو دیکھتے جن سے میز پر بکھری ہوئی اشیاء کو وہ اس طرح چھوتے جیسے ان کا قرینہ درست کر رہے ہوں اور ہمیں یوں لگا جیسے میز، بکھری ہوئی تمام اشیاء اور اس بڑے ہال کا سارا نظام ان کے تابع ہو اور ہر شے ان کی مضبوط گرفت میں ہو اور ان کی بصارت کے حلقے میں ہو۔ ان کی آنکھوں، ان کے ہاتھوں اور ان کی انگلیوں کو دیکھ کر کوئی بھی شخص آسانی سے یہ کہہ سکتا تھا کہ وہ پختہ ارادے کے عملی انسان ہیں اور مسائل کی تہہ کو پہنچ کر فوری فیصلے کرنا اور اس فیصلے پر خود عملدرآمد کرنا اور دوسروں سے اسے تسلیم کرانا ان کی عادت ہے۔

ڈاکٹر طاہر تونسوی کا نام ہم نے بارہا سنا تھا ان کی تحریروں سے بھی تھوڑی بہت شناسائی تھی، اب یاد تو نہیں مگر کہیں ہم نے ان کی ایک تصویر دیکھی تھی جس میں ان کی یہ بڑی بڑی مونچھیں تھیں اور ایسا نظر آتا تھا جیسے وہ اپنی مونچھوں کے پیچھے چلمن سے اس طرح لگے بیٹھے ہوں کہ نہ صاف چھپتے ہوں نہ سامنے آتے ہوں اور سچ تو یہ ہے کہ مونچھ کا چلمن کی طرح استعمال صرف ڈاکٹر طاہر تونسوی ہی کر سکتے ہیں یا یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ چلمن کا کام صرف ڈاکٹر طاہر تونسوی

کی مونچھوں سے ہی لیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس مونچھ آشام زمانے میں اپنے حریفوں کو قائل معقول کرنے کے لئے ڈاکٹر طاہر تونسوی کو جملوں، مکالموں اور قلم کا استعمال نہ آتا ہو۔ ہمیں یقین ہے کہ ان کا اس زمانے کا کوئی حریف اب نہ ہوگا اور اگر شومئی قسمت سے برا بھلا ہوگا بھی تو ان کا حریف ہرگز نہ ہوگا تائب ہو چکا ہوگا۔ اس تصویر کے علاوہ بعض تحریروں سے ہم نے یہ تاثر بھی لیا تھا کہ ڈاکٹر طاہر تونسوی اپنے دشمنوں کو کبھی معاف نہیں کرتے اور ایسی اشتعال انگیز تحریروں کی سچائی پر ہم ایمان بھی لے آئے تھے کہ ڈاکٹر طاہر تونسوی کا کوئی مخالف اس حد کو کب پہنچ پاتا ہوگا کہ معافی تلافی کی نوبت آسکے۔ لیکن اس سہ پہر میرے سامنے بیٹھے ہوئے طاہر تونسوی تصویر والے طاہر تونسوی سے یکسر مختلف تھے۔ مونچھ کا باغ اجڑ چکا تھا اور اس کی جگہ ہلکا ہلکا غالب کے در و دیوار والے سبزے کی طرح سبزہ اگا ہوا تھا۔ شباب رخت سفر باندھ رہا تھا یہ اسے کھول دیتے تھے البتہ وہ چوسر کے بائیں جانب سیاہ چمکدار بالوں کے درمیان کنگھے سے ایک خوبصورت لکیر کھینچ لیا کرتے تھے اب کہاں .... بال اب آدھے سر میں ہیں باقی آدھے سر میں فکر و افکار کا سودا سمایا ہوا ہے۔ چنانچہ اس حصے میں پیشانی نے اپنی حدود کو وسعت دے لی ہے ہاں مگر ان روشن بڑی غلافی آنکھوں میں اب بھی وہی توڑ پھوڑ مچا دینے والی صلاحیت موجود ہے، وہی نور کا سماں اور جلال کی کیفیت جو دلوں پر ان کی حکمرانی قائم کر دیتی ہے۔ یقیناً ان روشن آنکھوں سے جو نظر بھی ملی ہوگی ٹھہر گئی ہوگی اور ان کامرانیوں میں ڈاکٹر طاہر تونسوی کی محنت، منصوبہ بندی یا غور و فکر کا کوئی دخل ہرگز نہ ہوگا۔ چنانچہ جب اس لیٹ لنچ کے بعد عثمانیہ ریستوران کی سیڑھیوں سے ہم قدم قدم نیچے اتر رہے تھے ڈاکٹر طاہر تونسوی سے ہماری محبت کا گراف زینہ بہ زینہ اوپر جا رہا تھا۔

اب یہ بات کئی شہادتوں سے ثابت ہو چکی ہے بلکہ دستاویزی شہادتوں سے بھی ثابت ہے کہ ڈاکٹر سلیم اختر صاحب ڈاکٹر طاہر تونسوی کے استاد ہیں اور ہماری نیازمندی ڈاکٹر سلیم اختر صاحب سے بھی ہے اس لئے ہر طرح کی شہادتوں کے باوجود ہمیں یقین ہی نہیں آتا کہ ڈاکٹر سلیم اختر جیسا مرنجاں مرنج، سلیم الطبع، ملنسار، خوش گفتار، نرم خو اور صلح جو انسان ڈاکٹر طاہر تونسوی کا استاد بھی رہا ہو اور بقید حیات بھی ہو (اللہ ڈاکٹر سلیم اختر کو طویل عمر دے) یہ دونوں باتیں بیک وقت کس طرح ممکن ہو سکتی ہیں۔ لیکن فریقین کے اقبالی بیانات اور زبان خلق کے خدائی نقارے کے بعد سر مو انکار کی گنجائش رہ جاتی ہے اور نہ شک کا سہارا لے کر ان کی بریت ہی ممکن ہے۔ سو ہم بھی اس ناممکن کو ماورائے عدالت اقبالی بیانوں کی بنیاد پر تسلیم کئے

لیتے ہیں۔ حالانکہ اگر دیکھا جائے تو استاد قسم کے آدمی ڈاکٹر طاہر تونسوی ہی نظر آتے ہیں بے چارے ڈاکٹر سلیم اختر تو ہمیشہ خود کو طالب علم ہی کہتے رہے اور سچ تو یہ ہے کہ وہ جیسے ہیں ویسے ہی نظر آتے ہیں اور اب جب کہ یہ غلط فہمی دور ہو چکی ہے ہم یہ سوچا کرتے ہیں کہ اگر ڈاکٹر طاہر تونسوی استاد اور ڈاکٹر سلیم اختر شاگرد ہوتے تو اردو ادب کا کیا نقشہ ہوتا شاعری پر کم از کم ایسا برا وقت تو نہ آتا کہ اردو زبان کے شاعروں کو انگریزی زبان کے ملک برطانیہ کے شہر لندن سے ہدایت نامہ جاری ہوتے۔ ان کی "شین قاف" وہاں سے درست کی جاتی اور شین قاف ہی کیا جب لندن سے عروض کی تعلیم کے شارٹ نوٹس آنے لگے تو گویا دماغ بھی درست کئے جانے لگے اب کیا رہ گیا۔ شاید ٹین ایجرز کے مقبول ترین شاعر احمد فراز پر کراچی یونیورسٹی کے ہما کا سایہ نہ پڑتا اور فہمیدہ ریاض کے سر پر اسلام آباد کا تاج بھی نہ ہوتا۔ سرگودھے میں یا ادب سر ہی نہ اٹھاتا یا اگر اٹھا بھی لیتا تو تونسے کے غزنوی کے ہاتھوں ایک دو ہی حملوں کے بعد یہ سومنات ڈھے جاتا مگر مشیت ایزدی ہی یہ تھی کہ دونوں محاذ قائم رہیں اور حروف کی شیلنگ دونوں طرف سے جاری رہے اور نو آموز و نو مشق قلمکار علم و نصیحت حاصل کرتے رہیں اور یوں جنگ و جدال کے سہارے ادب کی نئی کونپلیں پھوٹتی رہیں۔ چنانچہ مشیت نے استادی کا تاج ڈاکٹر سلیم اختر صاحب کے سر پر رکھ دیا اور شاگردی کی ذمہ داریاں ڈاکٹر طاہر تونسوی کے کاندھوں پر ڈال دیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر استادی کی ذمہ داریاں بطریق احسن اب تک تو نبھائے جاتے ہیں آگے ڈاکٹر طاہر تونسوی کو جو منظور۔ ہم نے یہی دیکھا، سنا اور پڑھا ہے کہ شرفا، اپنی کمزوریاں چھپاتے ہیں لوگ بھی صرف نظر سے کام لیتے ہیں مگر ان دونوں استاد شاگرد کا قصہ ہی الگ ہے لوگ ہیں کہ کبھی شاگرد کو استاد کا باکمال شاگرد بتاتے ہیں کبھی استاد کو داد دیتے ہیں کہ شاگرد کو کس کس طرح ہنرمند بنایا ہے۔ شاگرد کہیں کوئی کارنامہ انجام دے نام استاد کا ہوتا ہے مگر بے چارے ڈاکٹر سلیم اختر اپنی کم سخنی اور طبعی شرافت سے مجبور برابر کہے جاتے ہیں کہ ڈاکٹر طاہر تونسوی ان کا شاگرد ہے اور ادھر شاگرد ہے کہ اعتراف پر اعتراف کئے جاتا ہے کہ اللہ جلہ شانہ دونوں کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ چشم بددور کسی کی نظر نہ لگے۔

کسی نے کیا پتے کی بات کہی ہے کہ

"تونسہ کی سرزمین بزرگوں، عابدوں اور زاہدوں کا گہوارہ رہی ہے۔ خلق کی مرادیں پوری کرتی رہی ہے۔ ہر چند کہ اس سرزمین کے تمام بزرگ شب بیدار رہے ہوں گے مگر ان میں کچھ خلق خدا کی نظروں میں دنیادار رہے ہوں گے۔"

ڈاکٹر طاہر تونسوی کو کسی پل قرار نہیں، چلتے ہیں تو اپنے آپ سے اس طرح ہمکلام رہتے ہیں جیسے اپنا کیتھارسس کر رہے ہوں، خود احتسابی کے عمل سے گزر رہے ہوں۔ ہونٹ ہلتے ہیں، ہاتھ کبھی اپنے موقف کی حمایت کی طرح کبھی رد کی طرح حرکت میں رہتے ہیں، گردن پر سر اس طرح اثبات و نفی میں ہلتا ہے جیسے ان کے اندر کی جنگ فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو گئی ہو، قدم اس طرح اٹھتے ہیں جیسے کہیں وقت پر پہنچ جانے کی عجلت ہو، حواس باختہ، کھوئے کھوئے سے تونسے کے ڈاکٹر طاہر تونسوی کو اگر ان کی تحریروں، تخلیقوں، تنقیدوں اور تقریروں نے سہارا نہ لیا ہوتا تو ہو مجذوب ہوتے اور دنیا کو اپنی ٹھوکروں میں لے لیتے۔ مگر اپنی معتبر شناخت اور وسیلہ اظہار کے باوجود ان کے اندر کا شب بیدار انہیں یہاں وہاں بھی لئے پھرتا ہے اور ذمہ داریاں پوری کرنے کا احساس بھی دلاتا ہے یہی توازن ان کے انسانی رشتوں کو تحفظ عطا کرتا ہے خلق خدا اگر انہیں دنیا دار سمجھتی ہے تو کیا غلط سمجھتی ہے۔ وہ بڑی توجہ اور خاموشی سے دوسروں کو سنتے ہیں لیکن جب خود بولتے ہیں تو پھر دوسرے ان کی سننے اور سنتے رہنے پر مجبور ہوتے ہیں جتنا اوروں کی سنتے ہیں اس سے زیادہ خود بولتے ہیں۔ اپنی اور اپنے رفقاء کی لیاقت کو بے حد مہارت سے استعمال کرتے ہیں لیکن ان کی لیاقت کا یہ استعمال مثبت طور پر کرتے ہیں اور پوری ٹیم یا پورے ادارے کی کامیابی ہمیشہ ان کے پیش نظر ہوتی ہے۔ ہمیشہ سے ہی بالغ نظر رہے ہیں اور جوں جوں ان کی عمر میں اضافہ ہو رہا ہے اور ان کے سن و سال بڑھ رہے ہیں اتنے ہی وہ جوان ہوتے جا رہے ہیں۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی نوجوانی میں جس قدر ادھر ادھر مارے مارے پھرتے رہے ہیں اسی قدر وہ دنیا کے حقائق سے آگاہی حاصل کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ زندگی کو سنجیدگی سے لیا ہے وہ وقت کو ضائع کرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ سفر پر جاتے ہیں تو اپنے ساتھ کوئی کام لے جانا کبھی نہیں بھولتے۔ ایئر پورٹ پہنچتے ہی رخصت کرنے کے لئے آنے والوں کو ڈاکٹر فرمان فتح پوری کیوں نہ ہوں فوراً خدا حافظ کہہ کر اندر لاؤنج میں چلے جاتے ہیں اور اگر فلائیٹ لیٹ ہو تو ساتھ لائے ہوئے کام میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر طاہر تونسوی ان لوگوں میں سے ہیں جو خواہ اپنی زندگی یا کیریئر کا آغاز معمولی ملازمت یا تجارت سے کریں مگر اپنی عمر کا آخری حصہ عمدہ سجے سجائے گھر میں انتہائی آرام سے گزارنا پسند کرتے ہیں۔ اسی لئے سخت محنت کرتے ہیں اپنے خاندان کے تحفظ کا خیال رکھتے ہیں۔ خاندان کا تصور روائتی ہے جوں جوں ان کی عمر بڑھ رہی ہے خاندان سے ان کی محبت میں اضافہ ہو رہا ہے۔

کسی شخص کو جاننے کے لئے اس کے ساتھ سفر کرنا ضروری ہے یا پھر اس سے کاروباری لین دین کا موقع میسر آئے تو لین دین کے ذریعہ اس سے آگاہی ہو سکتی ہے۔ موجودہ جمہوری زمانے میں ایک اور ذریعہ شخصیت کی پہچان کا میسر ہے اور وہ انتخابات ہیں۔ انتخابات میں خواہ آپ کا مخالف ہو یا آپ کا شریک کار دونوں صورتوں میں شخصیت کی بعض وہ پرتیں کھل جاتی ہیں جو عام دنوں میں نظروں سے پوشیدہ رہتی ہیں۔ گزشتہ دنوں پاکستان رائٹرز گلڈ کے سیکرٹری جنرل کا انتخاب لاہور میں منعقد ہوا۔ اس انتخاب میں جناب نسیم درانی سندھ سے سیکرٹری جنرل کے امیدوار تھے اور ان کے مقابلے میں ایک اور امیدوار بلوچستان سے تھے۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کے دستور کے مطابق سیکرٹری جنرل ایک ایک ٹرم کے لئے ہر صوبے سے منتخب ہوتا ہے۔ چنانچہ پنجاب اور سرحد سے سیکرٹری جنرل منتخب ہو چکے تھے اب سندھ اور بلوچستان کے صوبوں میں سے کسی بھی ایک صوبے سے سیکرٹی جنرل منتخب ہونا تھا۔ ان امیدواروں میں سے کسی ایک پر ہر صوبے کی صوبائی عاملہ کے ارکان کے ووٹوں کی اکثریت سے منتخب ہونا تھا۔ چنانچہ سندھ، بلوچستان اور سرحد کی صوبائی عاملہ کے ارکان لاہور پہنچ گئے۔ پنجاب کی صوبائی عاملہ کے ارکان بھی وہاں موجود تھے۔ دوسرے صوبوں سے آنے والے ارکان کو لاہور کے ایک ہوٹل میں ٹھہرایا گیا۔ وہاں ہماری ملاقات اور بہت سے دوستوں اور ادیبوں کے علاوہ ڈاکٹر سلیم اختر صاحب اور ڈاکٹر طاہر تونسوی سے بھی ہوئی جو انتخابات یا دیگر انتظامات میں ہمہ تن مصروف تھے۔ سندھ سے جناب نسیم درانی سیکرٹری جنرل کے امیدوار تھے اور بلوچستان سے ایک اور دوست بھی امیدوار تھے اور خیال تھا کہ ان دونوں امیدواروں میں سے ایک امیدوار اپنا نام انتخاب سے واپس لے لیں گے مگر گفت و شنید جوں جوں آگے بڑھتی گئی ناموں کا واپس لینا کار محال ہوتا گیا۔ حالانکہ ابتداء میں دونوں طرف سے اس خواہش کا اظہار ہوا تھا کہ دونوں فریقین انتخاب کی نوبت مقابلے کے ذریعہ نہ آنے دیں گے مگر دونوں کے درمیان بالآخر انتخابی مقابلہ ٹھہر گیا اور ہوٹل کے کمروں میں گھما گھمی شروع ہو گئی۔ جناب نسیم درانی سہ ماہی سیپ کے مدیر اور افسانہ نگار تھے اس لئے پاکستان اور ہندوستان کے تمام ہی اہل قلم سے نہ صرف متعارف تھے بلکہ بیشتر سے ان کے دوستانہ مراسم بھی تھے۔ اس لئے ہمیں یقین تھا کہ انتخاب کا نتیجہ ہمارے ہی حق میں ہوگا۔ جس صبح انتخاب ہونا تھا اس رات کوئی بارہ بجے ہم اپنے کمرے میں بعض قراردادوں کے مسودوں پر بحث کر رہے تھے سب ہمارے کمرے میں جمع تھے کہ کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی اور دروازہ کھلا۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی ہمارے سامنے کھڑے تھے۔ انتخاب کا پانسہ پلٹ گیا تھا ہم الیکشن ہارنے کی پوزیشن میں

آ گئے تھے۔

ہم اسی وقت کنویسنگ کی مہم پر نکل کھڑے ہوئے کمروں کمروں گھومتے پھرے۔ جب صبح رائے دہی شروع ہوئی تو ہمیں یہ علم تھا کہ ہمیں بلوچستان کے امیدوار سے کتنے ووٹ زیادہ ملیں گے اور ہم ڈاکٹر طاہر تونسوی کے شکر گزار ہوئے اور ڈاکٹر طاہر تونسوی کی شخصیت کے کئی گوشے ہم پر اس انتخاب اور ان کی مہمان نوازی نے کھول دیئے۔ جناب نسیم درانی سیکرٹری جنرل منتخب ہوگئے۔ گلڈ کا مرکزی دفتر کراچی منتقل ہونے کا دستوری عمل شروع ہو گیا اور اس کامیابی کا سہرا ہر دوست نے اپنی ذہانت اور اسٹریٹجی کی معرفت اپنے سر باندھ لیا مگر ہم اس حقیقت سے واقف ہیں کہ اس انتخاب میں کامیابی کیونکر ممکن ہوئی۔

ڈاکٹر طاہر تونسوی ان لوگوں میں سے ہیں جن کا ہر قدم نپا تلا ہوتا ہے اور جو خوب جانتے ہیں کہ وہ کیا اور کیوں کر رہے ہیں۔ وہ سے پہلے منزل کا تعین کرتے ہیں پھر راستے کے مسائل کا جائزہ لیتے ہیں اور سب سے آخر میں وہ ان افراد کا انتخاب کرتے ہیں جو ان کے شریک سفر بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں یا زاد راہ مہیا کر سکتے ہیں یا راہ کی دشواریوں پر قابو پا کر منزل کا راستہ ہموار کر سکتے ہیں۔ ان کے ساتھ مل کر کسی کام کا آغاز کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ اس عامل کی طرح ہیں جس نے اپنے قابو میں ایک جن کر لیا ہے جو اس سے ہر لحہ یہ سوال کرتا رہتا ہے کہ ''آقا اب کیا کام ہے'' اور جب تک اسے کام نہ بتایا جائے وہ کان میں یہی سوال دہراتا رہتا ہے۔ جن افراد سے ڈاکٹر طاہر تونسوی محبت کرتے ہیں ان کے لئے وہ اپنی راحت تج دیتے ہیں اور ان کے کام کو اپنے لئے عبادت بنا لیتے ہیں۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ ان پر اعتماد کر لیا جائے اور انہیں اپنا شریک کار بنا لیا جائے وہ یار وفادار بھی ہیں اور خدائی فوجدار بھی۔

ڈاکٹر سلیم اختر صاحب سے ہماری ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب وہ حلقہ نیاز و نگار کی سالانہ تقریب ''نیاز یادگاری لیکچر'' میں شرکت کے لئے بحیثیت ایک مقرر تشریف لائے تھے اور انہوں نے دوران گفتگو ساحل سمندر پر غروب آفتاب دیکھنے کی خواہش کا اظہار ہم سے کیا تھا۔ ہم تقریباً بیس سال سے ساحل سمندر سے دو کلومیٹر کے فاصلے پر رہائش رکھنے کے باعث ساحل سمندر کے رموز سے کچھ کچھ واقف ہو چکے تھے اور اکثر رات رات بھر سمندر کے ساحل پر بنی پختہ چار دیواری پر بیٹھ کر سمندر کی لہروں کو ساحل تک آتے اور لوٹتے دیکھا کرتے تھے۔ چاندنی اور اندھیری راتوں میں مد و جزر کی مختلف کیفیات سے گزرے تھے اور سمندر کی منہ زور لہروں کے شور سے اپنی کم مائیگی، سمندر کی قوت اور Nothingness کے احساس سے آشنائی حاصل کی تھی۔

ہمیں ڈاکٹر سلیم اختر صاحب کی خواہش کے رومانس سے یک گونہ خوشی ہوئی اور ہم ڈاکٹر سلیم اختر صاحب کو غروب آفتاب سے قبل ساحل سمندر پر ایسی جگہ لے گئے جہاں غروب آفتاب کا منظر سب سے زیادہ توبہ شکن اور Depressing ہو۔ لیکن ڈاکٹر طاہر تونسوی نے اپنے استاد یا دوست کی طرح سمندر پر غروب آفتاب دیکھنے کی خواہش نہیں کی شاید وہ کراچی میں رہ چکے تھے اس لئے ساحل سمندر ان کے لئے کوئی نئی چیز نہ تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ طاہر تونسوی جیسے لوگ ساحل سمندر کا نظارا کرکے کب مطمئن ہوتے ہیں اور یوں بھی ہمیں ڈاکٹر سلیم اختر صاحب اور ڈاکٹر طاہر تونسوی صاحب میں کوئی مماثلت نظر نہیں آتی۔ ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر طاہر تونسوی سے اپنے تمام رویوں میں مختلف ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر سائیکل سے نیچے پاؤں نہیں رکھتے اور ڈاکٹر طاہر تونسوی سائیکل کے پیڈل پر بھی پاؤں نہیں دھرتے۔

ہم ریستوران سے باہر یونیورسٹی روڈ کے فٹ پاتھ پر چل رہے تھے اچانک ہمیں محسوس ہوا کہ ڈاکٹر طاہر تونسوی کچھ کہہ رہے ہیں۔ ہم نے ان کے چہرے کو دیکھا ان کے ہونٹ ہل رہے تھے اور آنکھیں اس طرح کھلی ہوئی تھیں جیسے دور بہت دور کچھ دیکھ رہے ہوں۔ وہ ہماری موجودگی سے قطعاً بے نیاز تھے جیسے نیند میں چل رہے ہوں۔ اپنے احتساب کے عمل سے گزر رہے ہوں، اپنے افکار کی تطہیر میں مصروف ہوں اور اپنے اندر کے طوفان پر قابو پانے کی کوشش کر رہے ہوں۔ شاید تونسہ شریف کی مٹی ملتان کی فضاؤں اور لاہور کے فیض نے ان کے اندر کے صوفی منش کو ہر طرح کے ادبی مناظروں کے باوجود جلا بخشی ہے اور وہ ہر لحہ اور ہر قدم اپنا احتساب کرتے رہتے ہیں۔ شاید ان کے اندر اپنے آپ سے اسی مسلسل جنگ نے ان کی بے چین روح کو کشف و کرامات کی ان منزلوں پر فائز کر دیا ہے جہاں وہ خلق خدا کو صرف نیک خواہشات کی دعائیں تو دے سکتے ہیں، محبتیں تو بانٹ سکتے ہیں، کسی کا برا نہیں چاہتے۔

رات کے گیارہ بج رہے تھے جب ہم ڈاکٹر طاہر تونسوی کو خدا حافظ کہہ کے لوٹ رہے تھے۔ جب ہم کشادہ سڑک سے اس گلی میں مڑے جس میں ہمارا گھر تھا تو ہمیں قدموں کی چاپ سنائی دی اور یوں محسوس ہوا جیسے ڈاکٹر طاہر تونسوی اسی لمحے سے ہمارے ساتھ ہولئے تھے جب ہم ان سے بغل گیر ہو کر مڑے تھے اور جب ہم نے اپنے گھر کے دروازے پر لگی کال بیل پر انگلی رکھی تو ہمارے ساتھ ساتھ چلنے والی قدموں کی چاپ رک گئی مگر ان کا سوچ میں گم چہرہ اور بڑی بڑی روشن آنکھیں ہماری نگاہوں کے سامنے تھی اور وہی چہرہ، وہی آنکھیں اور قدموں کی وہی چاپ ہمیں ایک دوست کے ہر وقت ساتھ ہونے کا یقین دلاتی رہتی ہے اور اپنے اوپر ہمارا اعتماد اور سوا ہو جاتا ہے۔

''مسلک'' ۱۹۹۷ء

مجلّاتی ادب میں ایک قابل قدر اضافہ

کسی بھی تعلیمی ادارے کا علمی و ادبی مجلّہ (میگزین) اس ادارے کے عمومی مزاج اور اکیڈمک ماحول کا بہت حد تک آئینہ دار ہوتا ہے' بعض مجلّے تو محض خانہ پری کے لئے شائع کئے جاتے ہیں' اور بعض کسی زندہ روایت کی نشاندہی کرتے ہیں' ملتان کے گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن کا مجلّہ "مسلک" ثانی الذکر مجلوں میں شامل ہوتا ہے' خصوصاً" اس کا پاکستان گولڈن جوبلی نمبر جس کا سال اشاعت ۱۹۹۷ء درج کیا گیا ہے' اور جو دراصل ۹۶-۱۹۹۵ء کے سیشن کا شمارہ ہے' ملتان کے مجلّاتی ادب میں ایک قابل قدر اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ شمارہ کالج کے نامور پرنسپل ڈاکٹر طاہر تونسوی کی سرپرستی اور ممتاز محقق اور استاد ڈاکٹر مختار ظفر صاحب کی ادارت میں شائع ہوا' شاید یہی وجہ ہے کہ مجلّہ اپنے مندرجات نثر و نظم کے معیار اور تنوع دونوں اعتبار سے قابل توجہ ہے۔

یہ شمارہ دس حصوں پر مشتمل ہے' جن میں سے ہر حصہ کچھ خصوصیات کا حامل دکھائی دیتا ہے' میرے خیال میں اس کے چار حصے نسبتاً" زیادہ اہم ہیں' جن میں اولیت "گوشہ پاکستان" کو حاصل ہونی چاہئے' اس حصے میں تحریک و تاریخ پاکستان کے بعض اہم پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے۔ اس کا ایک ذیلی حصہ پاکستان اور ملتان کے بارے میں ہے۔ اس میں شامل تین میں سے دو مقالے ("قومی شاعری کی روایت اور ملتان" ------ اور --- "تاریخ ملتان کا ایک خونیں ورق") ڈاکٹر مختار ظفر کی تحقیقی کاوشوں کا ثمر ہیں' اور تیسرا مقالہ "جنگ آزادی ۱۸۵۷ء اور ملتان" ولی مظہر ایڈووکیٹ کے رشحات قلم میں سے ہے۔ یہ تینوں مقالے ملتان کی ادبی اور سیاسی تاریخ کے بعض بے حد اہم موضوعات سے بحث کرتے ہیں اور اس شمارے کی روح ہیں۔ زیر نظر شمارے کے دوسرے حصے بھی' جن کا تعلق علم و ادب اور تعلیم و تدریس کے فن سے ہے' یقیناً" بے حد اہمیت کے حامل ہیں' ---- انگریزی حصہ چار مقالات پر مشتمل ہے جن میں سرفہرست پروفیسر محمد سعید احمد کا مضمون نظریہ پاکستان کی عقلی توجیہات کے بارے میں ہے' اور میری رائے میں خاصا قابل توجہ ہے۔

اردو حصے میں "یادوں کی چلمن" کے نام سے اعزاز احمد آذر کا مضمون ادارے کے ماضی سے وابستہ ایک دور سے متعلق ہے' اور خاصا دلچسپ ہے۔ اس شمارے میں خاکسار راقم الحروف کی ایک حمدیہ نظم بھی ازراہ قدردانی شامل کی گئی ہے۔ اس کے مطلع میں سفینے کا لفظ "سفنے" میں بدل گیا ہے' اس شمارے کے قارئین سے میری درخواست ہے کہ اس شعر کو یوں پڑھا جائے۔

بادباں تیرے' ہوا تیری' سفینے تیرے
موج دریا میں بنائے ہوئے رستے تیرے

ڈاکٹر اسلم انصاری

غالبیات

ا: تفہیم

ب: تبصرے

ج: تحقیق

د: سیمینار

ر: تغزل (غالب کی زمین میں)

غالبیات

ا: تفہیم

ب: تبصرے

ج: تحقیق

د: سیمینار

ر: تغزل (غالب کی زمیں میں)

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

ذیل میں چند نکتہ سرایانِ ادب و شعر کے حوالے سے بتایا جاتا ہے کہ غالب کیا ہیں؟ ان سے غالب کے فکر و نظر کے جمال آفرین دھنک رنگ سامنے آجاتے ہیں۔

(ادارہ)

ذاتی و اجتماعی احساس

مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:

مرزا غالب نے عمر بھر بہادر شاہ ظفر کی لاحاصل مداحی کی تھی اور وہ قصیدے جو عرفی و نظیری کے قصائد کا مقابلہ کرنے کا دم رکھتے تھے، ایک ایسے مخاطب کے سامنے ضائع کئے گئے تھے جس کے سر پر جہانگیر و شاہ جہان کا تاج تو ضرور تھا، پر نہ تو عرفی و نظیری کی قدر شناسی کا ہاتھ تھا اور نہ کلیم کو زر خالص سے تلوا کر بخشش کرنے والا خزانہ۔

تاہم وہ جو کچھ لکھتا تھا اس کا تخاطب خود بہادر شاہ سے نہ ہوتا تھا بلکہ اس تختِ اعظم کی روحِ صولت و عظمت اس کے سامنے ہوتی تھی جس پر کبھی بیٹھ کر اکبر نے فیضی سے، جہانگیر نے عرفی سے اور شاہ جہان نے کلیم سے مدحیہ قصیدے سنے تھے اور جو اب بھی نوروز و عید کے دن اس زرد زرد دھوپ کی طرح، جو غروب آفتاب سے کچھ پہلے، اونچی اونچی دیواروں اور محرابوں پر دکھائی دیتی ہے، دیوانِ عام و خاص کے طلائی ستونوں کے نیچے چند لمحوں کے لئے نظر آجاتی تھی:

کہ باوجود خزاں بُوئے یاسمن باقیست

چنانچہ ان کے اکثر قصائد مدحیہ کی تشبیبوں اور علی الخصوص اس مدحیہ نثر میں جو "مہر نیمروز" میں حضرت بہادر شاہ ظفر کو مخاطب کر کے لکھی ہے اس سوز درونی اور اس آتشِ پنہانی کی گرمی صاف محسوس ہوتی ہے جس کا شعلہ کاروانِ عظمت کے آخری مسافر کو دیکھ کر بے اختیار ان کے دل میں بھڑک اٹھتا تھا اور جس کو وقت کی نزاکت اور انگریزی حکومت کے ذریعے وظیفہ حاصل

کرنے کے تعلق، نیز ایک حد تک طبیعت کی شاعرانہ طماعی ووارستگی نے غالب آکر بہ ظاہر پوشیدہ وافسردہ کردیا تھا۔

(صحیفہ غالب نمبر (اول)، ص 138۔ 139 لاہور۔ 1969 بحوالہ "مرزا غالب کا غیر مطبوعہ کلام" الہلال، جولائی 1914 اور زمانہ، کانپور 1914)

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کہتے ہیں:

یہ انقلاب عظیم (مغلیہ سلطنت کا اختتام) غالب کی نگاہوں کے سامنے برپا ہوا۔ وہ اس خونیں ہنگامے کے عینی شاہد بلکہ اس قلزمِ خوں کے شناور تھے (میں مع زن و فرزند، ہر وقت، اسی شہر میں قلزمِ خوں کا شناور رہا ہوں ...... خط بنام چودھری عبدالغفور سرور، ستمبر 1860)۔

اسلوبِ سخن اور فنی جمال

رام بابو سکسینہ کہتے ہیں:

مرزا غالب کے اکثر اشعار نفس شاعری کی جان اور فصاحت و بلاغت کے روح رواں ہیں۔ سادہ لفظوں کی سطح کے نیچے دریا کی تہ، ان کی ہر تصویر الفاظ کے پیچھے ان کے ہر نقش بتاں کی پشت پر ایسے ایسے تخیل کے وسیع مناظر نظر آتے ہیں جن کی محیط فضاحیات و ممات کے سربستہ رازوں سے معمور ہے۔ (تاریخ ادب اردو، ص 398)

نذیر احمد کہتے ہیں:

غالب کا اردو دیوان نسبتاً بہت مختصر ہے لیکن ہر لفظ صنائع و بدائع معنوی کا طلسم ہے اور ہر حرف کی تہ میں رعایت لفظی کا میخانہ موجود ہے جو غور کرنے والوں کو اس کے کلام کی شراب سے سرمست کرتا ہے۔ (محاسنِ الفاظ غالب، ص 81۔ کتابیات ستمبر 1969)

شکیل الرحمن کا خیال ہے:

غالب کی پیکر تراشی اور ان کے تمثالِ شعری میں لسانیاتی عناصر سائیکگ فینومینا، اور احساسات کو فوقیت حاصل ہے، ان کی شاعری، تصویروں، ان کی متحرک کیفیتوں اور ان کہی باتوں

کے اشاروں کا عجیب و غریب نمونہ ہے۔ غالب نے اپنے افسانوی اور داستانی رجحان سے جو پیکر تراشے ہیں ان میں "تصویریت" محسوسات کی ایک دنیا لے کر آتی ہے اس رجحان نے شاعر کی حسِ حرکت کو اس طرح بیدار کیا ہے کہ ذہن کے انتشار اور وجود کی الجھنوں کے ان گنت تمثال ابھر کر سامنے آگئے ہیں۔ اسی طرح حسِ حرارت، حسِ سماعت، حسِ شامہ وغیرہ کی بیداری نے تمثال بصارت کو مغل جمالیات کے ناقابلِ فراموش پیکروں کی صورتیں دے دی ہیں ....
یوں غالب ہند مغل جمالیات کے ایک بڑے فنکار بن جاتے ہیں۔
(مرزا غالب کا داستانی مزاج، ص 111)

زبان و بیان کے لطائف و نکات:

سید عابد علی عابد رقم طراز ہیں:

مرزا غالب کے الفاظ لعل و جواہر سے بھی گراں قدر ہیں .... مرزا الفاظ کے نازک سے نازک فرق کو خوب پہچانتے ہیں۔ وہ ادیبانِ فرانس کی طرح عقیدہ Magt propre کے پابند اور قائل ہیں۔ دیوان کے مطالعے سے معلوم ہوگا کہ مرزا نے ایک لفظ کو جہاں تک ہو سکا، دوبارہ استعمال نہیں کیا ہے، اس کی وجہ سحبان وائل کی طرح یہ نہیں ہے کہ وہ کسی لفظ کا تکرار نہیں کرتے بلکہ یہ ہے کہ وہ کسی خیال کا اعادہ نہیں کرتے۔ (اصول انتقادیاتِ ادبیات، ص 188)

ڈاکٹر شوکت سبزواری کا نقطہ نظر ہے:

غالب کو زبان کے لطائف و نکات کا کس درجہ شعور تھا، اس کا اندازہ لگانے کے لئے یہ ایک لسانی نکتہ دیکھیے .... عام طور سے فعل "کہنا" کا صلہ اردو میں "سے" آتا ہے۔ جیسے

اسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے

لیکن غالب نے اس شعر میں "سے" کی جگہ "کو" استعمال کیا ہے۔

مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اڑ جائے
جلاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور

بادی النظر میں یہ غلط سمجھا جائے گا لیکن زبان کا جو صحیح ذوق رکھتے ہیں، وہ جانتے کہ "کہنا" اگر، امر اور حکم کے معنوں میں ہو تو اس کا صلہ "کو" ہوگا۔ مولانا حسرت موہانی فرماتے ہیں کہ "ہاں اور"

میں حکم کا پہلو ہے اس لئے بکھے جائیں کا صلہ "کو" صحیح ہے جیسا کہ "باغ و بہار" میں ہے۔

"ساتھ والوں کو کہا کہ سب نقد و جنس بار کر لو"

(مضمون: طلسم گنجینۂ معانی)

غالب کی جمالیات:

مرزا غالب کا تصور حسن موضوع اور معروض کے لطیف امتزاج اور باہمی تاثیر و تاثر سے جنم لیتا ہے۔ بام گارٹن کی تعریف کے پیش نظر جمالیات صداقت سے بحث نہیں کرتی بلکہ حسی تاثرات کی توضیح و ترجمانی کرتی ہے۔ چنانچہ غالب کے یہاں حسن اور عشق ایک دوسرے سے بے نیاز مستقل بالذات وجود نہیں رکھتے بلکہ باہمد گر وابستہ ہیں۔

(سید علی عباس جلال پوری)

غالب کی بت شکنی:

غالب ہی کے سر چشمہ فکر سے از آں روز تا ایں زمانہ سب مفید ہیں۔ پہلی ضرب کلیم، سنگینیٔ حیات پر اسی کی تھی۔ اُسی نے ایک نئی بیداری، ایک نئی روح، اپنی نوا سنجیٔ قانونِ راز ہستی، ہماری زندگی میں پیدا کی۔ جو کڑیاں سلسلۂ فکر کی، اجتہاد کی، مدت سے بے آواز تھیں انہیں وہ آشوبِ نغمہ دے گیا۔

(پروفیسر ممتاز حسین، غالب کا آئینہ فن)

اگر غالب، جناب خضر کو طنز کا نشانہ نہ بناتے تو شاید سر سید احمد خان "کیا خضر کا وجود فرضی ہے؟" کے عنوان سے مضمون لکھنے کی جرات نہ کر سکتے۔ اگر غالب جنت اور دوزخ کے تصورات سے رندانہ شوخیاں نہ کرتے تو شاید اقبال کے لئے اپنے مشہور خطبات میں جنت اور دوزخ کے تصورات کی مادی حیثیت کو ضمنی اور فروعی قرار دے کر ان کی علامتی اہمیت پر اظہارِ خیال کرنا اتنا آسان نہ ہوتا۔ بقول غالب

چاکِ "لا" اندر گریبانِ جہاں افگندہ ایم

بے جہت بیروں خرام از پردۂ پندارِ ما

(فتح محمد ملک)

غالب کا مزاح:

غالب کی تحریروں میں مزاح یاس سے بغل گیر نظر آتا ہے یعنی ایسی کیفیت پیدا ہو گئی ہے کہ یاس مزاح کو کھل کر قہقہے لگانے سے باز رکھتی ہے اور مزاح یاس کو، ہچکیوں میں تبدیل ہونے سے بچائے رکھتا ہے۔ چنانچہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا کوئی شخص مسکرا رہا ہے اور میری رائے میں مزاح کی ارفع منزل یہی ہے۔

(ڈاکٹر وزیر آغا۔ اردو ادب میں طنز و مزاح)

حزن و نشاط کا امتزاج حسین

غالب کی غزل حیات بخش اور ولولہ انگیز ہے۔ اور میر کی غم انگیز فریاد کے مقابلے میں ہمارے قلب و روح سے زیادہ قریب ہے۔

(ڈاکٹر سید عبداللہ، ولی سے اقبال تک، ص 253)

غالب نے جو سیرت پیش کی ہے۔ اس کے نظام میں، غم بنیادی چیز ہے۔ لیکن غالب نے غم کو احساس سے وابستہ نہیں کیا ہے اور نہ غم کو یاس تک پہنچنے دیا ہے بلکہ دانش سے کام لے کر غم کو نشاط میں تبدیل کر دیا ہے۔

(ڈاکٹر خورشید الاسلام)

غالب اور اقبال

اس میں شک نہیں کہ موضوعاتی سطح اور مقاصد کے اہداف سے ہٹ کر، اقبال اور غالب کی شعری مہیجات، اسالیب بیان اور مروجہ سانچوں سے انحراف کا طریق کار مشترکہ خصوصیات کے حامل ضرور ہیں۔ دونوں کے اسالیب میں مفرس تراکیب، گھن گرج، عجمی لے اور جوش و خروش موجود ہے۔ دونوں کا سرچشمہ اسلامی تہذیبی اقدار ہیں .... غالب ایرانی تہذیب سے متاثر تو اقبال عربی تہذیب سے۔

(پروفیسر ڈاکٹر اے۔ بی۔ اشرف۔ "میر، غالب اور اقبال" (مطالعات) ص۔ 74)

نذرِ غالب

پروفیسر اصغر علی شاہ

غزل کے جسم میں دوڑا کے بجلیاں اس نے
بنایا پیر زلیخا کو نوجوان اس نے
سحاب تازہ اٹھائے بحورِ کہنہ سے
گھڑے پرانی زمینوں سے آسمان اس نے
اگرچہ اس کی زمینیں تھی سنگلاخ بہت
اگائے ان میں گلستان و بوستان اس نے
غزل غزل تھی اگر صورتِ نبات النعش
تو کھینچی صورتِ دیوان کہکشاں اس نے
مُرورِ وقت سے ہر شعر ہو گیا محفوظ
کہ اس میں کہہ دی زبانوں کی داستان اس نے
وہ غالب ایسا ہے، فتحِ مکاں کا ذکر ہی کیا
کہ کر دکھائی ہے تسخیرِ لامکان اس نے
سیاہ لفظوں کو تشبیہ کی جلا دے کر
بنا دیا انہیں آنکھوں کی پُتلیاں اس نے
وہ استعاروں کو دیں ندرتیں کہ لگتا ہے
گھڑی ہو جیسے علامات کی زبان اس نے
اڑا کے لفظوں کے سیّارچے تراکیبی
کئے تلاش مفاہیم کے جہاں اس نے

اعلیٰ مدارج میں مطالعہ غالب کی روایت

ڈاکٹر سید معین الرحمن

میرے علم اور یقین کی حد تک پاک و ہند میں غالب پر پی ایچ ڈی کی سطح کا پہلا تحقیقی کام، ڈاکٹر سید عارف شاہ گیلانی نے انجام دیا۔ ان کے تحقیقی مقالے کا عنوان تھا:

"GHALIB - His Life and Persian Poetry"

انہوں نے اگست 1947ء میں یہ مقالہ بمبئی یونیورسٹی کو ڈاکٹریٹ آف فلاسفی کے لئے پیش کیا۔ یہ کام گورنمنٹ کالج لاہور کے ایک سابق طالب علم (معروف اور معزز اولڈ راوین) ڈاکٹر محمد بذل الرحمن (ولادت لاہور 1896ء، وفات بمبئی 1947ء) کی زیر نگرانی انجام پایا۔ یہ مقالہ بزبان انگریزی 1956ء میں کراچی سے شائع ہوا۔ اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ یونیورسٹیوں میں غالب پر ہونے والے اولین تحقیقی مقالے پر ڈگری بھارتی یونیورسٹی سے ملی اور اس کی اشاعت کا امتیاز پاکستان کو حاصل ہوا۔ پاک و ہند میں غالب پر اس سے پہلے پی۔ ایچ۔ ڈی کا کوئی مقالہ زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوا۔ اس مطبوعہ مقالے "غالب۔ ہز لائف اینڈ پرشین پوئیٹری" کے کتابیاتی کوائف یہ ہیں:

ناشر: دی اعظم بک کارپوریشن، کراچی
دی ایلائیز بک کارپوریشن، کراچی، 1956ء
طابع: سپرنٹنڈنٹ ویسٹ پاکستان گورنمنٹ پرنٹنگ اینڈ سٹیشنری، کراچی
سائز: 7 x 11 انچ ضخامت: 16 + 294 + 16 = 326 صفحات

ڈاکٹر سید عارف شاہ گیلانی نے 1970ء میں اپنے انگریزی مقالے کو "نئے عنوان اور نئی شان" کے ساتھ بزبان اردو پیش کیا۔ اردو متن کی کتابیاتی تفصیلات یہ ہیں:

"شہنشاہ سخن مرزا غالب کے فارسی کلام پر ناقدانہ نظر"
ناشر: مدینہ پبلشنگ کمپنی، کراچی۔ 1390 ہجری مطابق سال 1970ء
سائز: 8/22x18 ضخامت: 429 صفحات

کتاب کے ابتدائی ۳۲ صفحات فہرست مضامین، دیباچہ مصنف نیز غالب اور مصنف کی

تصاویروں پر مبنی ہیں۔ کتاب کا "باب اول" (ص ۳۳-۱۶۹) غالب کی "سوانح حیات" پر مشتمل ہے۔ "باب دوم" (ص ۱۷۱-۳۷۱) غالب کے "کلام پر تبصرہ" کے لئے وقف ہے۔ صفحہ ۳۷۳ تا ۴۲۹ "کتابیات" اور اشاریہ کتاب نے گھیرے ہیں۔

غالب پر دوسرا تحقیقی کام پروفیسر خورشید الاسلام کا ہے۔ انہیں ۱۹۵۴ء میں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی سے ان کے کام "غالب۔ ابتدائی دور" پر پی-ایچ-ڈی کی ڈگری ملی۔ ۱۹۶۰ء میں یہ مقالہ کتابی صورت میں چھپا۔ اس کا "انتساب" انہوں نے "اپنے استاد اور دوست پروفیسر آل احمد سرور" کے نام کیا ہے۔ مطبوعہ مقالے کے کتابی کوائف یہ ہیں:

غالب: ابتدائی دور

ناشر: انجمن ترقی اردو (ہند)، علی گڑھ، ۱۹۶۰ء، ص ۲۸۴

دیباچہ: ص ۳-۷

پہلا باب: خاندان، زمانہ، مطالعہ ص ۱۱-۲۸

دوسرا باب: شوکت بخاری، مرزا جلال اسیر، بیدل، غنی، ناصر علی اور ناسخ۔

غالب کی ابتدائی شاعری پر ان شعراء کے اسالیب کا اثر۔ ص ۲۹-۱۲۲

تیسرا باب: تمثیل نگاری، خیال بندی، مناسبات لفظی۔ ص ۱۲۳-۱۵۲

چوتھا باب: غالب کا اپنا کارنامہ۔ ص ۱۵۳-۱۹۹

ضمیمہ نمبر ۱: ہم اسلوب اشعار کا انتخاب، ہم زمین غزلیں۔ ص ۲۰۱-۲۳۰

ضمیمہ نمبر ۲: وہ الفاظ جو ابتدائی شاعری میں بار بار استعمال ہوئے،
ان کے تلازمے اور متعلق اشعار ص ۲۳۱-۲۷۹

کتابیات: ص ۲۸۱-۲۸۴

ڈاکٹر خورشید الاسلام نے دیباچے میں بتایا ہے کہ:

"اس کتاب کا موضوع، غالب کا ابتدائی دور ہے...... (وہ شعری سرمایہ) جو انہوں نے کم و بیش پچیس سال کی عمر تک جمع کیا...... اس کتاب کا مقصد یہ ہے کہ غالب کی ابتدائی شاعری میں جو اثرات کام کر رہے ہیں، ان کا جائزہ لیا جائے اور ہر اس شاعر کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی جائے جس کا براہ راست غالب کی ابتدائی شاعری پر پڑا ہے۔ ان میں ہر شخص پر اتنی ہی توجہ صرف کی گئی ہے، جتنی توجہ کا وہ اپنے اثر کے اعتبار سے مستحق تھا...... میں نے ہر ایک کی ان خصوصیات

کو نمایاں کر دیا ہے جنہیں غالب نے اپنے اندر جذب کر لیا تھا۔ ان شاعروں میں شوکت، اسیر، بیدل، غنی، ناصر علی، صائب اور ناسخ ہیں۔

جن شعرا کے خاموش اثرات کی نشاندہی کی جاسکتا ہے، ان کا حوالہ "انتخاب" اور "ضمیمے" میں دیا ہے، ان ہی کے فیض سے غالب نے اپنی شخصیت کو دریافت کیا۔ ان میں نظیری، عرفی، میر اور سودا ممتاز ہیں۔ کتاب کا آخری ...... ضمیمہ، ان الفاظ اور ان کے تلازموں پر مشتمل ہے جو غالب کی ابتدائی شاعری میں بار بار وسیع انداز سے استعمال ہوئے......" (دیباچہ ص ۳-۶)

ڈاکٹر خورشید الاسلام کے نزدیک غالب کا اپنا کارنامہ یہ ہے کہ:

(ا) غالب ایک فعال شخصیت رکھتے ہیں اور وہ:

(ب) زندگی اور انسان کو ایک "زندہ کل" کے طور پر دیکھنے اور ان کی مصوری کرنے کی کوشش کرتے ہیں...... اس کوشش میں:

(ج) ان کا سب سا بڑا سہارا، ان کی عقل اور ان کے مزاج کا کفر ہے، اس لئے: ان کی عقل روحانی تعبیر کی طرف بڑھتی جاتی ہے۔

(د) گویا ابتدائی دور میں بھی ان کا ذہنی عمل، دوسروں سے مختلف اور تیزی کے ساتھ بدلتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک منزل پر پہنچ کر، وہ ادبی اور سماجی خول کو توڑ کر باہر نکل آتے ہیں جس میں صائب، بیدل اور غنی وغیرہ نے اپنی عمر بسر کی تھی اور جس میں خود غالب کے معاصرین، زمانے اور انسان کے تقاضوں سے گھبرا کر پناہ گزیں ہوگئے تھے...... (ص ۱۹۹)

جزوی ترمیم اور تخفیف کے بعد ڈاکٹر خورشید الاسلام کے اس تھیس کی دوسری اشاعت، انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی کی جانب سے مئی ۱۹۷۵ء میں منظر عام پر آئی۔ (ضخامت: ۲۸۴ صفحات)

ڈاکٹر خورشید الاسلام کی یہ کتاب نئے نام نئی اور بہتر ترتیب کے ساتھ ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئی۔ اب انہوں نے ضمیموں کے قیمتی مواد کو ابواب میں متعلقہ مقامات پر ضم کر دیا ہے اور دوسرے باب میں صرف ان فارسی گو شعرا پر، زمانی ترتیب کے ساتھ گفتگو کی ہے، جن کے اسالیب کا اثر غالب کی ابتدائی شاعری پر ہوا۔ تیسرے باب میں انہوں نے بنیادی رجحانات اور غالب پر ناسخ کے اثرات کا سراغ لگایا ہے۔ بصورت موجودہ، کتابیاتی کوائف یہ ہیں:

ناشر: ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۷۹ء، ضخامت: ۲۵۹ صفحات

دیباچہ، ص ۷-۱۰

ڈاکٹر خورشید الاسلام نے اس یقین کا اظہار کیا ہے کہ "...... اس کتاب کے مطالعے سے اردو شاعری کی تاریخ کو سمجھنے کا ایک انداز نظر ہاتھ آئے گا۔ یعنی ہماری شاعری دہلوی اور لکھنوی کی اصطلاحوں سے آزاد ہو کر دو تہذیبی رجحانات کے مستقل اور مسلسل تصادم کی داستان نظر آئے گی۔ متاخرین شعرائے فارسی سے اردو شاعری کا وہ تعلق واضح ہو جائے گا جس کے بغیر ہماری تہذیب کی کہانی حقیقت سے دور جا پڑتی ہے۔ جاگیرداری زوال کے ادبی رجحانات اور شعری ہیئتوں کا مطالعہ نہ صرف ایک تاریخی دور اور غالب کی شاعری کو سمجھنے میں مدد دے گا، بلکہ موجودہ زمانے میں سرمایہ داری کے بحران، اس کے معمائی اور مریضانہ ادب، اس کی بعض ہیئتوں اور ادب کے ناقص نظریوں کی تفہیم کو زیادہ گہرا اور واضح کرنے میں بھی کام آئے گا......" (ص ۹-۱۰)

غالب کی پزیرائی اور پیشوائی اور ان کی حفاظت و حمایت کے حوالے سے سرزمینِ علی گڑھ کی حیثیت اور اہمیت، ان کے مولد (اکبر آباد) اور ان کے مسکن و مدفن (دہلی) سے زیادہ نہیں تو کسی طور کم بھی نہیں ......

ڈاکٹر خورشید الاسلام کے بعد، علی گڑھ میں غالب پر پی ایچ ڈی کی سطح کا دوسرا اچھا تنقیدی کام وارث کرمانی نے انجام دیا۔ غالب کی فارسی شاعری پر انہیں ۱۹۶۵ء میں پی ایچ ڈی کی سند فضیلت ملی۔ ان کا یہ کام "Evaluation of Ghalib's Persian Poetry" کے نام سے شعبہ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی جانب سے ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا یہ کتاب، تعارف، ضمیمے، کتابیات اور اشاریے وغیرہ کے علاوہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے:

پروفیسر رشید احمد صدیقی اور مسعود حسن رضوی ادیب نے ڈاکٹر وارث کرمانی کے اس کام کی بجا طور پر تحسین کی ہے اور اسے اپنے موضوع پر، غالبیات میں ایک بیش قیمت اور بنیادی پیش رفت ٹھہرایا ہے۔

ڈاکٹر وارث کرمانی کے بعد ۱۹۶۷ء میں کشمیر یونیورسٹی میں عبداللہ شیدا نے غالب پر تحقیقی کام کیا۔ ان کا موضوع تھا:

"غالب کی اردو اور فارسی شاعری کا تقابلی مطالعہ اور ذرائع کی تحقیقات"

(معیار تحقیق (۲) پٹنہ ۱۹۹۱ء، ص ۸۴۸)

بھارت میں غالب پر براہ راست ہونے والا کوئی اور تحقیقی کام میرے ذخیرہ غالبیات میں نہیں ...... ذوق، ظفر، مومن، شیفتہ، اور حالی، غالب کے نمایاں اور ممتاز ترین معاصرین یا تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں ان کی شخصیات اور ادبی خدمات پر جو تحقیقی کام ہوا ہے، وہ بجائے خود ایک الگ اور جداگانہ جائیزے کا متقاضی ہے ...... ان کو چھوڑتے ہوئے، ذیل میں بعض ایسی مطبوعات کے کوائف پیش کئے جا رہے ہیں جو بھارت میں چھپیں، میرے ذخیرہ کتب میں موجود ہیں، جن کے موضوعات کا کسی نہ کسی طور، غالب سے کچھ نہ کچھ تعلق بنتا ہے اور جن میں سے ہر ایک پر بھارت کی کسی نہ کسی یونیورسٹی سے اسکالرز کو پی۔ایچ۔ڈی کی اسناد تفویض ہوئی ہیں:

۱۔ اردو کے ادبی معرکے، انشا سے غالب تک، ڈاکٹر محمد یعقوب عامر
ناشر: ترقی اردو بیورو، نئی دہلی ۱۹۸۲ء، ص ۴۴۸

۲۔ غالب کا عظیم المرتبت شاگرد صریر بلگرامی (حیات اور کارنامے)، ڈاکٹر ظفر اوکانوی
اقدار کتاب گھر، کلکتہ، جون ۱۹۷۶ء، ص ۴۹۶

۳۔ نظم طباطبائی۔ حیات اور کارناموں کا تنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر اشرف رفیع
مطبوعہ: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، حیدر آباد دکن، دسمبر ۱۹۷۳ء، ص ۵۱۲

۴۔ رشید احمد صدیقی۔ شخصیت اور فن، ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید
پہلا ایڈیشن ۱۹۶۸ء، دوسرا ایڈیشن ۱۹۷۶ء
ناشر: نیشنل بک ڈپو، چار کمان حیدر آباد، ص ۴۲۶

۵۔ نیاز فتح پوری، از: ڈاکٹر امیر عارفی
انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی، اپریل ۱۹۷۷ء، ص ۴۰۸

۶۔ نقد بجنوری، از: ڈاکٹر حدیقہ بیگم
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، نومبر ۱۹۸۴ء، ص ۱۶۰

یہاں غالب پر بھارت میں ہونے والے ان تحقیقی کاموں اور حوالوں سے صرف نظر کرتا ہوں جو چھپے نہیں، یا چھپے ہیں تو میرے ذخیرۂ غالبیات میں نہیں ...... ان کاموں اور حوالوں کی تفصیل میرے ۱۹۷۰ء سے ۱۹۸۲ء اور ۱۹۸۳ء سے ۱۹۹۷ء تک کے دو غالبیاتی جائیزوں میں الگ الگ آچکی ہیں۔

غالب پر پاکستان میں پی ایچ ڈی کی سطح پر پہلا تحقیقی کام، قیامِ پاکستان کے پچیس برس بعد ۱۹۷۲ء میں انجام پایا، اب اس پر پچیس برس مزید گزر چکے۔ اس عرصے میں یونیورسٹیوں میں مطالعہ غالب کی روایت نے جڑ پکڑی ہے اور یہ کسی قدر مضبوط اور توانا ہوئی ہے۔

یہ ایک حسنِ اتفاق ہے کہ پاکستان میں غالب پر پی ایچ ڈی کی پہلی سند فضیلت حاصل کرنے کا اعزاز مجھے حاصل ہوا ...... مقالے کا موضوع تھا: "غالبیات کا تحقیقی اور توضیحی مطالعہ" ...... میں نے یہ تحقیقی کام ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان صاحب کی نگرانی میں پورا کیا۔ پچیس برس پہلے ۱۹۷۲ء میں سندھ یونیورسٹی سے مجھے ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض ہوئی۔ اس خوشگوار امتیاز کی طرف اشارہ بھی لطف سے خالی نہ ہوگا کہ غالب کے ایک سو پچھترویں جشنِ غالب ولادت (۱۹۷۲ء) کے موقع پر یہ مقالہ پی ایچ ڈی کے لئے منظور ہوا اور اضافہ و ترمیم کے بعد "غالب کا علمی سرمایہ" کے نام سے غالب کی ایک سو بیسویں برسی کی مناسبت سے ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا۔ کتاب کا نیا ایڈیشن غالب کے دو صد سالہ جشن ولادت پر ۱۹۹۷ء میں آیا۔

پچھلے پچیس برس کے عرصے میں غالب پر پی ایچ ڈی، ایم فل اور ایم۔ اے کی جزوی تکمیل کے سلسلے میں مقالات لکھے گئے ہیں۔ ۱۹۸۶ء میں پی ایچ ڈی کا ایک مقالہ "شارحینِ دیوانِ غالب" (اردو شروح کا تقابلی مطالعہ) پنجاب یونیورسٹی میں ڈاکٹر وحید قریشی کی زیر نگرانی لکھا گیا۔ مقالہ نگار ہیں محمد ایوب شاہد۔ یہ مقالہ بھی کتابی صورت میں چھپ گیا ہے۔

۱۹۷۴ء میں ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی کو سندھ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی۔ ان کا موضوع تھا "اردو شعرا کا فارسی اور اردو شاعری کا تقابلی مطالعہ"۔ یہ مقالہ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان کی نگرانی میں مکمل ہوا۔ کتابی صورت میں چھپا نہیں ہے۔ ڈاکٹر فاروقی کا مقالہ براہ راست اور تمام کا تمام صرف غالب کے بارے میں نہیں لیکن اس کا ایک حصہ یقیناً غالب کی فارسی اور اردو شاعری کے تقابلی مطالعے پر مبنی رہا ہوگا۔

میرے ذخیرۂ غالبیات میں بعض مطبوعہ مقالات ایسے ہیں جن پر کسی نہ کسی پاکستانی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی ہے، موضوع براہِ راست غالب سے متعلق نہیں لیکن صاحب موضوع کا غالب سے کسی نہ کسی نوع کا تعلق نکلتا اور بنتا ہے:

۱- مولانا غلام رسول مہر...... حیات اور کارنامے، از ڈاکٹر شفیق احمد مطبوعہ، لاہور ۱۹۸۸ء

۲- مسعود حسن رضوی ادیب...... حیات اور کارنامے، از: ڈاکٹر طاہر تونسوی مطبوعہ، لاہور ۱۹۸۹ء

۳- نیاز فتح پوری...... شخصیت اور فن، از: ڈاکٹر عقیلہ شاہین مطبوعہ، کراچی ۱۹۹۵ء

مولانا غلام رسول مہر (اپریل ۱۹۹۵ء- نومبر ۱۹۷۱ء)، مسعود حسن رضوی ادیب (جولائی ۱۸۹۳ء- نومبر ۱۹۷۵ء)، اور نیاز فتح پوری (۱۸۸۴ء- ۱۹۶۶ء)، کی دیگر علمی خدمات سے قطع نظر ان کی ایک جہت "غالب شناسی" کی بھی بہت متعارف اور معلوم ہے، ظاہر ہے ان کی حیات اور خدمات پر کوئی تحقیقی کام جب بھی ہوگا اور جہاں بھی ہوگا، اس میں ان شخصیات کے، غالب سے تعلق پر ضرور بحث ہوگی...... مندرجہ ذیل تینوں صورتوں میں یہی ہوا ہے...... ان مقالوں میں مولانا غلام رسول مہر، سید مسعود حسن رضوی ادیب، اور نیاز فتح پوری کی خدمات غالب، کہیں مفصل، کہیں غیر مرتب اور بعض صورتوں میں ضمناً اور جزواً زیر بحث آئی ہیں۔ بحث اور تجزیہ کا معیار بھی ایک سا نہیں۔ بحث کے معیار کا سوال، محقق اور نقاد کی انفرادی توفیق سے جڑا ہوتا ہے، اس لئے ان مقالات میں مباحث کا معیار، ایک نہیں تو اس پر متعجب نہ ہونا چاہیے۔ یہ ایک معیار کا ہوتا تو تعجب کا باعث ہوتا!

۱۹۹۵ء میں ایم فل (اردو) کے لئے غالب سے متعلق ایک تحقیقی کام کی منظوری عمل میں آئی۔ موضوع ہے: "تین اہم غالب شناس: مولانا مہر، مالک رام اور ڈاکٹر سید معین الرحمٰن"...... مقالہ نگار پروفیسر نیر پرویز کا کہنا یہ ہے کہ وہ کام مکمل کر چکیں اور تھیس ڈگری کے لئے پیش کیا جا چکا ہے۔

پچھلے پچیس تیس برس میں پاکستان کی متعدد یونیورسٹیوں اور بعض الحاقی کالجز میں جہاں ایم۔ اے (اردو) کی تدریس اور تحقیق کا انتظام ہے، غالب شناسوں پر ایم۔ اے کی سطح کے مقالات (تھیس) بھی لکھے گئے ہیں۔ اس تحقیقی کام کی کچھ دستیاب تفصیل یہ ہے:

۱- کتابیات متعلقہ غالب (صفحات ۱۲۵) فیم النعیم، ۱۹۶۴ء، نگران: ڈاکٹر سید عبداللہ اور وزیر الحسن عابدی

۲- غالب کی امیجری (صفحات ۱۶۴) زرینہ خٹک، ۱۹۷۰ء، نگران: ڈاکٹر عبادت بریلوی

۳- اردو رسائل کے غالب نمبر- اشاریہ (ص ۲۱۸)، شمیم اختر ۱۹۷۰ء، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی
۴- کلام غالب میں فکری عناصر (ص ۱۱۹)، صابرہ بانو، ۱۹۷۴ء، سجاد باقر رضوی
۵- شیخ محمد اکرام (غالب شناس)، (ص ۱۱۲)، نسیم کوثر، ۱۹۸۵ء، فخر الحق نوری

شعبہ فلسفہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور:

* غالب کی اردو شاعری کی مابعد الطبعاتی روایت (ص ۲۳۷)، تنویر جہاں قریشی، ۱۹۸۶ء، نگران ساجد علی

شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج، ملتان:

* خطوط غالب: اردو (ص ۴۱۳)، مقالہ نگار: نصرت فاطمہ ملک، ۱۹۶۹ء، نگران: پروفیسر خلیل صدیقی

شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج، فیصل آباد:

۱- مطالعہ غالب انیسویں صدی میں، (ص ۳۰۱) نجمہ نیاز، ۱۹۷۴ء، نگران: ڈاکٹر سید معین الرحمن
۲- ڈاکٹر ایس ایم اکرام بطور غالب شناس، (ص ۲۱۸) قمر النساء شیخ، ڈاکٹر معین الرحمن
۳- مولانا غلام رسول مہر بطور غالب شناس، (ص ۲۰۳) نیر سلطانہ، ۱۹۷۴ء، ڈاکٹر معین الرحمن
۴- غالب کے تین اہم سوانح نگار، مہر، اکرام اور مالک رام (ص ۲۱۸) شازیہ اشفاق، ۱۹۹۱ء، ڈاکٹر انور محمود خالد
۵- غالب اور حالی کا تحقیقی مطالعہ (ص ۱۳۰)، مقالہ نگار: ناہید اختر، شاہدہ شاہین، خالدہ حق، نوید افشاں، اعجاز حنیف، نگران: ڈاکٹر سید معین الرحمن

یہاں اس آخری کام کے بارے میں کچھ کہنا ضروری ہے: ۱۹۷۶ء سے ۱۹۸۰ء تک میں نے منجملہ دیگر کورسز، شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج فیصل آباد (لائل پور) میں ایم- اے (اردو) کے ایک سیمسٹر کورس "اصول تحقیق و تدوین" کی تدریس کی خدمت بھی انجام دی ...... ۱۹۷۸ء میں اس کورس کی تفویضات (Assignments) کے لئے میں نے متعلمین کو پانچ پانچ کے گروپس میں تقسیم کر کے، ہر گروپ سے موضوعاتی مناسبت سے مختلف تحقیقی جائزے مرتب کرائے "غالب اور حالی کا تحقیقی مطالعہ" اس کورس کی ہوم ایسائنمنٹس کے طور پر لکھے گئے غالب اور حالی

کے بارے میں پانچ اہم تحقیقی کتابوں کے تحقیقی جائزوں پر مشتمل ہے:

۱- شہنشاہ سخن غالب...... (ڈاکٹر عارف شاہ گیلانی)، جائزہ نگار: ناہید اختر

۲- غالب اور انقلاب ستاون (ڈاکٹر سید معین الرحمن)، شاہدہ شاہین

۳- حالی بحیثیت شاعر (ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی)، خالدہ حق

۴- حالی کی اردو نثر نگاری (ڈاکٹر عبدالقیوم)، نوید افشاں

۵- حالی کا سیاسی شعور (ڈاکٹر معین احسن جذبی)، اعجاز حنیف

غالب اور حالی کے بارے میں پانچ کتابیں جنہیں وادی تحقیق کے نو آموز متعلمین نے اپنے مطالعے کے لئے منتخب کیا، ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۴ء کے درمیانی عرصے میں لکھی گئیں۔ ان میں سے ایک پر داؤد ادبی انعام دیا گیا جو پاکستان میں تحقیق و تنقید ادب کا، اس زمانے تک سب سے بڑا اعزاز تھا، اور چار پر بمبئی، لکھنؤ، کراچی اور علی گڑھ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگریاں تفویض ہوئیں...... اس عقب میں ان پانچ کتابوں کو غالب اور حالی پر ۱۹۷۴ء تک کی چوتھائی صدی کے نمایاں ترین تحقیقی اکتساب میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ خوشی اور اطمینان کی بات یہ ہے کہ ان نوخیز مقالہ نگاروں نے کتابوں کے انتخاب میں خوش نظری کا ثبوت دیا ہے اور ان سب کو اپنے تحقیقی جائزوں کے نتائج کا اظہار کرنے کے لئے منضبط اور مؤثر پیرائیہ بیان میسر آیا۔

"آخری سوار" اعجاز حنیف کو ابتدائی تربیت سے فائدہ اٹھانے کا موقع میسر آیا اور انہوں نے عزیز احمد پر تحقیقی کام کر کے پنجاب یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ وہ آج کل فیڈرل گورنمنٹ کالج، اسلام آباد میں پڑھا رہے ہیں اور اپنے تحقیقی کام کی طباعت و اشاعت کی فکر میں ہیں۔ یہ ایک خوش آئندہ صورت حال ہے...... اچھے تحقیقی کام کا چھپنا ثواب اور اس کا چھپا رہنا کار ناصواب ہے۔

شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج لاہور میں پچھلے دس برسوں میں (۱۹۸۷ء سے ۱۹۹۷ء تک) غالب سے متعلق ایم۔ اے (اردو) کے جو تھیسس لکھے گئے ان کے کتابیاتی کوائف یہ ہیں:

۱- رسالہ نقوش، میں ذخیرہ غالبیات، (ص ۳۸۸)، مقالہ نگار: نائیلہ انجم، ۱۹۸۷ء

۲- مالک رام بطور غالب شناس، (ص ۱۶۰)، ربیعہ نصرت، ۱۹۸۸ء

۳- مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی بطور غالب شناس (ص ۲۰۲)، نجمہ اقبال، ۱۹۸۸ء

۴- ڈاکٹر شوکت سبزواری بطور غالب شناس (ص ۱۹۲)، شہناز اختر، ۱۹۸۸ء

۵- آل احمد سرور بطور غالب اور اقبال شناس (ص ۳۱۱)، لبنیٰ ناز لودھی، ۱۹۸۸ء
۶- توضیحی اشاریہ خطوط غالب (مولانا غلام رسول) جلد اول (ص ۱۶۰)، ہما اخلاق نسیم، ۱۹۸۹ء
۷- توضیحی اشاریہ خطوط غالب (مولانا غلام رسول مہر)، جلد دوم (ص ۱۶۵)، ساجدہ پروین، ۱۹۸۹ء
۸- اردو کلام غالب کا ابجدی اشاریہ، (ص ۳۸۳)، سیدہ نغمہ واسطی، ۱۹۸۹ء
۹- "غالب نامہ" (نئی دہلی کا تجزیاتی مطالعہ (ص ۴۵۳))، عاصمہ اعجاز، ۱۹۹۲ء
۱۰- عبدالرحمن چغتائی بطور غالب شناس (ص ۱۹۷)، حنا سرور، ۱۹۹۳ء
۱۱- ڈاکٹر مختار الدین احمد بطور غالب شناس (ص ۱۸۷)، شمیلہ ستار، ۱۹۹۳ء
۱۲- مالک رام کی علمی اور ادبی خدمات (ص ۱۶۲)، اطہر قسیم، ۱۹۹۴ء
۱۳- ڈاکٹر وحید قریشی بطور غالب شناس (ص ۱۱۹)، حنا انیس، ۱۹۹۵ء
۱۴- ڈاکٹر سید عبداللہ بطور غالب شناس (ص ۱۸۷)، شکیلہ شاہجہاں، ۱۹۹۵ء
۱۵- پروفیسر سید وقار عظیم بطور غالب شناس (ص ۱۳۱)، روشینہ ریاض، ۱۹۹۶ء
۱۶- ڈاکٹر فرمان پوری بطور غالب شناس (ص ۲۶۴)، افصح وحید، ۱۹۹۶ء
۱۷- کالی داس گپتا رضا بطور غالب شناس (ص ۲۶۹)، عظمت رباب، ۱۹۹۷ء
۱۸- صادقین بطور شاعر اور مصور غالب، محمد طاہر، ۹۸-۱۹۹۷ء

مندرجہ بالا سب مقالات کی نگرانی کی خدمت راقم الحروف (ڈاکٹر سید معین الرحمن) کے سپرد رہی، آخری مقالے پر تحقیقی کام زیر تکمیل ہے۔ تھیس کا موضوع، پنجاب یونیورسٹی سے منظور ہو چکا ہے۔ امید ہے کہ چند ماہ تک مقالہ امتحان کے لئے پیش کیا جا سکے گا۔

ان سب اسکالرز نے، جنھوں نے شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج، لاہور میں غالب سے متعلق مقالے تحریر کئے، بلا استثنیٰ اپنے کام پر درجہ اول کے نمبر پائے ...... نجمہ اقبال کا مقالہ: "مولانا مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی بطور غالب شناس" کراچی کے ماہنامے "الامیر" (مدیر سید اشفاق حسین) میں فروری ۱۹۹۵ء سے اپریل ۱۹۹۶ء تک قسط وار چھپ گیا ہے۔ افسوس کہ بیشتر اقساط پر مقالہ نگار نجمہ اقبال کا نام درج ہونے سے رہ گیا ہے۔

نائیلہ انجم، ہما اخلاق نسیم، ساجدہ پروین اور عاصمہ اعجاز کے مقالات کتابی صورت میں منظر عام پر آئے۔ اشعبہ اردو، گورنمنٹ کالج، لاہور میں غالب کے علاوہ دیگر متعدد موضوعات پر لکھے گئے

ایم اے کے مقالات بھی کتابی صورت میں چھپے ہیں۔ یہ ایک بڑا امتیاز ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ ملک اور بیرون ملک کے اہل علم و قلم کی جانب سے اس اہتمام اور انصرام کا تحسین آمیز اعتراف ہوا ہے۔

شعبہ فلسفہ گورنمنٹ کالج، لاہور میں ۱۹۶۷ء میں عبیدہ شاہ نے بزبان انگریزی، غالب کے بارے میں ایک تھیس لکھا، موضوع تھا: "غالبز فلاسفی آف بیوٹی: (ضخامت سو صفحات کے لگ بھگ)، اس مقالے کا تفصیلی حوالہ "اشاریہ غالب" میں آیا ہے۔ ۲ یہ مقالہ، سنتا ہوں کہ غالب کے دو صد سالہ جشن ولادت (۱۹۹۷ء) کے موقع پر کتابی صورت میں چھپ گیا ہے۔ عبیدہ شاہ کا مقالہ یا اس کی کتابی شکل، میرے ذخیرہ غالبیات میں موجود نہیں۔

اس مختصر جائزے میں صرف ان مقالات کا احاطہ کیا جا سکا ہے، جو میرے ذاتی ذخیرہ غالبیات میں موجود اور محفوظ ہیں۔ غالب پر کچھ کام بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان اور شعبہ اردو اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور میں بھی ہوا ہے، لیکن وہ مقالے میرے ذخیرے میں نہیں اور میرے دیکھے ہوئے بھی نہیں۔ پاکستان کی دوسری یونیورسٹیوں میں بھی غالب پر ممکن ہے کام ہوا ہو، جس سے میں بے خبر ہوں ...... بایں ہمہ پاکستانی جامعات میں غالب پر ہونے والے کام کی جس قدر تفصیل اوپر پیش کی جا سکی ہے، وہ اس امر پر گواہ ہے کہ اس گئے گزرے زمانے میں بھی کہ علم و ادب اور اس میں فضل و کمال اور اختصاص کو رو بہ زوال سمجھا جانے لگا ہے، اعلیٰ مدارج کے نوخیز اور ذی استعداد متعلمین کے لئے غالب نے کشش کھوئی نہیں ہے۔

غالب کی ذات، ان کی ادبی عظمت، اہمیت اور مقبولیت آج بھی حریف مے مرد افگنِ عشق کا درجہ رکھتی ہے۔ ان کے شرح احوال، ان کی شخصیت اور ان کے کلام اور فن کے مطالعے کا میدان روز بروز بیکراں اور بے کنار ہوتا جا رہا ہے۔

غالب میری کمزوری بھی ہے اور قوت بھی۔ غالب پر میں نے کام کرنے، کرتے رہنے اور کام کرانے کی طرف اپنی توجہ مرکوز رکھی۔ میں جو کچھ کر، یا کرا سکا، اس سے مطمئن نہیں لیکن کچھ ایسا شرمندہ بھی نہیں ہوں ...... ناتمامیاں، میری بے بضاعتی کا نتیجہ، اور کامرانیاں اپنے بزرگوں کی توجہات کا انعام ہیں ...... مجھ خزف کی نسبت ایک بڑی مسند سے ہے، میری مراد استاد محترم و معظم ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان صاحب سے ہے جن کی تحریک، تائید اور نگرانی میں غالب پر میں تحقیقی کام کر سکا اور اس روایت کو کس قدر بالیدہ اور باثمر بنا سکا۔

غالب پر اپنے کام ہی کی تخصیص نہیں، اپنے دوسرے علمی کاموں پر بھی اگر میری تحسین

ہوئی ہے، اور انہیں استحقاق سے زیادہ قبولیت اور پذیرائی نصیب ہوئی ہے تو یہ منجانب اللہ ہے ...... لیکن اس سب اعزازات اور عزت افزائیوں کو میں استاد مکرم ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان کے روحانی تصرف اور پروفیسر سید وقار عظیم مرحوم کے فیض تربیت سے خالی نہیں پاتا۔

خرام تجھ سے، صبا تجھ سے، گلستاں تجھ سے!

(دسمبر ۱۹۹۷ء)

حواشی:

* نائیلہ انجم: نقوش میں ذخیرہ غالبیات، الفیصل ناشرین، لاہور ۱۹۸۹ء، ضخامت: ۳۵۲ صفحات
* ہما اخلاق: اشاریہ خطوط غالب (مہر)، مطبوعہ: شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج لاہور، ۱۹۹۲ء، ۱۴۴ صفحات
* ساجدہ پروین: اشاریہ خطوط غالب (مہر)، مطبوعہ: شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج لاہور، ۱۹۹۳ء، صفحات ۱۴۴
* عاصمہ اعجاز: غالب نامہ، تجزیاتی مطالعہ، مطبوعہ: شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج لاہور، ۱۹۹۴ء، صفحات ۴۲۲
* اشاریہ غالب، سید معین الرحمن، ادارہ یادگار غالب پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۶۹ء، ص ۳۱۹

غالب کا بادشاہ بس نام کا بادشاہ ہے۔ عملداری انگریز کی ہے۔ بے اختیار بادشاہ کی جیب خالی ہے۔ وہ دال پکا کر غالب کو تحفہ میں بھیجتا ہے۔ غالب شعر اور لفظ کا بااختیار بادشاہ ہے۔ وہ اس تحفہ کے بارے میں ایک رُباعی کہتا ہے اور اِس دال کو دولت و دین و دانش و داد کی دال قرار دیتا ہے۔ جب غالب ایسے بے بس بادشاہ کا قصیدہ لکھتا ہے تو کہتا ہے کہ اُس کے لشکر کا جھنڈا بلند ہونے پر چرخ کو چکر آ گیا، اِس نام کا خطبہ میں آیا تو منبر کا مرتبہ بلند ہو گیا، ملک و سلطنت کا ایسا عظیم الشان وارث دیکھا تو لوگ طغرل و سنجر کو بھول گئے۔ بادشاہ اتنا بے خبر ہے کہ قلعہ سے باہر دنیا بدل گئی اور اسے پتہ نہ چلا مگر شاعر کہتا ہے اِس کے علم کا یہ عالم ہے کہ لوح ازل میں جو کچھ لکھا ہوا ہے وہ بادشاہ پر عیاں ہے۔ پھر شاعر دُعا دیتا ہے کہ ایسے بادشاہ کی بادشاہت اِس وقت تک سلامت رہے جب تک، ہے طِلسم روز و شب کا در کھلا۔ قصیدہ گو شاعر بھی دراصل بازیگر ہوتا ہے۔

دیتے ہیں دھوکہ یہ بازیگر کھلا

وقت نے ثابت کیا کہ غالب کا شعر زوردار ہے مگر بادشاہ کمزور۔ بادشاہ گرفتار ہوا، مقدمہ چلا، جلاوطن کیا گیا۔ غالب نے ایک بغل میں بیاض اور دوسری میں درخواست دبائی اور کلکتہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے دفتر میں داد اور پنشن لینے پہنچ گئے۔

(مختار مسعود، لوح ایام، ص 33، لاہور)

غالب کا نفسیاتی مطالعہ

ڈاکٹر سلیم اختر

تخلیقات کا نفسیاتی مطالعہ نہ تو کوئی ایسی انوکھی بات ہے کہ اس کی بطور خاص صراحت کی ضرورت ہو اور نہ ہی اردو تنقید میں یہ ایسی بدعت ہے کہ بطور جواز ایک معذرت نامے کی ضرورت ہو۔ ادبیات کا نفسیاتی مطالعہ دلچسپ بھی ہو سکتا ہے اور خطرناک بھی۔ دلچسپ اس وقت جب نفسیات کے جائز اور ناجائز استعمال کے نازک سے فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کی حدود سے تجاوز نہ کیا جائے۔ نفسیات ایک علم اور تحلیل نفسی ایک طریقۂ علاج ہے۔ سو نفسیاتی نقاد کے لئے اس امر کو ہمیشہ ذہن نشین رکھنا ہو گا کہ بطور ایک علم نفسیات کی حدود بہت وسیع ہیں اور زندگی کا شاید ہی کوئی ایسا گوشہ اور علم کا ایسا شعبہ ہو گا جس کی نفسیاتی چھان پھٹک نہ کی گئی ہو (یا نہ کی جا سکتی ہو) اور جہاں کہیں بھی اس علم کی حدود سے تجاوز نہ کیا گیا وہاں سنسنی خیز یا تحیر افزا ہونے کے باوجود بھی نتائج کو مثبت ہی قرار دیا جائے گا۔ کچھ یہی حال تمام تخلیقات کا ہے۔ تخلیق کار کا ذہن لامحدود امکانات کا گہوارہ ہے اور تخلیق ان امکانات کی نشاندہی کے لئے ایک کارآمد اشاریہ بن جاتی ہے۔ لیکن تخلیقات کے تجزیاتی مطالعہ کے لئے نفسیات (یا اس لحاظ سے اور کوئی بھی علم کیوں نہ ہو) کی اپنی مخصوص حدود ہیں جن سے آگے نفسیاتی مطالعہ نہیں جا سکتا (یا اسے نہ جانا چاہیئے) ویسے تو ان حدود کا تعین نفسیات کے اپنے دائرہ کار سے ہی ہوتا ہے، لیکن خود ناقد کا اپنا شعور بھی ایک طرح کی حدِ فاصل بن سکتا ہے۔ اس مقصد کے لئے "خصوصی" کو "عمومی" سمجھ لینے کے رجحانات پر بطورِ خاص قابو پانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً غالب کا ایک شعر ہے

باغ پا کر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے
سایۂ شاخِ گل افعی نظر آتا ہے مجھے

گو یہ شعر واضح طور سے کسی مخصوص نفسی خوف (Phobia) یا ذہنی التباسات (Hallucinations) کی طرح اشارہ کرتا ہے۔ لیکن کیا محض اسی ایک شعر کی بنیاد پر غالب کو ذہنی مریض قرار دیا جا سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ نہیں۔

نفسیات کے اصول اپنے مخصوص مقاصد کے لئے درست ہیں اور تحلیلِ نفسی کے قواعد اپنے سیاق و سباق میں بالکل صحیح ہیں، لیکن انہیں ان کے سیاق و سباق سے نکال کر غلط طور پر غلط تجزیات پر منطبق کرنے سے غلط نتائج کا امکان ہے۔

نقاد کا بنیادی منصب محض تخلیقات کے حسن و قبح کا جائزہ لینا ہی نہیں ہوتا۔ کوئی بھی تشریحی نقاد یہ کام بطریق احسن کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس ایک بالغ نظر نقاد یہ دکھانے کی کوشش کرتا ہے کہ تخلیق کے آئینے میں روحِ عصر کس زاویہ سے عکس فگن ہوتی ہے۔ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ اس تخلیق کا آج کے طرزِ احساس سے کیا رشتہ ہے۔ کیا یہ اس کی ترجمانی کا حق ادا کرتی ہے یا اس کی تردید اسے کسی نئے سانچے میں ڈھال رہی ہے یا مروّج سانچوں کو ختم کر رہی ہے۔ ماضی کی تخلیقات میں بھی یہی ملحوظ رکھنا ہوگا کہ اس تخلیق نے ماضی کو کس طور سے متاثر کیا اور اس سے بڑھ کر یہ کہ آج کے جدید تقاضوں کے بارے میں اس کا رویہ کیسا ہے۔ ماضی کا ہر تخلیق کار اور اس کی تخلیقات صرف اسی خصوصیت کی بنا پر ہی زندہ رہتی ہیں کہ اس میں ہر عہد اور ہر عصر کا آئینہ بننے کی صلاحیت ہو اور ظاہر ہے کہ یہ صلاحیت محض استعارے کے خوبصورت استعمال سے عبارت نہیں۔

غالب جو آج تک زندہ ہے اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ اس کے اشعار میں ہمارے لئے آئینہ بھی ہے اور تصویر بھی۔ اگر ایک طرف وہ ہمیں ہماری فطرت کی تصویر دکھاتا ہے تو دوسری طرف کچھ تصویریں وہ خود بھی دکھاتا ہے۔ یہ تصویریں تحیر افزا بھی ہیں اور بصیرت افروز بھی۔ ایک فرد ہی کے لئے نہیں بلکہ ایک عصر کے لئے بھی۔

اس مقصد کے لئے نفسیات کی یوں ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ یہی وہ علم ہے جس سے بیک وقت تخلیق اور تخلیق کار کا جائزہ لیا جاسکتا ہے اور اسی کی امداد سے ایک عصر کو مخصوص رنگ میں رنگنے والے عوامل میں سے نفسی محرکات کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کے تناظر میں تخلیق کار کے تجزیاتی مطالعے سے مرتبہ نتائج کو "آج" کے محدب شیشے میں دیکھنے کے بعد ان کی صحیح اہمیت متعین کی جا سکتی ہے۔

یہ آسان نہیں اور غالب ایسے شاعر کی صورت میں اور بھی مشکل ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ نفسیاتی مطالعہ بطورِ خاص غالب ہی کا کیوں ہو؟

اس کا سیدھا سا جواب تو یہی ہے کہ غالب کے تمام تو نہیں، لیکن کچھ اشعار ایسے ہیں جن میں اس نے بعض امورِ زیست کے بارے میں انسانی نفسیات سے گہری واقفیت کا ثبوت دیا

ہے۔ لیکن یہ بات تو بعض اور اچھے شعراء کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ اس لئے اسے غالب کی انفرادی خصوصیت نہیں قرار دیا جا سکتا۔ دراصل غالب کی اصل اہمیت اس میں مضمر ہے کہ اس کے کلام میں ایسے اشعار خاصی تعداد میں مل جاتے ہیں جن سے اس کی اپنی شخصیت کے مخصوص نفسی رجحانات کی عکاسی ہوتی ہے۔ ایک صدی سے ناقدین غالب کی عظمت کے مختلف پہلو اجاگر کر رہے ہیں اور مختلف نقطہ ہائے نظر سے اس کی شاعرانہ اہمیت متعین کی جاتی رہی ہے۔ لیکن کسی ناقد نے بھی بطور خاص نفسیات کی روشنی میں غالب کے اس نوع کے اشعار کے تحلیلی مطالعے کی کوشش نہ کی اور نہ ہی ان اشعار میں اس کی نفسیاتی اور کسی حد تک جنسی زندگی کے بارے میں جو واضح یا غیر واضح اشارات ملتے ہیں، ان کی تفہیم اور تشریح کی کوششیں کی گئیں۔ گویا نفسیاتی نقطۂ نظر سے غالب کا مطالعہ ادھورا رہا ہے۔

تخلیق کار اپنی شخصیت سے فرار حاصل نہیں کر سکتا۔ خواہ یہ فرار تخلیق ہی کی صورت میں کیوں نہ ہو۔ شخصیت سے وابستہ مخصوص نفسی رجحانات ان غیر مرئی زنجیروں سے مشابہ قرار دیئے جا سکتے ہیں جن کے بندھن سے نجات حاصل کرنی کوئی آسان کام نہیں۔ اس لئے تخلیق کار فرار کی صورت میں ان زنجیروں کو پیچھے نہیں چھوڑ دیتا بلکہ ان کے ساتھ ہی فرار کرتا ہے۔ یوں نفسیاتی لحاظ سے وہ ایک دائرہ میں بھاگتا رہتا ہے اور لاکھ کوشش کرنے پر بھی وہ شخصیت کے اس طلسمی دائرے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ تخلیق بظاہر لاشعور کی وہ جست ہے جو تخلیق کار لاشعور کی طلسمی بھول بھلیوں سے باہر آنے کے لئے لگاتا ہے لیکن اپنی "بلند پروازی" کے باوجود بھی وہ پابہ زنجیر رہتا ہے کہ لاشعور تخلیق میں رنگ آمیزی سے اپنے جبر کا اظہار کرتا ہے۔ بعض اوقات یوں محسوس ہوتا ہے کہ لاشعور کا جن تخلیق کی بوتل میں بند ہو گیا ہے، لیکن یہ محض خوش فہمی ہوتی ہے۔

نفسیاتی لحاظ سے غالب ایک پیچیدہ ذہن اور تہ در تہ جہات پر مشتمل شخصیت رکھنے والا تخلیق کار تھا۔ کلام کے علاوہ اس کے خطوط سے بھی اس کی وافر شہادتیں مل جاتی ہیں۔ چنانچہ اشعار سے قطع نظر خطوط سے اس کی نفسی تصویر مرتب کرنی کچھ ایسی مشکل نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس نے کمال بے تکلفی سے کام لیتے ہوئے اپنے بارے میں کھل کر لکھا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ خطوط کے برعکس "تنگنائے غزل" میں اسے "بادہ و ساغر" جیسے مستعمل استعاروں کے سہارے ابلاغ کرنا تھا اور اس نے ایسا ہی کیا۔ غالب کی جس "تہ داری" کو ناقدین کی تین نسلیں سراہتی آ رہی ہیں، وہ محض تشبیہہ اور استعاروں کی پیدا کردہ نہ تھی بلکہ اس سے مراد مفہوم کی وہ کھلتی ہوئی جہات ہیں جو بالآخر

نفسی صداقت تک پہنچا دیتی ہیں۔ غالب نے جو بات برائے تفنن لکھی تھی وہ نفسیاتی لحاظ سے بالکل درست ہے۔

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

یہ شعر ایک اہم نکتہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

غالب کے عہد تک غزل کی روایات اور مسلمات طے پا چکے تھے اور اظہار کے لئے اسلوب کا بھی ایک انداز متعین ہو چکا تھا۔ اساتذہ نے جو کچھ کہا اور جس طور پر کہا ہر عہد میں شعرا کی ایک بھیڑ کی بھیڑ روایت کے نام پر ٹکسال سے نکلے ہوئے سکوں کی مانند اشعار کہتی رہی۔ غالب (یا کسی بھی تخلیق کار) کے نفسیاتی مطالعہ کے ضمن میں یہ اساسی حقیقت کبھی بھی فراموش نہیں کی جا سکتی کہ غالب ایسا عظیم شاعر بھی نہ تو روایتی مظامین سے گریز کر سکتا ہے اور نہ ہی غزل کو بھرتی کے اشعار سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ اس لئے یہ یا اس انداز کے اور اشعار کی بنا پر غالب کو ہم جنس پرست شاعر نہیں دیا جا سکتا۔

آمدِ خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست
دودِ شمع کشتہ تھا شاید خط رخسارِ دوست

بالکل اسی طرح جس طرح بعض اخلاقی مضامین کی بنا پر اسے "ملا" یا متصوفانہ اشعار کو بنیاد بنا کر اسے "صوفی" بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ اس نوع کے مضامین غزل کی روایت میں سے ہیں اور صدیوں سے شعراء خود کو جذباتی لحاظ سے مملو کئے بغیر، انہیں باندھتے آئے ہیں، اس لئے غالب بھی اپنی تمام جدت پسندی کے باوجود ان سے فرار حاصل نہ کر سکتا تھا۔

اس کے برعکس غیر روایتی شعر کی اور بات ہوتی ہے۔ ایسا شعر شاعرانہ زبان میں "دل" سے نکلتا ہے۔ اس کی اساس ساخت یا شاعرانہ مہارت پر نہیں ہوتی، بلکہ اس کا تعلق لاشعور کی پیدا کردہ وارفتگی (یا ازخود رفتگی) سے ہوتا ہے اور اسی لئے پڑھنے والے میں بھی خاص قسم کے نفسی اثرات کے لئے باعث تہیج بنتا ہے۔ شاعر اگر تخلیق کے ارتفاع سے نفسی آسودگی حاصل کرتا ہے تو کامیاب ابلاغ کی صورت میں قاری بھی اس نفسی آسودگی میں شریک ہو جاتا ہے۔ یوں تخلیق کار اور قاری میں تخلیق کی وساطت سے لاشعور رابطہ کا باعث بنتا ہے۔ میں نے غالب کے نفسیاتی مطالعات میں اسی لاشعور کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ "غالب کی شاعری میں

جنس"، "غالب کی نرگسیت"، "مرد عاشق کی مثال" ایسے عنوانات چونکا دینے والے سہی، لیکن مقصد سنسنی خیز نہیں اور نہ ہی غالب کو نفسی مریض یا ابنارمل ثابت کرنا مقصود ہے۔ غالب ایسے شاعر کے ہاں محض تشبیہات واستعارات کے حسن اور تراکیب کی ندرت ایسی واضح خصوصیات ہی کو خصوصیات بنا کر انہی کی ضرورت سے زیادہ وضاحت کالج نوٹس یا خلاصوں کے لئے تو کار آمد ہو سکتی ہے، غالب ایسے شاعر کے لئے نہیں۔

غالب یا کسی بھی اعلیٰ سطح کے تخلیق کار کے مطالعہ کے لئے کسی مخصوص زاویۂ نظر کا ہونا بہت ضروری ہے۔ یہ نزاعی بھی ہو سکتا ہے اور بعض صورتوں میں غلط بھی لیکن سرے سے کوئی نقطۂ نظر نہ ہونے سے تو یقیناً بہتر ہی ہے۔

غالب (یا کسی بھی غزل گو شاعر) کے نفسیاتی مطالعے میں، دیوان میں غزلوں کی بلحاظ ردیف حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب غالباً سب سے بڑی اور خطرناک رکاوٹ بنتی ہے۔ ترتیب کے اس انداز کی بنا پر شاعر کے ذہن کے ارتقائی مدارج کو پالینا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔ غالب ایسے شاعر کے معاملے میں تو یہ رکاوٹ بہت دور رس نتائج کی حامل ثابت ہوتی ہے کیونکہ اس کا ذہن مسلسل ارتقا پذیر رہا۔ اس نے بیدل اور میر تقی میر کی دو انتہا پسندانہ شخصیات کی تقلید کے درمیان اور بھی اثرات قبول کئے تھے۔ انفرادی طور پر ان کی نشاندہی تو ہو سکتی ہے، لیکن کڑی سے کڑی ملا کر پوری زنجیر بنانی بہت مشکل ہے۔

بعض اوقات کوئی خاص نفسی وقوعہ کسی تخلیق کی صورت میں اظہار پاتا ہے اس لئے ایسی تخلیقات کی نفسیاتی اہمیت بہت زیادہ ہو جاتی ہے، لیکن اگر صحیح تاریخ کا تعین نہ ہو سکے تو ایسی تخلیق کی ادبی اہمیت سے قطع نظر نفسیاتی اہمیت برائے نام رہ جاتی ہے۔ مثلاً غالب کی اس مشہور غزل

درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

کے بارے میں عام طور سے یہی باور کیا جاتا ہے کہ یہ اسی "ستم پیشہ ڈومنی" کا مرثیہ ہے جس کا ذکر خود غالب نے اپنے ایک خط میں کیا ہے۔ لیکن اس کی توثیق کے لئے شواہد کی فراہمی نئے تحقیقی مسائل کو جنم دینے کے مترادف ہے۔

غالب کی نفسیات

تحریر: ڈاکٹر شمیم ترمذی

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے؟
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

رشید احمد صدیقی فرماتے ہیں "مجھ سے اگر پوچھا جائے کہ ہندوستان کو مغلیہ سلطنت نے کیا دیا؟ تو میں بے تکلف یہ تین نام لوں گا...... غالب، اردو اور تاج محل" اس میں کلام نہیں کہ تاج محل ذوقِ تعمیر کا کامل نمونہ ہے لیکن غالب اور اردو، تاج محل سے کہیں زیادہ اہم اور شاندار ہیں۔ ہماری محبوب زبان اردو کو غالب پر فخر اور غالب کو اردو پر ناز ہے۔ غالب اردو شاعری کے قافلے کا سالار اور اردو نثر کی راج دھانی کا حکمران ہے۔ غالب کو یہ عظمت کیسے حاصل ہوئی؟ یہ جاننے کے لئے ہمیں غالب کی بھرپور اور رنگا رنگ شخصیت کی نفسیات کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ یہ مطالعہ تین زاویوں سے کیا جاسکتا ہے۔

...... غالب کی نسلی برتری، غالب کے لڑکپن کی آسودہ حالی اور 1857ء اور بعد کی پُر آشوب زندگی........

غالب ایبک ترک تھے۔ ان کا سلسلہ افراسیاب سے ملتا تھا۔ سپہ گری ان کے آباء و اجداد کا پیشہ تھا۔ جاگیردارانہ نظام کا ایک ممتاز فرد ہونے کی وجہ سے ان کی شخصیت میں انا اور وضع داری بدرجۂ اتم موجود تھی۔ غالب کی خاندانی وجاہت نے انہیں ایک ممتاز، منفرد اور خوددار شخصیت عطا کی۔ اس انفرادیت اور انا نے غالب کا ساتھ کبھی نہ چھوڑا۔ انتہائی دگرگوں حالات میں بھی دعویٰ کرتے ہیں

بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوار یار میں
فرماں روائے کشورِ ہندوستان ہے

غالب کی زندگی خود پرستی کے جذبے سے سرشار ہے۔ وہ اپنی خاندانی عظمت اور منصب و خلعت ایسی چیزوں کو جب شعر کے قالب میں ڈھالتے ہیں تو یہ عام زندگی کی خود پرستی ایک ارفع

صورت اختیار کر جاتی ہے اور غالب کو "اورنگ سلیمان" ایک چیز اور "اعجاز مسیحا" ایک کھیل نظر آتا ہے۔ کبھی ہمیں بتاتے ہیں

ع...... رتبے میں مہر وماہ سے کم تر نہیں ہوں میں

کبھی ہم سے پوچھتے ہیں

ع...... کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں؟

اس احساس برتری اور زمانے کے ناسازگار حالات کے تصادم نے غالب کو خودنگری سکھائی اور اس نے خود نمائی کے جذبے کو شدید تر بنایا۔

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

غالب کے خاندانی تفاخر اور آزادروی کا ایک اہم نتیجہ یہ بھی نکلا کہ رشک ان کی ذات کا جزو بن کے رہ گیا۔ وہ کائنات کی ہر شے پر رشک کرتے نظر آتے ہیں۔ کبھی رقیب پر رشک ہے تو کبھی گوہر فروش پر، کبھی محبوب پر رشک کرتے ہیں تو کبھی اپنی ذات پر۔ حد یہ کہ خدا پر بھی رشک کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعدِ قتل
میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

غالب کی نفسیات کے مطالعے کے لئے دوسرا بڑا عنصر ان کے لڑکپن کی آسودہ حالی اور بے فکری ہے۔ غالب نے خوشحالی کا ایک دلکش دور دیکھا۔ لڑکپن عیش و عشرت اور رنگ رلیوں میں گزارا۔ اسی لئے ان کی طبیعت پر رومانیت اور حسن پرستی غالب رہی۔ حسن جس صورت میں بھی نظر آیا، غالب کی جمال پرست آنکھ کے لئے عید نظارہ بنا۔ حُسن بے پروا نے غالب کے قلب و نظر کو شکار کیا۔ غالب نے خوشحالی اور بے فکری کے اس دور کو آئیڈیل قرار دے دیا اور اپنی خودداری کی طرح اس آئیڈیل کو بھی عمر بھر نبھانے کی کوشش کی۔ مسرت اور آسودہ حالی کے حصول کے لئے تگ و دو کرتے رہے۔ مگر ناکامیوں اور نامرادیوں نے غالب پر یلغار کر دی۔ کوئی اور ہوتا تو انفعالیت اور احساس کمتری کی آگ میں بھسم ہو جاتا مگر غالب امید و بیم کی چٹان بنے رہے اور یاس کی لہریں اس چٹان سے سر ٹکراتی رہیں۔ غالب نے اپنے ظلمت خانے کو برق کی شمع سے روشن رکھا۔ غم عشق، غم روزگار اور غم بے مہریٔ احباب غرضیکہ کوئی غم بھی ان میں مریضانہ ذہنیت پیدا نہ کر سکا۔ وہ شکست آشنا ہونے کے باوجود حسرت و یاس کی تصویر نہیں بنتے بلکہ غموں کو تصویرِ زندگی کا رنگ اور حسرتوں کو عروسِ زندگی کا سنگھار سمجھتے ہیں۔ غم کے بغیر زندگی کو بے مقصد اور بے کیف جانتے ہیں۔

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی، غم سے نجات پائے کیوں

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

نفسیات غالب کو سمجھنے کے لئے اس پر آشوب دور کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے جس میں غالب نے زندگی بسر کی۔ غالب کا زمانہ تاریخ کا ہنگامہ خیز دور تھا۔ دلی غالب کے سامنے بری طرح

لٹی۔ پرانا نظام سسک سسک کر دم توڑ گیا۔ دوست احباب دیکھتے دیکھتے دنیا سے اٹھ گئے۔ ان روح فرسا حالات کا غالب کے ذہن پر اثر موجود تھا۔ غالب نے آغاز عمر سے دلی کو امن و آشتی کا گہوارا پایا تھا مگر یہی دلی دیکھتے ہی دیکھتے لاشوں کا شہر بن گئی۔ غالب نے مغل بادشاہوں کا دبدبہ اور افتخار دیکھا تھا، 1857ء کے بعد مغل شاہزادوں کو تختۂ دار پر اور شاہزادیوں کو بھیک مانگتے دیکھا۔ وہ محلات جہاں سے ہندوستان اور ہندوستانیوں کی تقدیر کے فیصلے صادر ہوتے تھے، زندانوں اور کھنڈروں میں تبدیل ہوتے نظر آئے۔ وہ آغاز، یہ انجام۔ اس ہولناک تفاوت نے غالب کے ذہن پر عجیب اثر ڈالا۔ اب غالب تشکیک کے دور سے گزرتے تھے۔ انہیں ہر حقیقت خیال اور ہر خیال حقیقت معلوم ہوتا ہے۔ کسی شے پر اعتبار نہیں رہا۔ وہ دنیا کی ہر شے اور ہر عمل کو شک، حیرت اور تذبذب کے آئینے میں دیکھتے ہیں۔

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا میرے آگے

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے؟

پھر جب اس شیریں دیوانگی اور مقدس سنجیدگی سے ان کا جی گھٹنے لگتا تو وہ نظام کائنات کی ہر شے کو بے حقیقت اور ناپائیدار ثابت کرنے کے لئے ظرافت کا سہارا لیتے ہیں۔ مزاح کے تیشے سے کائنات کی بے ثبات چٹان کو کاٹنے لگتے ہیں۔ تیشے کی ضرب سے پھلجھڑیاں چھوٹتی ہیں اور میدان ظریف کے کلام میں شگفتگی اور رعنائی کی لہر دکھائی دیتی ہے۔

کی میرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا؟

واعظ نہ تم پیو، نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

غالب لذت کے خواہاں تھے۔ جب تک حالات سازگار رہے، غالب لذت آشنا اور رومان پسند طبیعت کی تسکین کے لئے سامان فراہم ہوا کئے۔ پھر حوادث کی آگ نے غالب کی رومانیت کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ مگر غالب کی انا نے اسے بھسم ہونے سے بچا لیا۔ اب غالب نے لذت کے حصول کا نیا طریقہ اپنایا، وہ جفا طلب بن گئے۔ پہلے وہ آرزو کی تکمیل سے لذت حاصل کرتے تھے تو اب انہیں آرزو کی حسرت میں سرور ملتا۔

وا حسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر

عشرتِ قتل گہِ اہل تمنا مت پوچھ
عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر مرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

غالب کے اس نفسیاتی تجزیے کے بعد ان کے کلام کی تفسیم اور تحقیق کا کام نسبتاً آسان معلوم ہوتا ہے۔ اور شعراء میں غالب ہی ایسی شخصیت ہے جسے نفسیاتِ انسانی کا گہرا ادراک تھا۔ غالب کو اپنی ذات اور ماحول کا مکمل شعور تھا۔ غالب پیغمبر، فرشتہ، دیوتا یا صوفی نہ تھا۔ غالب کی خواہشات ان کے جذبات و انعکاسات میں ایک گوشت پوست کے زندہ انسان کی امنگیں جھلکتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر انسان کو بشرطیکہ غالب کو سمجھتا ہو، غالب کے کلام میں اپنی ہی تصویر دکھائی دے گی۔ غالب کی بقائے دوام کا رازیہی ہے کہ ہر فرد بشر کو اپنے دل کی دھڑکن کلامِ غالب کے قالب میں سنائی دیتی ہے...... یہ غالب اور نفسیاتِ انسانی کے گہرے تعلق ہی کا نتیجہ

ہے کہ ہر زمانے میں، حالات کا مزاج بدلنے کے باوجود، تنقیدی شعور کی تبدیلی اور تصعید کے باوصف، کلام غالب کی تاثیر اور دلکشی قائم ہے اور مجھے یقین ہے کہ آفاقی شاعر غالب جس طرح گزشتہ دو صدیوں سے اردو غزل کا تاجدار ہے، اسی طرح اکیسویں صدی میں بھی جینئس شاعر کی عملداری، اقلیم ادب پر پوری قوت، پورے وقار اور افتخار کے ساتھ قائم رہے گی۔

یہاں مجھے شیکسپیئر کے ایک اہم نقاد کے الفاظ یاد آرہے ہیں جو آج غالب کی شخصیت پر بھی پوری طرح صادق آتے ہیں۔ نقاد لکھتا ہے:

His prodigious vatality remains un-impaired after three centuries. It seems to grow everytime, he is read.

اور یقین کیجیے، غالب کو بھی جب پڑھا جائے گا، غالب ایک نئے روپ اور خوب تر انداز میں سخن فہموں کے سامنے آن کھڑا ہوگا اور مسکرا کر ہم سے پوچھے گا

ع...... کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں؟

آرزو کو بلند تر مقام پر فائز کرتے ہوئے مثبت حالت میں غالب اپنی "انا" کے لئے اعتماد کی دولت، طنز و مزاح کی چاشنی اور انشاطیہ کیفیات کی جلوہ گری کی اپنی نفسی توانائی کے لئے ایک حفاظتی والو (Safety Valve) کے طور پر استعمال کرتے رہے۔ اس مثبت روش نے ان کی شاعری میں خلوص و اعتماد، زندگی پر گہری نظر ڈالنے اور تجربات کی نوعیت متعین کرنے، کٹھن حالات میں زندگی بسر کرنے کا شعور، اپنے تجربات کو معروضی نقطۂ نظر سے دیکھنے کی سکت آ گئی۔

(ڈاکٹر وحید قریشی "غالب اور اس کا ماحول" سہ ماہی اردو۔ ص405، غالب نمبر 1969۔ کراچی)

پاکستان میں غالب شناسی کی روایت

تحریر: ڈاکٹر طاہر تونسوی

اردو ادب میں بالعموم اور اردو شاعری میں بالخصوص دو استثنائی مثالیں ایسی ہیں جن کے فکر و فن اور نظریات و خیالات کی تفہیم، تشریح اور توضیح کے لئے اصطلاح وضع کی گئی ہے۔ ایک غالب اور دوسرے اقبال .... اور ان کے لئے غالبیات اور اقبالیات یا غالب شناسی اور اقبال شناسی اب مروجہ شکل اختیار کر چکی ہیں۔ اس لئے غالب شناسی اور اقبال شناسی میں مقدار اور معیار دونوں تناظرات میں بیش بہا تحقیقی و تنقیدی کام ہوا ہے اس حوالے سے اقبال کی حیثیت پھر استثنائی ہے اور اس کی وجہ ہی نہیں وجوہات بھی کچھ اور ہیں۔ تاہم غالب کے بارے میں بھی بہت کچھ احاطہ تحریر میں آ چکا ہے اور اس کے جہان فن کی توضیحات کا سلسلہ لحہ موجود میں بھی جاری و ساری ہے اور یہ غالب کا کمال ہے کہ دو صدیاں گزر جانے کے باوجود اس کے فکر و فن کی جہتیں سامنے آتی جا رہی ہیں اور اس کے زاویہ نگاہ کی پرتیں کھلتی چلی جاتی ہیں اور یوں عظمت غالب ہے کہ روز بروز ابھرتی چلی جاتی ہے اور خوشبوئے غالب ہے کہ پھیلتی چلی جاتی ہے اور اس ہمہ جہت شخص و شاعر کے مطالعے کا دائرہ ہے کہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے۔

جہاں تک مطالعہ غالب کا تعلق ہے تو بقول ڈاکٹر سلیم اختر "غالب شناسی کے دو پہلو قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ داخلی اور خارجی ...... داخلی پہلو غالب کی اپنی تحریروں، خطوط اور بعض اشعار سے تکمیل پاتا ہے ایسی تحریریں جن میں اس نے اپنی ذات اور شخصیت کے بارے میں اظہار خیال کیا۔ ایسے خطوط جن سے اگر ایک طرف تخلیقی شخصیت میں نرگسیت کی اساس اجاگر ہوئی تو دوسری طرف فکر و فن اور زبان و بیان سے وابستہ امور پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ایسے اشعار اور مقدمے بھی ہیں جن میں اس نے بہ انداز تعلی اپنی غزل یا اسلوب کی کسی خصوصیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ غالب شناسی میں یہ ذاتی جہت اور باطنی انداز اس بنا پر تنقیدی اہمیت اختیار کر جاتا ہے کہ غالب شناسی کی خارجی جہت اس کے بغیر گہرائی سے عاری نظر آئے گی۔ کیا غالب کی کسی ایسی سوانح عمری کا تصور کیا جا سکتا ہے جو خطوط غالب اور اشعار سے صرف نظر کر کے قلمبند کی گئی ہو۔ غالب شناسی کے خارجی پہلو نے ان لاتعداد اہل قلم کی تحریروں سے جنم لیا ہے جو ایک صدی سے زائد

عرصے سے غالب کی حیات اور فکر و فن کو موضوع بنائے ہوئے داد نقد دے رہے ہیں۔

غالب 27 دسمبر 1797ء تا 9 فروری 1869ء سے لے کر 13 دسمبر 1997ء یعنی لمحہ موجود تک اہل نقد و نظر کا پسندیدہ موضوع ہے اور اس میں داخلی اور خارجی دونوں پہلوؤں کی عمل کاری کو دخل ہے۔

اردو شعراء کے تذکروں کا مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ غالب کا تذکرہ ان کی زندگی میں ہی شروع ہو گیا تھا۔ اور یوں خوب چند زکا کے معیار الشعراء سے لے کر آب حیات تک سبھی تذکروں میں غالب غالب رہا ہے۔ غالب شناسی کی ابتدا غالب کی زندگی میں ہو گئی تھی۔ غالب کی وفات کے اٹھائیس برس بعد 1897ء میں مولانا حالی کی یادگار غالب سامنے آئی۔ اس سے قبل 1841ء میں غالب کے اردو دیوان کا پہلا ایڈیشن شائع ہو چکا تھا۔ تقسیم ہند سے قبل غالب شناسی کے حوالے سے جو کتابیں منظر عام پر آئیں ان میں محاسن کلام غالب (ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری) یگانہ کی غالب شکن، ایس ایم اکرام کی غالب نامہ، مولانہ غلام رسول مہر کی غالب، ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی سرگزشت غالب اور مالک رام کی ذکر غالب، تفہیم غالب میں نئی حیات کی نشاندہی کرتی ہیں۔ اس اعتبار سے نقد و نظر کے حوالے سے غالب شناسی کو جدید پیرائیہ اظہار اور تازہ اسلوب کاری کا جوہر حاصل ہوا اور غالب کو سمجھنے کے نئے دریچے کھلے۔ اور غالب کا مطالعہ کرنے والوں نے غالب کو بحیثیت شاعر ہر رنگ میں دکھانے کی سعی کی۔ یوں غالب شناسی کی ایک توانا روایت پیدا ہوئی۔ قیام پاکستان کے بعد غالب شناسی میں کئی بیش بہا اضافے ہوئے۔ مولانا غلام رسول مہر کی خطوط غالب اور آفاق حسین آفاق کی نادرات غالب، غالب کے خطوط کی اہم کڑیاں ثابت ہوئیں۔ غالب پر پہلی تنقیدی کتاب خلیفہ عبدالحکیم کی افکار غالب ہے جو 10 دسمبر 1954ء کو شائع ہوئی۔ اسی کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر شوکت سبزواری کی غالب۔ فکر و فن 1961ء، تنقید غالب میں اہم مقام کی حامل ہے۔ ان کے بعد تواتر سے غالب شناسی پر کام ہوا۔ داخلی حوالے سے بھی اور خارجی تناظر میں بھی۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اب تک تینتالیس پبلشروں نے دیوان غالب کے نسخے شائع کئے اور کلام غالب کی 18 شرحیں لکھی گئیں اس طرح غالب کے فکر و فن پر ایک سو سولہ کتابیں منظر عام پر آئیں۔ جن میں غالب کی سوچ و فکر کے نئے دھارے تلاش کئے گئے ان کے اشعار کی معنی آفرینی کے بے شمار پہلو اجاگر ہوئے اور غالب کی زندگی کے ہر ایک پل کو تنقیدی نقطۂ نظر سے جانچا گیا۔ اس کی شخصیت کا نفسیاتی مطالعہ کیا گیا۔ چنانچہ اس کا ایکسرے کرنے کے بعد اسے عکس ریز کیا گیا۔ اس پس منظر میں مسعود حسن رضوی

نے غالب تب اور اب کا سراغ لگایا۔ ڈاکٹر آفتاب احمد نے اسے آشفتہ نوا کہا۔ ڈاکٹر انیس ناگی نے اسے شاعر سے زیادہ اداکار قرار دیتے ہوئے غالب پریشان گردانا۔ جیلانی کامران نے غالب کی تہذیبی شخصیت کو کھنگالا۔ سلیم احمد نے غالب کون کا نعرہ بلند کیا۔ شریف الحسن اور سید قدرت نقوی نے استفسار کیا کہ غالب کون ہے؟ ڈاکٹر سلیم اختر نے اسے شعور اور لاشعور کا شاعر کہہ کر اس کے آتش زیرپا ہونے کا نفسیاتی پہلو ڈھونڈ نکالا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اسے شاعر امروز و فردا بتایا۔ چوہدری نبی احمد باجوہ نے نقش حیات غالب، سید رفیع الدین بلخی نے تجزیہ کلام غالب، سلطان صدیقی نے عرفان غالب، ڈاکٹر سید عبداللہ نے اطراف غالب، شوکت سبزواری نے فلسفہ کلام غالب، عبدالصمد صارم نے مقام غالب، ڈاکٹر شمس الدین صدیقی نے خیابان غالب، ڈاکٹر عبادت بریلوی نے مطالعہ غالب، نثار احمد فاروقی نے تلاش غالب، ڈاکٹر ایوب قادری نے عصر غالب، ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے مطالعہ غالب، ناصر الدین ناصر نے دبستان غالب، ڈاکٹر وحید قریشی نے نذر غالب، ڈاکٹر سید معین الرحمن نے نقوش غالب، سید وقار عظیم نے وقار غالب اور ڈاکٹر نجیب جمال نے ماہ و سال عندلیب کے تناظر میں غالب کے فلسفے، اس کی شاعری، اس کی نفسیاتی الجھنیں اس کے تصوف، اس کی ہمہ گیری، اس کی ہنرمندی، اس کی انا پسندی، اس کی نرگسیت اس کے تصور حسن و عشق اور اس سے متعلقہ موضوعات پر کھل کر اظہار رائے کیا۔

بقول ڈاکٹر محمد علی صدیقی "غالب نے جدید فکر کے لیے پرتپاک فضا مہیا کرنے کے لیے کام کیا تھا۔ جنگ آزادی کے دوران اجڑے دیاروں کے ملبے پر بیٹھ کر اتنی دور کی کوڑی لانا واقعتاً چاند پر پہنچنے کے مترادف ہے"۔ ہمارے غالب شناسوں نے غالب کی اس جدید فکر کا نہ صرف ژرف بینی سے تجزیاتی مطالعہ کیا۔ بلکہ نئے عہد کے اس نقیب کی ہر بات اور ہر ادا کو قرطاس و قلم کے ذریعے محفوظ کر دیا۔ یہاں یہ بات قابل فخر ہے کہ مجلس یادگار غالب پنجاب یونیورسٹی نے 1969ء میں غالب پر سترہ کتابیں شائع کیں۔ پاکستانی یونیورسٹیوں نے غالب پر تحقیقی کام کی حوصلہ افزائی کی چنانچہ سندھ یونیورسٹی نے 1972ء میں "غالبیات کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ" کے موضوع پر سید معین الرحمن کو پی۔ایچ۔ڈی کی پہلی ڈگری عطا کی اس کے بعد 1986ء میں پنجاب یونیورسٹی نے محمد ایوب شاہد کو ان کے مقالے شارحین دیوان غالب (اردو شروح کا تقابلی مطالعہ) پر پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری دی۔ ایم۔اے کی سطح پر بھی غالب شناسی اور غالب شناسوں پر تحقیقی مقالے لکھے گئے۔ تفصیل یہ ہے۔

پنجاب یونیورسٹی میں کتابیات متعلقہ غالب، خطوط غالب (اردو) اردو رسائل کے غالب

نمبر، غالب کی امیجری، کلام غالب میں فکری عناصر، مطالعہ غالب انیسویں صدی میں، ڈاکٹر ایس ایم اکرام بطور غالب شناس، مولانا غلام رسول مہر بطور غالب شناس، غالب کا فارسی کلام، رسالہ نقوش میں ذخیرہ غالبیات، مالک رام بطور غالب شناس آل احمد سرور بطور غالب شناس، ڈاکٹر شوکت سبزواری بطور غالب شناس، مولانا مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی بطور غالب شناس، توضیحی اشاریہ خطوط غالب، اردو کلام غالب کا ابجدی اشاریہ، غالب نامہ تجزیاتی مطالعہ، ڈاکٹر مختار الدین احمد بطور غالب شناس، ڈاکٹر وحید قریشی بطور غالب شناس، ڈاکٹر سید عبداللہ بطور غالب شناس، سید وقار عظیم بطور غالب شناس، کالی داس گپت رضا بطور غالب شناس، ڈاکٹر فرمان فتح پور بطور غالب شناس طلبہ کی تحقیق کا موضوع ہے۔

سندھ یونیورسٹی نے غالب کے اثرات شعرائے مابعد پر، غالب پر بیدل کے اثرات، غالب کا علمی ماحول ان کے خطوط کے آئینہ میں، یادگار غالب کی شخصیات فکر غالب کا ارتقائی جائزہ پر کام کرایا۔

کراچی یونیورسٹی میں اشاریہ غالب "مدح وقدح کی روشنی میں" از صباح الدین عبدالرحمن اور نیاز و نگار اور غالب شناسی پر مقالے لکھوائے۔ بہاءالدین زکریا یونیورسٹی ملتان میں غالب کے سفر، غالب کی سوانح عمریاں، دیوان غالب، موضوعاتی تدوین، غالب کا تنقیدی شعور، خطوط کے آئینے میں۔ جیسے موضوعات پر تحقیقی و تنقیدی کام ہوا۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں محاسن کلام غالب (حواشی و تعلیقات) کے موضوع کی رجسٹریشن کی گئی۔ غالب پر ہونے والے بیشتر مقالات گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبہ اردو میں لکھے گئے۔ اور اس کا کریڈٹ ڈاکٹر سید معین الرحمن کو جاتا ہے۔

علمی و ادبی رسائل نے اپنی اپنی بساط کے مطابق غالب نمبر نکالے جو غالب شناسی میں ادبی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں یہ سارا کام ۱۹۶۹ء میں غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر ہوا۔ ایسے رسائل میں صحیفہ، اردو، ماہ نو، نقوش، قومی زبان، افکار، مہر نیمروز، نگار، ادب لطیف، غالب، ہلال، عکس لطیف، نقش، الشجاع، العلم، سب رس، خیابان، تحقیق نامہ، اردو نامہ، اوراق، فنون، نئی قدریں، الزبیر، ہمدرد ڈائجسٹ، راوی، افشاں، کارواں، منشور کے نام بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ صحیفہ نے ڈاکٹر وحید قریشی کی ادارت میں غالب پر پانچ شمارے شائع کئے جبکہ "اردو" نے جمیل الدین عالی اور مشفق خواجہ کی ادارت میں دو شمارے چھاپے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی ادارت میں نگار کے تین شمارے اشاعت پذیر ہوئے۔ دوسرے دانشوروں کی

تخلیقات پر مبنی غالب نمبر اس کے علاوہ ہیں۔ "نقوش" کے محمد طفیل نے دو غالب نمبر شائع کیے۔ دوسرا نمبر غالب کی بیاض پر مشتمل ہے۔ جو بذات خود ایک حیرت انگیز دریافت ہے۔ نقوش کے غالب نمبر فروری ۱۹۶۹ء میں محمد طفیل نے طلوع کے نام سے جو اداریہ لکھا ہے اس کی آخری سطریں یوں ہیں "قصہ صرف اتنا ہے کہ غالب اتنا بڑا آدمی نہ تھا جتنا بڑا شاعر تھا لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ جب سے اب تک بڑے آدمی بے شمار گزرے مگر ان سب میں غالب ایک تھا .... ایک رہا۔

رسائل کے نمبر کے حوالہ سے اہم بات یہ بھی ہے کہ "ماہ نو" اور "قومی زبان" ہر سال فروری میں غالب کے لئے مخصوص گوشہ شائع کرتے ہیں۔ چنانچہ اس بار بھی قومی زبان کا ۱۸۴ صفحات پر مشتمل غالب نمبر شائع ہوا ہے۔ اسی طرح پروین ملک کی ادارت میں نکلنے والے رسالے ماہ نو نے ۲۶۴ صفحات پر مشتمل ایک غالب نمبر شائع کیا ہے جس میں دیوان غالب بھی شامل ہے۔

۱۹۹۷ء میں غالبیات پر ہونے والے کام کا گراف بہت نیچا ہے۔ اور صرف پانچ کتابیں منظر عام پر آئی ہیں۔ غالب شناسی اور نیاز و نگار مرتبہ ڈاکٹر سلیم اختر، وقار غالب، (سید وقار عظیم کے مضامین کا مجموعہ) مرتبہ ڈاکٹر سید معین الرحمن، غالب کا ذوق تماشا از ڈاکٹر وزیر آغا اور ماہ و سال عندلیب از ڈاکٹر نجیب جمال .... البتہ چھٹی کتاب غالب کی خاندانی پنشن اور دیگر امور .... سرکاری دستاویزات ۱۸۰۵ء تا ۱۸۶۹ء بعد میں چھپ کر سامنے آئی۔ تدوین و حواشی از ڈاکٹر گوہر نوشاہی۔ ظاہر ہے کہ یہ حوصلہ افزا کام نہیں ہے۔ تاہم لمحہ موجود میں اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مولانا غلام رسول مہر سے لے کر ڈاکٹر گوہر نوشاہی تک غالب شناسوں کا ایک گروہ ایسا بھی موجود ہے جو غالب شناسی کی روایت کو زندہ کئے ہوئے ہے اور یہ روایت روز بروز توانا ہو رہی ہے اور اس کا ثبوت سورج لاہور کا ۱۱۰۸ صفحات پر مشتمل ضخیم نمبر بھی ہے جسے تسلیم احمد تصور نے مرتب کیا ہے اور پھر ڈاکٹر سید معین الرحمن کی غالب فہمی اور غالب شناسی بھی ہے جو ایم اے کی سطح پر غالب پر کام کرنے والوں کو نیا عزم و حوصلہ دیتی ہے اور پھر غالب کے عاشق پروفیسر لطیف الزماں خان کی وہ غالب لائبریری بھی ہے جو غالب شناسوں کو کام پر اکساتی ہے۔ اور خود غالب یہ کہتا ہوا مطمئن دکھائی دیتا ہے کہ

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لئے

غالب تخلیقی معنویت کا روشن استعارہ

ڈاکٹر اسلم انصاری

مرزا غالب کو ہماری شعریات ہی میں نہیں، ہماری فکریات میں بھی ایک اہم موڑ، ایک نشانِ منزل کی حیثیت حاصل ہے۔ اپنے منفرد شعری اسلوب کے ذریعے انہوں نے ماضی اور مستقبل کے فاصلوں کو کم سے کم کر دیا۔ اگر ایک طرف وہ عرفی اور نظیری کو ہمارے قریب لے آئے تو دوسری طرف انہوں نے بیسویں صدی کے اس "گلشنِ نا آفریدہ" کی طرف بھی ہماری رہنمائی کی جو ہمارے شعر و ادب کا سب سے زریں باب ثابت ہونے والا تھا۔ وہ انیسویں صدی کے برصغیر میں مسلم تہذیب کی واحد تخلیقی علامت تھے۔ جو اس عہد کے ہولناک خلا کو اپنی درخشاں خلاقی سے پر کرتی دکھائی دیتی ہے، اردو شاعری کے یاس پسندانہ اور عمومی طور پر انفعالی رویوں کی انتہا پر ان کی توانا آواز ایک نئے عہد کی نقیب ثابت ہوئی، ان کی ترکمانیت اور غیر معمولی تخلیقی صلاحیتوں نے شاعری اور تہذیب، دونوں کو زندگی کی حرارت اور جرأتِ عمل کا اشارہ دیا، اگرچہ ان کی شاعری ان کی ذاتی محرومیوں کا نوحہ بھی ہے اور ایک عمیق اور فلسفیانہ تصورِ غم کی آئینہ دار بھی، لیکن ان کی جستجوئے نشاط اور آرزوئے حیات .... ان کے پیمانۂ غم سے بار بار چھلک جاتی ہے، .... اگر جستجوئے نشاط میں وہ زوال آشنا اور انحطاط پذیر مغلیہ تہذیب کے ترجمان ہیں، تو آرزوئے حیات میں وہ برصغیر کے مسلمانوں کی بیدار ہوتی ہوئی تخلیق امنگوں کا علاماتی مظہر بھی ہیں، اسی لئے انہیں بجا طور پر قدیم و جدید کا سنگم قرار دیا جا سکتا ہے، ایک ایسا سنگم جس کا زیادہ حصہ جدید امکانات کی آرزو اور ان کی تلاش اور شناخت کے عمل سے عبارت ہے۔ زندگی میں معانی کی تلاش جسے ایک سطح پر مابعدالطبعیاتی تلاش (Metaphysical Quest) بھی کہا جا سکتا ہے۔ دراصل قدیم فلسفیانہ اور متصوفانہ تصورات میں حیات بخش عناصر کی تلاش ہے جو کہنہ اور فرسودہ عقلی تصورات کی جگہ لے سکے۔ تخلیقی سطح پر ایک نئے جہانِ معنی کی تخلیق حیات و کائنات کی نئی عقلی تشریحات کی ضرورت کو بھی واضح کرتی ہے، مجموعی طور پر ان کا پیغام یہی ہے کہ زندگی کو ایک نئے انداز سے دیکھنا اور محسوس کرنا چاہیے، بلکہ بعض اوقات وہ زندگی میں ایک فوری اور اساسی تبدیلی کی شدت سے خواہش کرتے دکھائی دیتے ہیں، ایک ایسی تبدیلی جو زندگی کو

نئی فکری اور جمالیاتی اساس فراہم کر سکے۔ ان کی اس خواہش کا اظہار ان کی اردو شاعری میں رمز و کنایہ کی زبان میں ہوا ہے، لیکن اس کا بھرپور اظہار ان کی بعض فارسی غزلوں میں نظر آتا ہے۔ .... اردو شاعری میں تبدیلی کی توقع، اور تبدیلی کے وقوع پذیر نہ ہونے کا احساس کئی انداز میں ظاہر ہوا ہے۔ .... مثلاً ایک اردو غزل کے دو شعر اس حقیقت کو یوں بیان کرتے ہیں۔

محفلیں برہم کرے ہے گنجفہ بازِ خیال!
ہیں ورق گردانئ نیرنگِ یک بُتخانہ ہم

باوجودِ یک جہاں ہنگامہ، پیدائی نہیں
ہیں چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہم

پہلے شعر میں شاعر نے خود کو تغیر کے ایک عمل کے مترادف فرض کر لیا ہے۔ .... لیکن وہ تغیر کتاب کی ورق گردانی کا تغیر ہے، اس شعر میں بت خانہ سے مراد مرقعِ تصاویر ہے جو نگارانِ خوش ادا کی تصویروں سے عبارت ہے، .... اگر ایسے کسی مرحلے کو تصور میں لا کر خیال ہی میں اس کی ورق گردانی کریں تو محسوس ہوگا ایک کے بعد ایک محفل برہم ہوتی جا رہی ہے۔ .... (شعر میں فرض کیا گیا ہے کہ ایک تصویر ایک بزم ہے) .... خیال کو اس شعر میں گنجفہ باز قرار دیا گیا ہے۔ .... گنجفہ سے مراد تاش کے پتوں کا کھیل ہے، غالب کے استعارے میں خیال (تخیل) کا گنجفہ باز تاش کے پتوں کو، جن پر تصاویر بھی فرض کی گئی ہیں، مسلسل درہم برہم کرتا رہتا ہے۔ غالب نے اس شعر میں استعارے کی سطح پر دو مساواتیں قائم کی ہیں۔ اپنے آپ کو اپنے تخیلی عمل کے مساوی قرار دیا ہے اور اپنے تخیلی عمل کو ایک مرقعِ تصاویر کی ورق گردانی سے تعبیر کیا ہے۔ .... اہل نظر سے یہ بات مخفی نہیں رہ سکتی کہ گو غالب خود کو ایک عملِ تغیر میں تحلیل کر رہے ہیں۔ تاہم یہ تغیر تکرارِ معنی کا مظہر ہے۔ یہ اوراق مصور کا تغیر ہے جس میں ارتقاء اور حقیقی تبدیلی کا اصول کارفرما نہیں، بلکہ محض ایک خیالی تبدیلی ہے۔ ایک انحطاط پذیر اور جمود کے شکار معاشرے کی اس سے خوبصورت تصویر شاید ہی ممکن ہو۔ مرقع تصاویر کی ورق گردانی، تصاویر کی ماہیت کو تبدیل نہیں کر پاتی۔ خود تصاویر بھی ورق گردانی کے عملِ تحرک کے باوجود بےجان تصاویر ہی رہتی ہیں، .... ایک انحطاط پذیر معاشرے میں بھی تبدیلیاں واقع ہو سکتی ہیں، لیکن یہ تبدیلیاں اندرونی جمود کو نہیں توڑ پاتیں۔ اس لئے کہ ان میں تغیر کا حقیقی اصول کارفرما نہیں ہوتا،

دوسرا شعر بھی اسی حقیقت کو ایک نئے پیرائے میں بیان کرتا ہے۔ باوجودیکہ ہنگامہ "بہ مقدارِ یک جہاں" ہے، لیکن رونما کچھ بھی نہیں ہو رہا۔ کیا یہ لال قلعے کے ان ہنگامہ ہائے نشاط کی تصویر نہیں، جن کے نتیجے میں کوئی تاریخی تبدیلی رونما ہوتی دکھائی نہیں دیتی۔ .... یہاں بھی غالب نے خود ہی کو ایک ایسا ہنگامہ یا اس ہنگامے کا ظرفِ مکانی قرار دیا ہے جس سے حقیقی رونمائی (Emergence) کا ثمرہ حاصل ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔ گویا ہم (غالب) ایک پروانے کے دل کا شبستان ہیں جو (روشنی کی آرزو) سے چراغاں کیا گیا ہے۔ علامتی طور پر اس شعر میں "یک جہاں ہنگامہ" نئی زندگی اور نئی اجتماعیت کی آرزو ہے، اور "پیدائی نہیں" عہد غالب کا تاریخی خلا ہے جسے 1857ء کے سرفروشانِ آزادی نے اپنے خونِ گرانمایہ کی سرخی سے پر کرنے کی کوشش کی .... لیکن یہ سرخی بھی پروانے کے باطن کے شبستان کا چراغاں ہی ثابت ہوئی۔ .... جو روشنی نہیں، بلکہ روشنی کی آرزو سے عبارت ہے۔ بہادر شاہ ظفر کا لال قلعہ بھی اپنے باطن میں چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہے یا شاید وہ بھی نہیں، بلکہ صرف اس کی ایک تمثیل ہے، .... لیکن غالب کو اپنے عہد سے جو معنوی تعلق ہے وہ یہی ہے کہ وہ اپنی ذاتی بے سروسامانی اور اپنے عہد کی تاریخی بے سروسامانی میں ایک گہرا علامتی رشتہ محسوس کرتا ہے۔ لیکن ذاتی سطح پر وہ اپنے عہد کی آرزوئے تغیر کی تجسیم ہے جو وقوع پذیر نہیں ہو رہی۔ .... وہ اپنی تہذیب کا ایک ایسا امکان ہے جس کی پہلی نشانی وہ خود ہے، اس لئے وجودی سطح پر اس کی تہذیب اور اس کی ذات کے درمیان بظاہر کوئی تعلق دکھائی نہیں دیتا۔ اس لئے اس کا یہ قول قرینِ حقیقت ہے کہ:

نہ گلِ نغمہ ہوں، نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

اس شعر میں بھی خواہشِ تغیر اور عملِ تغیر کا ایک انوکھا ملاپ دکھائی دیتا ہے .... ساز وہ ہے جس کے پردے (سُریں) ہوں، اور اس سے نغمے پھوٹتے ہوں (نغمے جو پھول بن کر بکھرتے ہوں)، .... لیکن جب ساز ہی نہ رہے تو اس سے آواز کی صرف ایک ہی صورت پیدا ہو سکتی ہے، شکست کا آواز .... اس خیال کو مرزا نے ایک فارسی شعر میں اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ پیش کر دیا ہے:

نماند سازِ مرا ہیچ نغمہ ہم نفساں
جز آنکہ برشکنندش چو در نوا آرند

(میرے ساز میں اب اس کے سوا کوئی نغمہ باقی نہیں رہا کہ جب اسے بجانے لگیں تو اسے توڑ ڈالیں) .... تبدیلی کے معنی خیز اور بااثر نہ ہونے کے احساس کو غالب نے کئی انداز سے بیان کیا ہے .... مثلاً ایک شعر میں نالۂ دل کو ایک رات کے پس منظر میں بےاثر فرض کیا ہے، اس کی تڑپ اور بےتابی کو دانۂ سپند کی تڑپ کے مشابہ قرار دیا ہے .... لیکن یہ تڑپ اس لئے بےاثر ہے کہ دانۂ سپند "بزمِ وصلِ غیر" میں جل کر تڑپ رہا ہے۔ ذاتی سطح پر "یہ بزمِ وصلِ غیر" وہ لال قلعہ ہے جس میں ملک الشعرائی کا منصب غالب کو نہیں بلکہ ذوق کو حاصل ہے، اس لئے غالب اپنے سوز و گداز اور اپنی تخلیقی تڑپ کا جو تماشا بھی تہذیب دہلی کی علامت یعنی لال قلعے میں دکھائیں وہ اثر خیزی سے محروم ہی رہے گا، اس لئے کہ یہ "دانۂ سپند" کی "بزمِ وصلِ غیر" میں بےسود تڑپ ہو گی، شعر یہ ہے!

نالۂ دل میں شب اندازِ اثر نایاب تھا
تھا سپندِ بزمِ وصلِ غیر، گو بےتاب تھا!

اس غزل کے ایک شعر میں اسباب کائنات کی فراوانی .... اور اپنی کم کوشی پر افسوس کیا ہے، اور اپنے جنون کو "جنونِ نارسا" قرار دیا ہے، .... جنونِ نارسا کی ترکیب بھی دراصل اجتماعی قوتوں کی نارسائی کا استعارہ ہے:

کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے، ورنہ یاں
ذرہ ذرہ روکشِ خورشیدِ عالمتاب تھا!

اس شعر میں کائنات کے حسن کا اقرار کیا گیا ہے .... کائنات کے حسن کا یہی ادراک اور اقرار ہی ہے جو غالب کو زندگی اور حیات پسندی کا شاعر بناتا ہے اور عہد کی تخلیقی ویرانی کی تلافی کرتا ہے، غالب کو لاشعوری طور پر اس بات کا احساس تھا کہ وہ اپنے تخلیقی مضمرات کے حوالے سے جس تمدنی تبدیلی کے آرزومند ہیں، وہ فوری طور پر وقوع پذیر نہیں ہو سکتی، بلکہ فوری طور پر تو اسے ایک "محالِ تاریخی" (Historical Impossibility) ہی قرار دیا جا سکتا ہے، اسی لئے ان کے ہاں امرِ محال اور عملِ محال کی کئی تصویریں اپنی محالاتی (Paradoxical) صورت میں دکھائی دیتی ہیں۔ ایک شعر میں کہتے ہیں۔

شوق اُس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں
جادہ غیر از نگہِ دیدۂ تصویر نہیں!

تارِ نگاہ۔ یوں بھی ایک غیر مرئی چیز ہے، اگر وہ تارِ نگاہ کسی پیکر تصویر کی آنکھ کا تارِ نگاہ ہو تو اس کا وجود صرف خیالی اور تجریدی ہی رہ جاتا ہے، .... غالب کا یہ کہنا کہ میرا شوق (آرزوئے حسن و حیات) مجھے ایک ایسے صحرا میں دوڑا رہا ہے جہاں کوئی راستہ ہی نہیں، راستہ ہے بھی تو ایسا ہی خیالی، تجریدی اور موہوم جیسے کسی تصویر کے پیکر کی آنکھ کا تارِ نظر جو "ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے" .... یہ ایک ایسے عہد اور ایک ایسے معاشرے کی تصویر ہے جس میں کوئی ارتقائی عمل، کوئی پیش روی (Progression) ممکن ہی نہیں، اس لئے کہ اظہار و عمل کا کوئی راستہ دکھائی ہی نہیں دیتا۔ ایسے ہی کسی دشتِ خیال میں دوڑ دوڑ کر جب غالب تھکتے ہیں تو انہیں اپنی تھکن باندازہ یک بیاباں محسوس ہوتی ہے، اس تجربے میں وہ محسوس کرتے ہیں کہ سفر سے بیاباں کی مسافت تو قطع نہیں ہوتی جبکہ تھکن بہ مقدار بیاباں طاری ہو گیا ہے، اس کے باوجود وہ خواہش سفر سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں، جو دراصل زندگی کے تخلیقی عمل کے ساتھ ان کی حقیقی وابستگی (Commitment) ہے۔

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

ایسی ہی صورت حال میں صبح کا شام کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہوتا ہے .... گو تخیل تلافی کی ایسی صورتیں بھی پیدا کرتا ہے جس میں ایک ہی قدم اٹھانے سے دفترِ امکاں کا درس کھل جاتا ہے اور جادہ (راستہ) دشتِ کونین کے اجزاء کا شیرازہ نظر آنے لگتا ہے .... لیکن اس جادے پر بھی سفر صرف علامتی طور پر ہی ہو سکتا ہے۔

یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا
جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا!

اپنی ایک فارسی غزل میں غالب نے اپنے تصور عیش کی تشکیل کی ہے، جو اپنی تفصیلات میں فی الحقیقت ایک فردوسِ خیال ہے تاہم اس کا مطلع علامتی معنویت کا حامل ہے، گو پوری غزل آرزوئے نشاط کے حوالے سے اپنے عہد کی ترجمان بھی ہے، بہر حال، مطلع ہے:

بیا کہ قاعدۂ آسمان بگردانیم
قضا بہ گردشِ رطلِ گراں بگردانیم

پہلا مصرع ایک انقلابی تغیر کی خواہش کا اعلان کرتا ہے، غزل کے مطالب بتاتے ہیں کہ

مخاطب محبوب ہے، تاہم یہ دعوت کہ "آؤ، کہ آسمان کی بنیادیں (زمانے کے اصولِ گردش) تبدیل کر ڈالیں، ایک عمومی دعوت ہے جس کا مخاطب مرزا غالب کے عہد کا پورا معاشرہ بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن دوسرے مصرع نے اس بلند آہنگی کے طلسم کو یک لخت توڑ دیا ہے، مصرعِ اُولیٰ کی دعوت کی تشریح یوں کی گئی ہے کہ قضا کو شراب کے بھاری پیالے کی گردش سے تبدیل کر دیں، گویا یہاں بھی عہد کا جبر موجود ہے کہ تبدیلی کا نقشہ صرف اپنے اندر ہی جمایا جا سکتا ہے، ظاہر ہے کہ شراب کے پیالے کی گردش سے صرف اتنی ہی تبدیلی پیدا کی جا سکتی ہے کہ تقدیر کے بدل جانے کا ایک اندرونی احساس پیدا کر لیا جائے، اگر چشمہ شیریں (منابعِ حیات) باہر نہیں ہے تو اس کو گدازِ دل سے اپنے اندر ہی پیدا کر لیا جائے، ایک فارسی شعر صریحاً اسی رویے کا ترجمان ہے:

خدایا، زندگی تلخست، گر خود نقل و مے نبود،
دلے دہ کز گدازِ خویش٠ گردد چشمۂ نوشم

جب معاشرے کا داخلی جمود ظواہر (Appearances) کی کہنگی اور فرسودگی کی صورت اختیار کر لے تو اسی کو انحطاط (Decadence) کہتے ہیں۔ وہ عناصر جو انحطاط کی نمائندگی کا فریضہ سر انجام دے رہے ہوتے ہیں، وضعوں اور صورتوں (Forms) کو برقرار رکھنے کی سعی میں مصروف ہوتے ہیں، "وضعداری" کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ انحطاط پذیر معاشرہ اپنے آپ کو برقرار رکھنے کی ایک سعی یوں بھی کرتا ہے کہ موجود صورتوں، وضعوں اور رسموں کو ٹھہرا لینا چاہتا ہے۔ اس لئے کہ وضعیں اور ظاہری آداب (Forms and Manners) ہیں اس کی آخری متاع ہوتے ہیں۔ غالب اپنی ذاتی زندگی میں کتنے ہی وضعدار کیوں نہ رہے ہوں آخر وجودی طور پر وہ اپنے معاشرے ہی کا ایک حصہ تھے۔ اپنی شاعری میں وہ تغیر پسند انسان ہیں، .... اور "کہنگیٔ تماشا" کو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتے .... اُن کی ایک فارسی غزل اس خواہش تغیر کی ایک خوبصورت روئیداد بیان کرتی ہے۔ اس غزل کے چند اشعار انقلابی تبدیلیوں کی خواہش کا رنگین مرقع پیش کرتے ہیں:

رفتم کہ کہنگی ز تماشا بر افگنم
در بزم رنگ و بو نمطے دیگر افگنم
در وجدِ اہلِ صومعہ ذوقِ نظارہ نیست

ناہید را بہ زمزمہ از منظر افگنم
معشوق را زنالہ بدانسان کنم حزیں
کز لاغری ز ساعد او زیور افگنم
ہنگامہ را جحیم جنون بر جگر زنم
اندیشہ را ہوائے فسوں در سر افگنم
نخلم کہ ہم بجای رطب طوطی آورم
ابرم کہ ہم بروی زمیں گوہر افگنم

"میں اس خیال سے چلا کہ رنگ تماشہ سے اس کا پرانا پن اتار پھینکوں، اور رنگ و بو کی محفل میں ایک گلدستۂ نئی روش کا آغاز کروں .... اہل خانقاہ کا وجد ذوق نظارہ کی تسکین نہیں کرتا .... میں چاہتا ہوں کہ ایسا نغمہ گاؤں کہ خود زہرہ کو اس کی بلندی سے اتار پھینکوں .... معشوق کو اپنے نالوں سے ایسا غمگین کردوں کہ غم اس کو ناتواں کردے، اور ناتوانائی کے باعث اس کی کلائی کا زیور گر پڑے۔ (جی چاہتا ہے کہ) ہنگامے کے جگر پر وحشت کا ایک دوزخ دے ماروں اور فکر و خیال کے سر میں جادوگری کی ہوس بھر دوں .... (دراصل) میں وہ نخل ہوں جو بجائے پھل دینے کے طوطی (آواز، نغمہ) اگاتا ہے، اور میں وہ بادل ہوں جو زمین پر موتیوں کی بارش کردیتا ہے .... !"

انقلابی تبدیلیوں کی اس خواہش کی تہہ میں ان کے ناممکن الحصول ہونے کا خفیف سا شائبہ ضرور موجود ہے۔ اب جبکہ غالب کے کلام کی زمانی ترتیب بہت حد تک متعین ہو چکی ہے، ہمارے لئے ان کے ذہنی، فنی اور فکری ارتقا کا مطالعہ کچھ ایسا مشکل نہیں رہا۔ ان کا وہ دور شاعری جس کے ثمرات نسخۂ حمیدیہ میں نظر آتے ہیں، ایک ایسی تخلیقی فعلیت کا زمانہ ہے جس میں وہ تخلیقی سطح پر تاریخی جبریت کے خلاف نبرد آزما دکھائی دیتے ہیں۔ اس زمانے میں سکوت و جمود کو جس طرح حرکت اور تغیر کا اعتبار بخشا گیا ہے، اس کی کچھ مثالیں سطور بالا میں پیش کی گئی ہیں۔ تاہم اس دور کا ایک شعر ایسا ہے جو ان کی روشِ فکر کی علامت ہے:

کون آیا جو چمن بیتاب استقبال ہے
جنبشِ موجِ صبا ہے شوخئ رفتارِ باغ

اس شعر کے تجزیے سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ (کسی کے استقبال کے لئے) پورے باغ کو متحرک اور خراماں دیکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ بادِ صبا کی وزش سے متحرک شاخوں اور برگ و بار کے ذریعے باغ کے بیتاب استقبال ہونے کا محض ایک "اعتبار" یا باالفاظِ دیگر فریبِ نظر (Illusion) پیدا کرلیں۔

اس دور شاعری میں رفتار سے وابستہ ایسے اشعار اچھی خاصی تعداد میں ہیں، جس سے "رفتار" کے بے حد انوکھے تصورات کے ساتھ ساتھ حقیقی رفتار کے ناممکن یا لاحاصل ہونے کا خیال بھی بر آمد ہوتا ہے۔ کہیں وہ رمیدن (بھاگنا) کو "واماندگی" کے باغ کا پھول قرار دیتے ہیں (یعنی بھاگنا ناممکن ہے) کہیں تارِ نفس کو جادہ (راستہ) سے تشبیہ دیتے ہیں۔ کہیں ترکِ جستجو کو ضعف کا نتیجہ قرار دیتے ہیں اور "ہجومِ تمنا" سے لاچار نظر آتے ہیں۔......... چند شعر ملاحظہ ہوں:

رمیدن، گلِ باغِ واماندگی ہے
عبث محملِ آرائے رفتار ہیں ہم

اسد، شکوہ کفر و دعا ناسپاسی
ہجومِ تمنا سے لاچار ہیں ہم

جس دم کہ جادہ وار ہو تارِ نفس تمام
پیمائشِ زمینِ رہِ عمر بس تمام

خوش اوفتادگی! کہ بہ صحرائے انتظار
جوں جادہ گردِ رہ سے نگہ سُرمہ سا کروں

ضعف سے ہے، نے قناعت سے یہ ترکِ جستجو
ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمتِ مردانہ ہم!

راہ عمل کی تلاش کا جذبہ بعض اوقات کچھ انوکھی صورتیں بھی اختیار کرتا دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً انہیں "صفحۂ دشت" (دشت کو ایک صفحہ قرار دینا بھی قابلِ توجہ ہے) اپنی یا اپنے جیسے کسی اور رہرو کی رفتار کی حدت سے "جلاہوا کاغذ" (کاغذِ آتش زدہ) دکھائی دیتا ہے۔ یا مثلاً کہیں وہ خود کو نصیحت

کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ راہِ شوق اگر کسی اور طرف وا نہیں ہوتی تو اسے قمری کے بال و پر کی خلوت کی طرف وا کر، اس انوکھی روش کو اختیار کرنے کا سبب وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ باغ کا راستہ (جادۂ گلشن) درختوں کے ریشوں کی طرح زمین کے نیچے کی طرف جا رہا ہے۔

یک قلم کاغذِ آتش زدہ ہے صفحۂ دشت
نقشِ پا میں ہے تپِ گرمیٔ رفتار ہنوز

خلوتِ بال و پرِ قمری میں وا کر راہِ شوق
جادۂ گلشن برنگِ ریشہ زیرِ خاک ہے

لیکن اہم ترین بات یہ ہے کہ اس دور کی شاعری میں رفتار، پرواز، موج، دریا اور شوق، شعلہ، چراغ اور پرواز جیسے استعاروں میں جہاں راہِ عمل کے مسدود ہونے یا تنگ ہونے کا احساس فراوانی سے ملتا ہے، وہاں ان استعاروں اور ان سے ابھرنے والا تلازمات کی بدولت نادر اور نازک ادراکات (Perceptions) کا ایک رنگین، خیال افروز اور شعور آفریں ذخیرہ بھی فراہم ہو گیا ہے۔ جس کی مثال ہماری شعری روایات میں شاید ہی یکجا مل سکے۔ مزید یہ کہ انہیں ادراکات کی توسیع رفتہ رفتہ فکر کے ایک ارتقائی سلسلے کی صورت بھی اختیار کر لیتی ہے۔ جس میں بعض حیات بخش خیالات ایک مرتب صورت میں بھی مل جاتے ہیں۔ ان حیات بخش خیالات میں ان کے نظریۂ "نعم البدل" کے علاوہ ان کی دانش افروز تشکیک بھی شامل ہے جسے ان کے "فلسفۂ حقیقت اشیا" کا نام دیا جا سکتا ہے۔ غرض غالب کا تخلیقی سفر روشن اور منور نقوشِ پا کا ایک ایسا سلسلہ ہے جس سے حیاتِ انسانی کی ایک بے حد بامعنی کہانی مرتب کی جا سکتی ہے۔ انیسویں اور بیسویں صدی کے ادبی تناظرات میں غالب کی شخصیت اور شاعری تخلیقی معنویت کے ایک روشن استعارے کی طرح چمکتی دمکتی دکھائی دیتی ہے۔ گزشتہ ایک صدی میں ان کی انوکھی شخصیت، ان کے فکر و خیال اور اسالیب بیان نے جس طرح اردو شعر و ادب کو متاثر کیا ہے اور تخلیقی ذہنوں کو تخلیقیت کے پیرائے عطا کیے ہیں، اس کے اعتبار سے اگر انہیں اردو شاعری میں تخلیقی معنویت کا روشن ترین استعارہ قرار دیا جائے تو غلط نہ ہو گا۔

غالب اور قولِ محال

جابر علی سید

قول محال Paradox کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ مولوی عبدالحق صاحب نے کیا ہے اور سرور صاحب نے اس کے لئے ایک واضح تر مترادف تلاش کیا ہے "اتحاد ضدین"۔
انگریزی میں پیراڈکس کا مفہوم آکسفورڈ ڈکشنری کے الفاظ میں یہ ہے۔ "ایسا بیان جو مسلمہ تصور کے برعکس ہو" اور اس ایک مثال یہ دی ہے More Haste, Less Speed یہ مثال قول محال کے جدید استعمال کی ہے جس کو انیسویں صدی کے آخر میں انگلستان میں فروغ حاصل ہوا۔ اور جس کے بہترین نمائندے آسکر وائلڈ برنارڈشا اور جی کے چسٹر ٹن ہیں۔
قول محال کے لغوی معنی محض تضاد کے ہیں اور یہ اس اعتبار سے ہیگل کے Anti Thesis کا ہم مفہوم ہے لیکن اپنے صنعت کارانہ مظاہر میں اس کی قدر و قیمت اور حسن و دلکشی کا اظہار ہمیشہ اسی صورت میں ہوا ہے۔ جس کی ایک مثال ہم غالب کی شاعری میں دیکھنا چاہتے ہیں۔
قول محال کی شعری مثالیں نہ عربی فارسی اردو کے بلاغتی نظاموں میں ملتی ہیں (1) نہ انگریزی کی روایتی ویٹارکس کی تصانیف میں۔ یوں ہر زبان میں صرف نثری شعبے میں اس کا سراغ ضرور لگایا جاسکتا ہے۔ لیکن شاعرانہ صنعت کی حیثیت سے اس کا وجود اردو شاعری میں غالب سے پہلے تقریباً ناپید (2) ہے اور انگریزی شاعری میں بھی نظر نہیں آتا۔ یہ انگریزی نثر کا چمکتا ہوا موتی ہے، جو آسکر وائلڈ، شا اور چسٹر ٹن کے اسلوب نگارش کو آبدار بناتا نظر آتا ہے۔ اردو زبان کے روزمرہ میں قولِ محال خال خال ملتا ہے اور اس کی کمیابی کی وجہ اس "صنعت" کا انتہائی بلیغ ہونا ہے۔ اچھے سے اچھا ادبی خالق بھی اس سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ قول محال کی دو مثالیں "کفر از کعبہ" اور "چراغ تلے اندھیرا" ہیں۔ قول محال ایک نئی منطق کی تخلیق ہے، اضداد میں اتحاد پیدا کرنا آسان کام نہیں۔ اس کے لئے زبردست بصیرت اور طنز کا اعلیٰ جوہر درکار ہے۔ لیکن قول محال خالی خولی لفظی بازی گری اور صناعی ہی نہیں بڑے لکھنے والوں نے اسے عظیم انقلابی تصورات کے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے اس کی بہترین مثالیں شا اور چسٹر ٹن ہیں۔ شا اور چسٹر ٹن علی الترتیب اشتمالیت اور قدامت پرستی کے نمائندے ہیں۔

کلیم الدین احمد نے قول محال کو رعایت لفظی کی نئی صورت کہا ہے یہ تصور قابل قبول نہیں۔ رعایت لفظی ابہام کی پست تر صورت ہے جو امانت، دیا شنکر نسیم اور دوسرے ضلع گو شعرا کا رجحان ہے۔ قول محال میں رعایت لفظی کا گزر نہیں۔ نہ اس میں الفاظ ذو معنویت کے حامل ہوتے ہیں۔

کلیم الدین صاحب نے سرور صاحب کے یہاں قول محال کی نشاندہی کرتے ہوئے اسے انگریزی کا اثر قرار دیا ہے اور ایک لحاظ سے اس اسلوب نگارش کو تنقیدی قطعیت کے لئے مضر سمجھا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ قول محال سرور صاحب کے یہاں تضاد بیانی کا مظہر ہے جو ان کی تنقید میں وضاحت اور نظریہ پیدا ہونے نہیں دیتا۔ سرور صاحب نے غزل پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

"غزل گو وہ مسیح ہے جس کے پاس صلیب نہیں وہ مجاہد ہے جس کے پاس جہاد کا کوئی مقصد نہیں، جو لڑنا جانتا ہے یہ نہیں جانتا کہ کیوں لڑ رہا ہے جس میں تفلسف ہوتا ہے فلسفہ نہیں، پرواز ہوتی ہے رسائی نہیں "(3)۔ کلیم الدین صاحب کے ان جملوں میں تضاد بیانی دیکھنا سراسر غلط ہے۔ ان جملوں میں قول محال غزل کی ناتمامی کی طرف اشارہ کر رہا ہے اور بس۔

یہ غزل کی کوتاہیوں کا بیان ہے تنقیدی تضاد نہیں۔ البتہ ان کے استعمال سے سرور صاحب کے نثری اسلوب میں ایک خاص دلکشی اور چمک دمک ضرور پیدا ہو گئی ہے۔ یہ سرور صاحب کی مخصوص توازن پسندی کا مظہر بھی ہیں۔ سرور صاحب غزل کی خوبیوں اور خامیوں میں توازن قائم کرنا چاہتے ہیں۔

وہ نہ غزل پرست ہیں جیسے مثلاً مسعود حسن رضوی ہیں نہ غزل کے دشمن ہیں جیسے مثلاً عظمت اللہ خاں اور جوش ملیح آبادی ہیں۔ لیکن توازن کے تصور کو انہوں نے دلفریب قولِ محال کی حراست میں پیش کیا ہے جو ان کی تنقید کو نثر نگاری کا اعلیٰ نمونہ بناتا ہے۔

دو منفیوں کو مثبت میں بدلنا قول محال کا جوہر ہے۔ ہمارے کلاسیکی نقادوں کی نظر میں اسے مضمون آفرینی سے تعبیر کیا جائے گا۔ اور اس سے بڑھ کر ان کے تصور میں آ بھی نہیں سکتا تھا۔ غالب کے قول محال میں جو ذہنی حسن ہے اس کی طرف ڈاکٹر بجنوری، شیخ محمد اکرام، احتشام حسین، مجنوں گورکھپوری، کلیم الدین احمد اور آل احمد سرور کا ذہن بھی منتقل نہیں ہوا۔ حالانکہ چسٹرٹن کی وفات تک انگریزی میں قول محال کی ایک اچھی خاصی مضبوط روایت متشکل ہو چکی تھی۔ اور قول محال تضاد Anti Thesis کی سرحد کو پار کر کے منطقی وحدت کی صورت اختیار کر چکا

تھا۔ غالب کے قول محال کو اس اعتبار سے تاریخی تقدم بھی حاصل ہے۔ دوسرے یہ کہ مومن کی وہ مضمون آفرینی جس کی بنا پر نیاز فتح پوری انہیں غالب پر برتری دیتے ہیں۔ غالب کی خلاقی کے سامنے معاملہ بندی کی پیچیدگی سے آگے نہیں بڑھتی۔

غالب کے قول محال کے پس منظر میں ثنویت کی اس قدیم روایت کو بھی دیکھا جا سکتا ہے جو فارسی زبان کے توسط سے غالب تک پہنچی تھی۔ یزدان و اہرمن کی کشمکش اور تضاد یقیناً غالب کے لئے ایک غیر معمولی کشش کا حامل ہوگا، جو اضداد کے اتحاد کی صورت میں ایک ذہین پیش قدمی کا باعث ہوا ہوگا۔ اس سلسلے میں سعدی کے مقتبس بالا شعر کو غالب کے قول محال کا پیش رو نمائندہ قرار دینا بہت زیادہ قرین قیاس نہیں۔ قولِ محال غالب کے لئے مختلف ذرائع کی حیثیت رکھتا ہے جن سے کام لے کر شاعر ایک سے زیادہ ذہنی رویوں کا اظہار کر سکتا ہے مثلاً ان اشعار میں شاعر کا رویہ اخلاقی ہے۔

درد منت کش دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

ہے نو آموزِ فنا ہمت دشوار پسند
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آسان نکلا

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

نظر میں ہے ہماری جادہ راہِ فنا غالب
کہ یہ شیرازہ ہے ہستی کے اجزائے پریشاں کا

اور ان اشعار میں فلسفیانہ یا مابعد الطبعی یا عینی۔

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

ہیولا برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

لیکن ان اشعار میں جذباتی اور وارداتی ہے۔

سراپا رہنِ عشق و ناگزیر اُلفتِ ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

دل سے ہوائے کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں
حاصل سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا

اور ان اشعار میں محض صنعت کاری ہے یا مضمون آفرینی:

کم نہیں نازشِ ہمنائی چشمِ خوباں
تیرا بیمار برا کیا ہے گر اچھا نہ ہوا

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

ہم کو ستم عزیز ستمِ گر کو ہم عزیز
نامہرباں نہیں ہے، اگر مہرباں نہیں

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار نہیں

غالب کے بعد اقبال، یگانہ اور فراق میں قولِ محال کی جھلکیاں نمایاں ہیں اقبال کے نظریہ خودی میں یہ تصور کہ ہستی اپنا مدمقابل خود پیدا کرتی ہے اور ارتقا کے راستے پر گامزن ہوتی ہے۔ افلاطون کے نظریہ اعیان کی طرح اضداد کا تشکیلی مجموعہ ہے جو قول محال کے برخلاف کائنات کی دو متصادم قوتوں سے عبارت ہے۔ افلاطون کے خیال میں جواہر اعراض سے علیحدہ حیثیت بھی رکھتے ہیں اور ان کے محتاج بھی ہیں۔ یہ اضداد کا اجتماع فلسفیانہ نوعیت رکھتا ہے قول محال کی نوعیت فلسفیانہ نہیں منطقی، لسانی اور بلاغتی ہے۔ یوں قولِ محال کی نوعیتیں ایک سے زیادہ ہو

سکتی ہیں، یگانہ کے ضغطے کو بھی قولِ محال کی ہی ایک صورت قرار دیا جا سکتا ہے جو اگرچہ منطقی نہیں لیکن فلسفیانہ ضرور ہے۔

امید و بیم نے مارا مجھے دوراہے پر
کہاں کے دیر و حرم گھر کا راستہ نہ ملا

بلند ہو تو کھلے تجھ پہ راز پستی کا
اسی زمین میں دریا سمائے ہیں کیا کیا

اقبال نے کارل مارکس کے بارے میں جو شعر کہا ہے چسٹرٹنی قولِ محال کے مماثل ہے اور اسی سے آل احمد سرور صاحب نے غزل کی انفعالی نوعیت کو ظاہر کیا ہے۔

وہ کلیم بے تجلی وہ مسیحِ بے صلیب
نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب

فراق گورکھ پوری کے یہاں قولِ محال ایک چمکتی ہوئی دلکشی رکھتا ہے یہ کہیں ضغط ہے اور کہیں اتحادِ ضدین۔

دنیا کی طلب بھی کرو دنیا سے جدا رہ کر
رہتے ہوئے دنیا میں بچتے ہوئے دنیا سے

دیکھ رفتارِ انقلاب فراق
کتنی آہستہ اور کتنی تیز

ہزار بار زمانہ ادھر سے گزرا ہے
نئی نئی ہے مگر پھر بھی رہگزر تیری

مدتیں گزریں تیری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

دبدھا پیدا کر دے دلوں میں ایمانوں کو دے ٹکرانے
بات وہ کہہ اے عشق کہ سن کر سب قائل ہوں کوئی نہ مانے

فراق کے قولِ محال کی قدر و قیمت غالب سے کم نہیں۔ مثلاً انقلاب کے اتحاد ضدین کا تصور اردو میں یکتا سماجی بصیرت کا نمونہ ہے۔

فراق سے متاثر ہونے والے شاعروں میں ناصر کاظمی کے ہاں قولِ محال کی دلکشی نظر آتی ہے۔ ناصر کاظمی کا قولِ محال یگانہ کے تذبذب اور ضغطے سے ملتا جلتا ہے لیکن اس میں "مسلمہ عقائد" کا توڑ ضرور موجود ہے۔ ناصر نے اردو غزل میں محبت کی وحشت اور ترکِ محبت کے باوجود محبوب کی ضرورت کا تصور پیش کیا ہے۔

ہوتی ہے تیرے نام سے وحشت کبھی کبھی
رُسوا ہوئی ہے یوں محبت کبھی کبھی
اے دوست ہم نے ترکِ محبت کے باوجود
محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی

ناصر کے علاوہ ساحر لدھیانوی اور فیض احمد فیض کے ہاں بھی بدلتی ہوئی قدروں کا احساس ملتا ہے۔

چند کلیاں نشاط کی چن کر
مدتوں محوِ یاس رہتا ہوں
تیرا ملنا خوشی کی بات سہی
تجھ سے مل کر اداس رہتا ہوں

محبت کی یہ Pichotomy فیض احمد فیض کے انقلابی رومانوی تصور کا حصہ ہے۔

لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجئے
اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجئے
ان دہکتے ہوئے شہروں کی فراواں مخلوق
کیوں فقط مرنے کی حسرت میں جیا کرتی ہے
یہ حسین کھیت پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا
کس لئے ان میں فقط بھوک اگا کرتی ہے۔

حسین کھیتوں میں بھوک کا اگنا ایک خوبصورت شاعرانہ تصور ہے جس کی بنیاد ایک مسلمہ تصور کی عکسی صورت پر رکھی گئی ہے۔ جدید تر غزل میں قولِ محال کا سراغ نہیں ملتا۔ ہاں کبھی کبھی بعض نوجوان غزل گو شعرا میں ضفطے کی صورت حال ضرور دیکھنے آجاتی ہے۔ احمد مشتاق کا یہ شعر اس کی ایک دلکش مثال پیش کرتا ہے۔

یہ میرے سامنے پانی رواں ہے
اسے دیکھوں کہ اس میں ڈوب جاؤں

یوں غالب کے کمالِ شاعری اور عمیق ذہانت کا ایک اہم اور دلفریب مظہر جو بیک وقت زبان کا حسن بھی ہے اور فلسفیانہ اور شاعرانہ مقاصد کے حصول کا دلکش ذریعہ بھی، ناصر کاظمی پر اختتام پذیر ہوجاتا ہے حقیقت کے مورّخ دریا کا یہ سفینہ جو ادراک کائنات کا وسیلہ ہے۔ کس آنے والے شاعر کے ہاتھوں رواں ہوگا؟ اس کا فیصلہ مستقبل ہی کر سکتا ہے۔

حوالے:

1۔ سعدی کا یہ قولِ محال کی مثال ہے۔

سرو سیمینا بصحرامی روی
نیک بدعہدی کہ بے مامی روی

2۔ ایک مثال درد کا یہ شعر ہے:

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

3۔ کلیم الدین احمد، اردو تنقید پر ایک نظر

> "برگسان کے الفاظ میں الہام تجربے کے اس مقام پر انگلی رکھ دیتا ہے جو تجربے کی روح کا مرکز ہے۔ غالب بھی تجربے کی روح کے مرکز پر انگلی رکھ کر اپنی شاعری کو الہامی بنالیتے ہیں۔"
>
> (ڈاکٹر جمیل جالبی۔ "رازداں اپنا")

غالب کی فکری و شعری جہتیں

سخن شناسوں کی نظر میں

لطیف الزماں خاں

کہا گیا کہ غالب فارسی میں سوچتے تھے لیکن یہ صرف اندازہ ہی ہے۔ آج کے دور میں فیض مرحوم کے بارے میں یہ خیال ہے کہ وہ انگریزی میں سوچتے تھے۔ شاید ایسا ہی ہو۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ فکر کس زبان میں کس لب و لہجہ میں ظاہر ہوئی۔ گیارہ ہزار سے زائد اشعار غالب نے فارسی میں کہے لیکن شہرت اردو کلام کو نصیب ہوئی۔ دو ڈھائی ہزار اشعار تو ایسے ہیں جو روزمرّہ کی گفتگو میں بے تکلف بولے اور سمجھے جاتے ہیں۔

حالی، شیفتہ اور مجروح کی رائے اس لئے اہم ہے کہ یہ تینوں غالب کے بہت قریب تھے۔ حالی نے غالب کی شاعری میں پہلی بار معنوی تہہ داری کو تلاش کیا۔ حالی نے ہمیں بتایا کہ غالب کے ایک شعر کی ادائیگی مختلف معنی بتاتی ہے۔ وہ اللہ اور اس کے بندوں پر طنزیہ مسکراہٹ سے معمولی سی بات کو بے حد اچھوتے طریقے سے پیش کرتے ہیں۔ شیفتہ نے غالب کے اشعار میں نزاکت معنی کا پتہ لگایا۔ مجروح نے بتایا کہ شعر غالب کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنا چاہیے۔

اقبال نے "فکر کامل" اور "لطف گویائی" میں تخیل رسا ڈھونڈ نکالا۔ اقبال کے بعد اہم ترین نام عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کا ہے انہوں نے غالب کی شاعری میں تین چیزوں پر زور دیا "تشکیک کامل" مصوری اور موسیقی۔ ڈاکٹر عبداللطیف نے لفظی صنعت گری کو اہمیت دی اور یہ بھی کہا کہ گہری فکر کے عناصر اردو شاعری میں پہلی بار غالب کی شاعری میں آئے۔ ڈاکٹر سید محمود نے قومی آزادی کا "فکری نقیب" قرار دیا غالب کو۔

حسرت موہانی نے زندہ دلی، جدّت، آزادانہ فکر پر زور دیا۔ نیاز فتحپوری مرحوم نے غالب کی شاعری میں "تفاعل و مسرت" کا فلسفہ تلاش کیا انہوں نے مومن کو بہت بڑھایا، لیکن غالب کے بارے میں یہ کہے بغیر نہ رہ سکے کہ "معنی آفرینی اور نُدرت تعبیر" جیسی غالب کے ہاں ہے ویسی کہیں اور نہیں۔ امداد امام اثر نے غالب کی شاعری سے اس کے "ذہن" کو پڑھا یعنی نفسیاتی مطالعہ کی راہیں کھولیں۔ شخصیت کی دریافت شیخ اکرام نے کی۔ یہ بھی بتایا کہ کتابِ فطرت کا مطالعہ جیسا

غالب کا تھا وہ کسی اور کو نصیب نہ ہوا۔ وہ سوال کرتے ہیں کہ غالب کو دنیا کی ہر اچھی چیز سے لگاؤ کیوں تھا اس لئے کہ زندگی میں حُسن کو غالب نے باطنی آنکھ سے دیکھا اور بے وقوفوں کی طرح دنیا کی مذمت نہیں کی۔ یہ کام اکثر قنوطی صوفیوں نے کیا ہے۔

عرشی صاحب نے تدوین پر نہایت اعلیٰ درجہ کا کام کیا۔ مرحوم مالک رام صاحب نے بھی یہی کام کیا لیکن میرے خیال میں شاعری کی تدوین میں عرشی صاحب سے آگے کوئی نہیں جاسکا۔ غالب کے خطوط کی تدوین نے ڈاکٹر خلیق انجم کو ہمیشہ کے لئے زندہ کر دیا۔

قاضی عبدالودود صاحب نے غالب کو "باکمال" اور "شگفتہ مزاج" قرار دیا ہے۔ اثر لکھنوی یہ ثابت کرتے ہیں کہ غالب نے غزل کی روایت سے انحراف کیا۔ شوکت سبزواری کا خیال ہے کہ فلسفۂ حیات و ممات کو غالب نے شاعری میں سمویا اور غم و نشاط اور عشق و عقل جیسے جذبات کو کنکریٹ شکل دے دی۔

احتشام حسین صاحب غالب کی شاعری کا سماجی پس منظر پیش کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ فرسودگی کو شاعری سے غالب نے ہمیشہ کے لئے مٹا دیا۔ آلِ احمد سرور نے "صحت مند تشکیک" پر زور دیا لیکن یہ خیال سرور کا اپنا نہیں ہے۔ فیض صاحب بتاتے ہیں کہ غالب نے ذاتی غم کے پردے میں اجتماعی ذہنی کیفیت کو بیان کیا۔ مجنوں گورکھپوری نے رمز و کنایہ، طنز، خودداری اور خودشناسی کو غالب کا جوہر قرار دیا۔ فراق صاحب کے نزدیک غالب کا تغزل اور تصوّف کا تعلق عقل سے ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب بتاتے ہیں کہ غالب کے ہاں "گہرا تفکر رواں دواں ہے۔" اور وہ دورِ حاضر کا شاعر ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم نے بتایا کہ غالب کی فارسی شاعری بہت آسان اور پیچیدگی سے پاک ہے۔ میکش اکبر آبادی نے غالب کو صوفی قرار دیا۔ ممتاز حسین کا خیال ہے کہ ذاتی تجربات کو زبان دینا غالب کا کارنامہ ہے۔ سردار جعفری نے انسانی ہمدردی اور غالب کی حُسن پسندی کو سراہا۔ خورشید الاسلام دو باتیں بتاتے ہیں ایک یہ کہ "مادیت اور حقیقت پسندی" ہے اور یہ قومی رجحان تھا دوسرے تصوف بھی موجود ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب نے آہنگِ غالب کو اہم قرار دیا۔ اُن کا کہنا ہے کہ منطق سے نہیں وجدان سے غالب کی شاعری کا خمیر اٹھا ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں غالب کے صوتی آہنگ پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ ڈاکٹر مغنی تبسم نے لسانیات کے اصولوں کو پیش نظر رکھ کر اوزان کے آہنگ کو غالب کے ہاں تلاش کیا۔ اسلوب احمد انصاری صاحب کے خیال میں مرکزی

حیثیت "نگاہ" کو حاصل ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن نے انہیں "نئی داخلیت کی آواز" سے متصف گردانا۔ مجیب صاحب نے افلاطونی فلسفے ویدانت کو غالب کی شاعری میں تلاش کیا۔ عالم خوند میری نے کہا کہ غالب نے "وحشت" میں وحدت کا راز تلاش کیا۔

غالب پر تنقیدی مضامین کا شمار ممکن نہیں ہے۔ میں نے یہاں مشہور ترین ناقدین غالب کی آرا کو یکجا کردیا ہے۔ آخر میں یہ عرض کروں گا۔ اگر غالب پر رشید صاحب کی تحریریں نہیں پڑھی ہیں تو وہ خدا کی دی ہوگی نعمتوں میں سے سب سے بڑی نعمت سے محروم رہا۔

میں نے ساری عمر انگریزی اَدَب پڑھایا اور ایک عمر اس کے سمجھنے میں گزار دی لیکن یقین کیجئے غالب جیسا کسی کو نہ پایا۔ کیسا دیدہ ور کو اس کی شاعری شام و سحر کی قید سے نکل کر جاوداں ہو گئی۔ کیا غالب کا غم اس کا ذاتی غم ہے؟ نہیں وہ تمام بنی نوع انسان کا غم ہے۔ اردو شاعری کی تاریخ میں یہ وہ زمانہ ہے جب ہر طرف اندھیرا تھا کہیں روشنی نظر نہ آتی تھی اس زمانہ میں غالب نے بتانِ آذری کا رقص دیکھا اور پہلی بار فن میں اندیشہ ہی نہیں عقل کی بھی تلاش کی۔ تشکیک انسان کو حقیقت کی تلاش پر مجبور کرتی ہے ہمارا تو بڑے سے بڑا شاعر جنون کی بات کرتا ہے عقل کی بات غالب نے کی۔ غالب کی دین ہے کہ اس نے ہمیں نئے خیالات سے آشنا کیا۔ اکثر لکھنوی الزام لگاتے رہے کہ میر کی کہی ہوئی بات کو اپنی طرز میں کہہ دیا۔ ڈاکٹر خورشید الاسلام نے بعض فارسی شعراء کے اشعار اور غالب کے اشعار کو ہم معنی قرار دیا۔ مگر یہ دونوں محترم اور دیگر حضرات دو باتیں بھول جاتے ہیں۔ اول تو یہ کہ سولھویں صدی کے بعد نئی بات کسی نے نہیں کی دوسرے یہ کہ غالب نے جن خیالات کو اپنی شاعری کا جزو بنایا وہ اس سے قبل اردو شاعری میں نہیں ملتے۔ غالب پہلا شاعر ہے جس نے حکیمانہ انداز اختیار کیا اور پڑھنے والے کو غور و فکر پر مجبور کیا یعنی تنقیدی شعور غالب کی دین ہے۔ رشید صاحب نے لکھا ہے کہ مغلوں نے ہندوستان کو تین تحفے دیئے۔ اردو، تاج محل اور غالب۔ اس کی تشریح کی جائے تو کتابیں لکھنی پڑیں گی۔ یہاں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ غالب کا قلم مغل قلم تھا جس نے شگفتگی ہی نہیں اختصار بھی دیا۔ شیکسپیئر نہ کہا ہے۔ .Brevity is the soul of wit۔ اس اور ایسی فطانت کا اظہار صرف غالب کی شاعری میں ہوا۔ واضح رہے کہ یہ خوبی غالب کے اردو اور فارسی دونوں کلام میں موجود ہے۔ یہ انداز و اسلوب کسی اور کو کب نصیب ہوا۔ ترکانہ بانکپن اور تیور کہیں اور نہ ملیں گے۔ غالب کی قوتِ متخیلہ کا اندازہ فارسی کلام کے مطالعہ بغیر ممکن نہیں۔ غالب نے کہا ہے۔

فارسی بین تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعہ اردو کہ بے رنگِ من است

غالب کا ایک شعر

جابر علی سید

جابر علی سید مرحوم کی غالب کے اس شعر کی یہ غیر مطبوعہ تشریح فراہم کرنے پر ادارہ پروفیسر مبارک احمد مجوکہ کا شکر گزار ہے۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب؟
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا!

تشریح

غالب نے اس علامتی شعر میں حقیقت کا وہ تصور پیش کیا ہے جو فلسفی کی تلاش مسلسل سے تعلق رکھتا ہے۔ منطق کی زبان میں یہ ذریعے اور مقصد یا علت و معلول کی انتہائی صورت کا تصور ہے جو نوعیت میں مابعد الطبیاتی ہے۔ اس اعتبار سے کہ معمولی اور متعارف مدرکات تلاش کی آخری منزل نہیں ہیں بلکہ آخری منزل وہ ہے جو ابھی سامنے نہیں آپائی۔ تمنا کا لفظ متغزلانہ تلازمہ رکھتا ہے لیکن یہاں یہ فلسفی کی جستجو کی مظہر ہے جو کبھی اختتام پذیر نہیں ہوتی۔ غالب جستجوئے حقیقت کی آخری منزل کے عدم حصول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ دشتِ امکان یعنی ممکنات و تعینات ادراک انسانی کی حیثیت محض ایک نقش پا کی سی ہے جو مظہر ہے کسی آگے آنے والی مظہر کا۔ برگساں نے "تخلیقی ارتقاء" میں اس نقش پا کو قوت حیات کی تیز جولانی کے پیچھے چھوڑے ہوئے نشانات قرار دیا ہے اور دنیائے ممکنات کو "پس ماندگی" Regression سے تعبیر کیا ہے۔ اقبال نے برگسانی تصور کو ساقی نامہ میں مختلف استعاروں کی مدد سے واضح کر دیا ہے لیکن ریگریشن کا نکتہ اور تصور نظر کرایا ہے۔ خود غالب نے ایک اور شعر میں اسی تصورِ حقیقت کی نشاندہی کی ہے۔

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلے کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

اور اس شعر میں تو واماندگی شوق، بالکل برگسانی "واماندگی" کے مماثل ہے۔

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنا

واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

تکرارِ تمنا کا مظہر دیر و حرم ہیں جو جویایانِ حقیقت مطلقہ کی اس ناکامی کی دلیل ہیں جو انہیں حصولِ منزلِ آخری میں ہوئی ہے۔ جدید نفسیات میں ذہن لاشعور سے ایک عمیق تر اور پیچیدہ تر دنیائے حسیات و افکار کی جستجو کا تصور ملتا ہے جسے امام ربانی نے سرِ خفی اور سرِ اخفیٰ کہا ہے۔ اقبال نے Meta Psychology کے اس نظریے پر "خطبات" میں بصیرت افروز تبصرہ کیا ہے۔ میٹا سائیکالوجی نے اب بہت سے نئے حقائق دریافت کر لئے ہیں جو پہلے سرحدِ ادراک میں نہیں آسکے تھے۔ اس طرح غالب نے اس شعر کے ذریعے جدید نفسیات اور علومِ عقلی کو Antiapate کیا ہے۔

اس شعر میں تمنا کا لفظ معمولی خواہش کے معنی میں استعمال نہیں ہوا بلکہ اس جذبہ تخلیق کے لئے استعمال ہوا ہے جس کی بدولت کائنات وجود پذیر ہوتی ہے .... غالب کہتے ہیں کہ لاانتہای تمنائے تخلیق نے کوئی دوسرا قدم بھی ضرور اٹھایا ہو گا۔ جس نے ایک ایسا عالم پیدا کیا ہو جو عالمِ امکاں کی طرح زمان و مکان کے سانچوں میں ڈھلا ہوا نہ ہو۔ صوفیہ اپنے روحانی واردات کی بنا پر ایسے عالموں کے ادراک دعویٰ کرتے ہیں۔ اور اسپنوزا کی طرح بعض فلاسفہ بھی اس کے قائل نظر آتے ہیں کہ عالمِ شعور اور مادی عالمِ محسوس کے علاوہ لاتعداد عوام اور ہو سکتے ہیں کیونکہ خدا کی صفات اور وجود کے انداز لامحدود ہیں۔ لیکن ہم موجودہ منزلِ ارتقاء میں ان کا تجربہ نہیں کر سکتے۔ اسی خیال کو غالب نے اس حکیمانہ شعر میں بیان کیا ہے کہ دنیا و مافیہا کے دشت امکاں پر ایک نقش قدم نظر آتا ہے۔ ضروری ہے کہ دوسرا قدم کسی دوسرے عالم کے لئے باعثِ آفرینش ہوا ہو لیکن میں نہیں جانتا کہ وہ کہاں پڑا۔ اس دوسرے عالم کی تمنا موجود ہے لیکن عالم امکان کے اندر گھری ہوئی بستی کو اس کا ادراک کیونکر ہو؟

(ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم۔ افکارِ غالب۔ ص 87، لاہور)

میرا غالب

ڈاکٹر محمد امین

غالب نے اپنے آپ کو عندلیب گلشن نا آفریدہ کہا ہے۔ جب بھی اس گلشن نا آفریدہ میں کوئی نیا پھول کھلتا ہے، غالب کی عظمت میں اضافہ ہوتا ہے۔ ہم مشرقی لوگ مزاجاً غیب پرست واقع ہوئے ہیں۔ شعراء کو تلامذ الرحمن سمجھتے ہیں۔ اور شاعری کو الہامی جانتے ہیں۔ غالب نے کہا ہے۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

غالب کو مضامین غیب سے ودیعت ہوئے۔ اور حرف و معنی کے رشتے کو جوڑ کر شعری پیکر دینے کے لئے جس سوز و گداز کی ضرورت ہے غالب کو وہ بھی نصیب ہوا۔

حسنِ فروغِ شمع سخن دور ہے اسد
پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

شعری واردات و تجربات کی نوعیت کم و بیش ایک سی ہوتی ہے۔ ہر شاعر ایک سی واردات اور ایک سے تجربات سے گزرتا ہے۔ مگر جو چیز شاعری میں کشش پیدا کرتی ہے وہ اسلوب ہے۔ اور اسلوب انسان خود ہے۔ غالب کو اچھوتا اسلوب بھی میسر آیا۔ غالب کو خود بھی اپنی اس ادائے خاص کا احساس ہے۔

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

غالب مشرقی دانش کا نمائندہ شاعر ہے یہ دانش و حکمت تصوف اور فلسفے کی مضبوط روایت سے

جنم لیتی ہے۔ غالب کے وہ اشعار کم نہیں جن میں حکمت کی اس روایت کا بھرپور اظہار ہوا ہے۔ مشرقی دانش کی ریزہ خیالی کے غزل کا پیکر موثر ترین ذریعۂ اظہار ہے۔

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبیں

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد
عالم تمام حلقہ دام خیال ہے

جز نام نہیں صورت عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستیٔ اشیاء مرے آگے

رشک و انا، یہ دو مضامین غالب کے ساتھ مخصوص ہیں۔ میرے نزدیک یہ خود آگاہی اور خود شعوری کی مختلف کیفیات ہیں۔ میں رشک کو خود شعوری کی ایک کیفیت سمجھتا ہوں۔ غالب کا یہ شعر دیکھیے:

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

غالب کی شاعری برصغیر کی مسلم ثقافت کے بنیادی رویوں کا اظہار ہے۔ غالب نے اس ثقافت سے بہت سے استعارے مستعار لئے اور یوں اسے اپنی شاعری کا حصہ بنایا۔

ان تمام بیانات پر الگ الگ سے مقالہ تحریر کیا جا سکتا ہے بلکہ بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن غالب کے جس پہلو نے مجھے متاثر کیا وہ غالب کا فلسفہ آرزو ہے۔ جو تحرک اور فعالیت کی بنیاد ہے۔ اسی بنا پر میں غالب کو زندگی، تحرک اور فعالیت کا شاعر سمجھتا ہوں۔ یہ وہ اہم کڑی ہے جو غالب اور اقبال میں مماثل ہے۔

غالب کے نزدیک تمنا زندگی کا دوسرا نام ہے کہ یہی جستجو کی محرک ہے۔

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا

نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

یہاں موت کا ایک مثبت پہلو سامنے آیا ہے۔ جو تحرک کا باعث ہے۔ انسان کی تمنائیں لامحدود ہیں۔ ان کی وسعت کی کوئی انتہا نہیں۔ غالب کے یہاں امکان اور تمنا مترادف الفاظ ہیں۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب

ہم نے دشت امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

اس شعر کی شارحین غالب نے جو تشریح کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ غالب نے تمنا کا امکانی سفر بھی ایک جست میں طے کر لیا۔ لیکن پہلے مصرعے میں جو استفسار سلبی کی کیفیت ہے۔ اس سے دوسرے مصرعے میں حیرت، شک اور المیہ کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ تمنا کی کوئی حد نہیں لیکن انسان نے اسے بھی سر کر لیا۔ یہ حیرت کا مقام ہے۔ تمنا کا دشت امکاں نقشِ پا کی طرح موہوم ہے۔ اسے کوئی طے کر سکتا ہے۔ شک کی کیفیت ہے۔ شاعر دشت امکاں کو طے کرنے کے اور شکست آرزو کے غم سے دوچار ہے۔ یہ المیہ کیفیت ہے۔ صرف ایک یہ شعر جسے غالب نے ترک کر دیا اپنے اندر تمنا کے کتنے مفاہیم رکھتا ہے۔ یہی وہ شکست آرزو ہے جو پناہیں تلاش کرتی ہے۔ کبھی دیر اور کبھی حرم میں پناہ ڈھونڈتی ہے۔

دیر و حرم آئینۂ تکرار تمنا

واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

دیر و حرم ناکام تمناؤں کا ہمیشہ سے سب سے بڑا سہارا رہے ہیں۔ یہ شعر فلسفہ و نفسیات کا ایک مکتب فکر ہے۔ تفصیل کے لئے فرائڈ اور ژونگ کے نظریات کا مطالعہ کیجیے۔ شکست آرزو سے تمنا کا عمل ختم نہیں ہوتا بلکہ جاری رہتا ہے۔ تمنا کی ناکامی بھی تجدید تمنا کی ایک صورت ہے۔ جب کہ زندگی میں تمنا کا عمل مسلسل جاری رہتا ہے۔

نہ لائے شوخیٔ اندیشہ تابِ رنج نومیدی

کفِ افسوس ملنا عہدِ تجدید تمنا ہے

زندگی کے بارے میں اس سے بڑھ کر اور مثبت رویہ کیا ہو گا کہ غالب قید حیات و بند غم کو لازم و

ملزوم سمجھتے ہیں۔

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

غم تنگ و تازِ زیست کا لازمی حصہ ہے اور اس سے بزم ہستی میں رونق ہے۔

کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ سامان ہے
برقِ خرمنِ راحت، خونِ گرم دہقان ہے

دل کی ساری ہنگامہ زائیاں انسانی تمناؤں کی مرہونِ منت ہیں۔ انہیں کی بدولت انسان عمل کے جوکھوں میں پڑ کر اپنی اور عالم کی تقدیر کا رازدار بنتا ہے اور اپنی مخفی قوتوں کو بیدار کر کے حیات کی تکمیل کرتا ہے۔ غالب نے اس مضمون کو بڑی بلاغت سے ادا کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمناؤں ہی سے شور ہستی برپا ہے، گویا کہ خود قیامت اس مشتِ خاک میں پنہاں ہے۔ اس شعر میں قیامت اور ہنگامے کے پیکری استعارے اپنی پوری تابناکی کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔

زما گرمست ایں ہنگامہ، بنگر شور، ہستی را
قیامت مید مداز پردۂ خاکے کہ انساں شد

(ڈاکٹر یوسف حسین خان، غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات، ص 103-104، کاروانِ ادب، ملتان صدر 1986ء)

اردو، غالب اور بھارت

بھارتی حکومت دعویٰ تو سیکولرزم کا کرتی ہے لیکن اردو زبان کو مٹانے کی سر توڑ کوشش کر رہی ہے اور وہ اس لئے کہ یہ اس کے نزدیک مسلمانوں کی زبان ہے۔ چنانچہ ہندی ذخیرہ الفاظ کی بھرپور شمولیت اور رسم الخط کی تبدیلی نے اس زبان کی ہیئت کو اس قدر بدل دیا ہے کہ یہ مسلمانوں کے لئے بالکل اجنبی بن گئی ہے، جس کے نتیجے میں وہاں کی تعلیم یافتہ نسلِ نو اس قابل ہی نہیں رہی کہ وہ ابو الکلام آزاد کے رشحات قلم کو معجز رسائی سے مسحور ہو سکے یا شعرِ غالب کے گنجینۂ معانی سے مسرت و بصیرت حاصل کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں جب غالب کی سو سالہ برسی منائی گئی تو بھارت کے دانشور بھی اس مذاق پر حیرت زدہ رہ گئے۔ یہی کیفیت جناب ساحر لدھیانوی پر بھی گزری۔ چنانچہ 1969ء میں دہلی میں جب جشنِ غالب منایا گیا اور ساحر لدھیانوی نے بھی شرکت کی تو اس نے ایک طویل نظم پڑھی۔ جس میں اس نے اردو زبان کے سلسلے میں بھارتی حکومت کے عملی تضاد، ذہنی عناد اور منافقانہ رویے پر بھرپور طنز کی۔ محفل میں بھارتی حکومت کے قریب قریب سبھی صاحبانِ اقتدار موجود تھے۔ ساحر نے اس موقع پر اردو زبان کے حق میں جو آواز اٹھائی وہ قابل ستائش ہے۔ اسی نظم کے چند شعر پیش کئے جاتے ہیں۔

جن شہروں میں گونجی تھی غالب کی نوا برسوں
ان شہروں میں اب اردو بے نام و نشاں ٹھہری
آزادیٔ کامل کا اعلان ہوا جس دن
معتوب زباں ٹھہری، غدّار زبان ٹھہری

جس عہد سیاست نے یہ زندہ زباں کچلی
اس عہدِ سیاست کو مرحوموں کا غم کیوں ہے؟
غالب جسے کہتے ہیں اردو ہی کا شاعر تھا
اردو پہ ستم ڈھا کر غالب پہ کرم کیوں ہے

(م ظ)

کلام غالب میں تصوف کے زاویے

محمد عامر اقبال
رو لنمبر 355 بی-ایڈ
سیکرٹری مجلس علوم اسلامیہ

کلام غالب ایک ایسی کہکشاں ہے جس میں ہر رنگ کے ستارے جگمگاتے نظر آتے ہیں۔ اس کے یہاں وعظ و نصیحت بھی ہے اور خالص عاشقانہ رنگ بھی، جرأت رندانہ بھی ہے اور تصوف و حکمت کے موتی بھی۔ ہر شخص اپنے ذوق اور صلاحیت کے مطابق اس کہکشاں سے روشنی حاصل کرتا ہے .... غالب کا تخیل جس دور میں محو پرواز تھا وہ مسلمانوں کے لئے مصائب و آلام کا دور تھا۔ اس چیز نے غالب کو مشکل پسند بنا دیا تھا۔ اپنے اس طبعی رویے کی وجہ سے اس کا طرز فکر دماغ کی پیچیدہ راہوں سے گزرنے کا عادی ہو چکا تھا۔ وہ اپنے سادہ سے سادہ اشعار میں بھی کوئی حکمت کی بات کہہ جاتا تھا چہ جائیکہ فلسفہ و تصوف کے اشعار میں کہ انہیں تو معنوی نزاکت اور ندرتِ خیال کے لحاظ سے مشکل ہونا ہی چاہیے۔

غالب نے اپنی ذہانت کے بل بوتے پر فلسفہ و تصوف کے ایسے اسرار و رموز تک رسائی حاصل کی جنہیں عام طور پر عشق کے بغیر نہیں جانا جا سکتا، بلکہ انہیں ایسے انداز میں پیش کیا کہ قاری کے ذہن کے دریچوں کو کھولتا چلا جائے۔ غالب صوفی نہ تھے لیکن ان کے کلام میں ہمیں تصوف کے دقیق مسائل کا تذکرہ جا بجا نظر آتا ہے۔

یہاں کلام غالب سے تصوف کے چند مسائل کا ذکر کیا جائے گا۔

1۔ تصور تخلیق آدم

انسان میں اچھائی اور برائی دونوں کے قبول کی صلاحیتیں ہیں۔ جس طرح آئینے کو دیکھنے کے قابل بنانے کے لئے اسے ایک طرف سے رنگدار اور دوسری طرف سے صاف رکھنا پڑتا ہے۔ اسی طرح اللہ کے نزدیک انسان مثل آئینہ ہوا، جس میں اللہ نے اپنے آپ کو دیکھا .... غالب نے اس نکتے کو یوں بیان کیا۔

لطافت، بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن، زنگار ہے آئینہ باد بہاری کا

2۔ تصور فنا

کل من علیھا فان (القرآن) کی رو سے ہر چیز فانی ہے اور باقی رہنے والی خدا کی ذات ہے۔ انسان کی اس ناپائیداری اور فانی الصفت ہونے کو تمام صوفیائے کرام نے اپنے اپنے انداز سے بیان کیا ہے۔ بعض کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے احکامات کے آگے سر تسلیم خم کرنا اور اپنی مرضی کو موقوف کر دینا ہی فنا ہے۔ غالب کے نزدیک مرتبۂ فنائیت صرف معدوم ہو جانے نام کا نہیں بلکہ اس سے بھی آگے گزر جانے کا ہے۔

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہ آتشیں سے بال عنقا جل گیا
نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

3۔ تصور وحدت الوجود

مسلمانوں کی تاریخ میں وحدت الوجود کے نظریے کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ بہت سے اختلافات سامنے آئے۔ بہت سے سر قلم ہوئے۔ عشق و محبت کی کہانیاں رقم ہوئی۔ قرآن مجید نے اس مسئلے کو یوں حل کیا کہ

لیس کمثلہ شیی

محی الدین ابن عربیؒ نے کہا:

العبد عبد و ان تعرج
والرب رب و ان تنزل

(بندہ بندہ ہے چاہے وہ جتنا عروج کرے، رب، رب ہے چاہے وہ کتنا نزول کرے)

اصل میں یہ مسائل روحانی تجربات سے حاصل ہوتے ہیں۔ ان مسائل کا تعلق نظری و فکری

سے زیادہ تجرباتی ہے۔ تجربے کی بھٹی سے گزر کر ہی انسان کندن بنتا ہے ورنہ پھر یہ نہ ختم ہونے والی لفظی بحثیں ہیں۔

غالب نے اس مسئلے کو بڑے عام فہم انداز میں حل کرنے کی کوشش کی ہے۔

ہر چند ہر ایک شئے ہے تو ہے
پر تجھ سی کوئی شئے نہیں ہے

اس شعر میں "سے" اور "سی" نے سارا مسئلہ واضح کر دیا ہے۔

ایک دوسرے موقع پر فرماتے ہیں۔

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

نہ تھا کچھ، تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا، تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں، تو کیا ہوتا!

4۔ تصور گناہ

حضرت علیؓ کے دور خلافت میں "خارجی" فرقے کا ظہور ہوا۔ جو حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کے درمیان صفین گے مقام پر حکم مقرر کرنے کے اختلاف کی صورت میں پیدا ہوا۔ ان کے عقائد میں تشدد کا عنصر غالب تھا۔ خارجی غیر خارجی کا مال و آبرو اپنے لئے جائز سمجھتے تھے۔ کبیرہ گناہ کے مرتکب کو کافر سمجھتے تھے۔ غالب نے ان کے متشددانہ عقائد پر یوں بیان کیا۔

حد چاہیئے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہ گار ہوں، کافر نہیں ہوں میں

5۔ ملامتی طرز فکر

صوفیا کے مکاتب فکر میں ایک ایسا مکتب فکر بھی ہے جو اپنے آپ کو لوگوں کے مقابلے میں ذلیل ورسوا سمجھتا ہے۔ ان کے خیال میں اس سے نفس کی اصلاح ہوتی ہے۔ غرور و تکبر کم ہوتا

ہے۔ عاجزی آتی ہے۔ اس مکتب فکر کے لوگ جان بوجھ کر غیر شرعی کام کرتے ہیں تاکہ لوگ انہیں برا بھلا کہیں۔ اس سے ان کو تسکین حاصل ہوتی ہے۔ غالب کی زندگی میں ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً وہ ماہ رمضان میں کچھ کھا پی کر روزے کو بہلاتے رہتے تھے۔

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

مر گیا پھوڑ کے سر، غالب وحشی، ہے، ہے!
بیٹھنا اس کا وہ، آ کر تیری دیوار کے پاس

6۔ حسن نیت

حسن نیت اور حسن عمل کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اچھی نیت ہی اچھے عمل کے لئے محرک کا کام دیتی ہے۔ حسن نیت سے عمل، عمل سے کردار، کردار سے رویہ اور رویے سے تقدیر بنتی ہے۔ احادیث میں آتا ہے کہ انما الاعمال بالنیات۔ غالب نے اس مسئلے کو یوں بیان کیا کہ حسن عمل کی جزا میں بہشت کا دروازہ قبر میں بھی کھل جاتا ہے۔

ہے، خیال حسن میں، حسن عمل کا سا خیال
خلد کا اک در، ہے میری گور کے اندر کھلا

ان فلسفیانہ و حکیمانہ افکار اور عمیق علمی اسرار تک رسائی کے باوجود غالب کی زندگی کا عملی پہلو تشنہ کام تھا۔ غالب کو اپنی اس کمزوری کا احساس خود بھی تھا اور یہی احساس اسے آج تک زندہ رکھے ہوئے ہے۔

یہ مسائلِ تصوف، یہ تیرا بیان، غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے، جو نہ بادہ خوار ہوتا

عقیدت ہے مجھے اس شاعرِ امروز فردا سے
سفر پر جاؤں تو دیوانِ غالب ساتھ رکھتا ہوں
محمد مختار علی

غالب شناسی اور نیاز و نگار
ایک مطالعہ

ڈاکٹر مختار ظفر

"غالب شناسی اور نیاز و نگار" ان مضامین کا انتخاب ہے جو تفہیم غالب کے ضمن میں مولانا نیاز فتح پوری کے معروف مجلہ "نگار" میں شائع ہوتے رہے۔ ماہنامہ "نگار" کی پلاٹینم جوبلی منعقدہ 1997ء کے حوالے سے جو پانچ مطبوعات منظر عام پر آئیں ان میں "غالب شناسی اور نیاز و نگار" سرفہرست ہے۔ اسے معروف نقاد، افسانہ نگار اور غالب شناس ڈاکٹر سلیم اختر نے مرتب کیا ہے۔ جن کا اس ترتیب میں صرف "پیش لفظ" شامل ہے۔ لیکن مضامین کے انتخاب اور ترتیب میں مطلوب ذہنی ریاضت کے لئے جس غالب شناس اہل قلم کی ضرورت تھی، اس کے لئے ڈاکٹر سلیم اختر ہی موزوں تھے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری جو ایک طرف خود بھی معتبر غالب شناس ہیں اور دوسری طرف نیاز فتح پوری کی "روشن خیالی کی تحریک سے قلبی اور قلمی طور پر وابستہ رہے ہیں۔"(1) (اور اب اس کے فروغ و اشاعت کے لئے بھرپور کام کر رہے ہیں) نے شاید اسی بنا پر ڈاکٹر سلیم اختر کا انتخاب کیا۔

ڈاکٹر سلیم اختر غالب شناسی میں بھی ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ آپ کی مشہور کتاب "شعور و لاشعور کا شاعر، غالب" مطالعہ غالب میں بصیرت زا ہے۔ یہ متذکرہ کتاب دس مقالات پر مشتمل ہے اور یہ مقالات آپ کے بیس سال کے عرصۂ حیات یا ذہنی کاوش کا نتیجہ ہیں۔ اس میں غالب کی شاعری کا جس انداز سے نفسیاتی مطالعہ کیا گیا ہے وہ غالب شناسی میں نیا زاویہ نظر فراہم کرتا ہے کیونکہ غالب جس کی شخصیت بجائے خود ایک چیستان ہے اور جس کی شاعری ادراک و شعور کی اتنی تہہ در تہہ کیفیات کی حامل ہے کہ خود غالب نے بھی کہا...... ع

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے

مدعا عنقا ہے مرے عالم تقریر کا

کی تفہیم اور اس کے نو بنو نظام فکر کی تلاش کے لئے نفسیاتی مطالعہ نئے در کھولتا ہے۔ لہذا مطالعۂ

غالب میں نئے زاویہ نظر کی تلاش کے لئے یہ کتاب ہماری رہنمائی کرتی ہے۔

زیر نظر کتاب "غالب شناسی اور نیاز و نگار" کے مضامین کا انتخاب اور ترتیب میں آپ نے غالب کی شخصیت اور شاعری کے جو نقش ہائے رنگارنگ پیش کئے ہیں ان سے غالبیات کی بہت سی ایسی جہتیں سامنے آ گئی ہیں جن سے غالب کی شخصیت کی آفاقیت اور اس کی شاعری کا بین الاقوامی تناظر سامنے آتا ہے۔ اگرچہ آپ کو یہ سہولت تھی کہ ان کا انتخاب صرف ماہنامہ "نگار" کے شماروں میں مطبوعہ مضامین میں سے کرنا تھا لیکن 1928ء تا 1993ء کے عرصے پر محیط 71 شماروں میں غالبیات کے موضوع پر نامور غالب شناسوں کے خوب تر مضامین میں سے چند کا انتخاب ایک آزمائش سے کم نہ تھا۔

"غالب شناسی اور نیاز و نگار" چار حصوں اور 485 پر مشتمل ہے۔ تفصیل یہ ہے۔

(الف) نگاہِ نیاز

(ب) قدر و معیار کی جستجو

(ج) غالب اور روسی مستشرقین

(د) شخصیت

آخر میں اشاریہ ہے جس میں 1928ء تا 1993ء کے "نگار" میں غالب کے عنوان پر مطبوعہ مقالات اور ان کے لکھاریوں کی فہرست دی گئی ہے۔

"نگاہِ نیاز" کے عنوان کے تحت سات مضامین ہیں جو علامہ نیاز کے زور قلم کا نتیجہ ہیں۔ آپ نے غالب پر جس قدر لکھا ہے اس میں سے یہ چند مضامین مشت از خروارے کے مصداق ہیں۔ تاہم انہی سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ غالب فہمی میں حضرت نیاز کے تیور کیا ہیں؟ ان مضامین میں غالب کو نقد و نظر کی کسوٹی پر جس طرح پرکھا گیا ہے۔ ان سے غالب کی طرز شاعری، شاعرانہ خصوصیات اور ان کے آہنگ و لہجہ کے محاسن ہی سامنے نہیں آتے بلکہ کلامِ غالب کا خورد بینی مطالعہ کر کے زبان و بیان کی اغلاط پر بھی گرفت کی گئی ہے اور ان کی تصحیحات بھی پیش کی گئی ہیں جو دل کو لگتی ہیں۔ لیکن ساتھ ہی روایت اور تجدد کے انتخاب میں روایت پرستی کا احساس بھی ابھرتا ہے۔ حالانکہ نیاز صاحب خود بھی تجدد پسند اور روشن خیال ادیب و دانشور ہیں اور غالب کے بارے میں بھی لکھتے ہیں کہ وہ مقلد نہیں، مجتہد تھا۔ ایک نئے طرز شاعری کا خلاق تھا، جس سے دنیا ناواقف تھی۔ پھر اس نے نئی زبان پیدا کی وغیرہ۔[2] ظاہر ہے نئی زبان میں روایت سے ہٹی ہوئی نامانوس باتیں تو ہوں گی جس کا نیاز صاحب کو بھی احساس ہے۔ وہ خود لکھتے

ہیں کہ غالب کی شاعری مستقبل کا نفسیاتی رجحان تھی جو اول اول نامانوس سی چیز معلوم ہوتی تھی لیکن بعد کو وہی زمانہ کی انتہائی تمنا قرار پائی۔[3] اس کے باوجود آپ نے غالب کے بہت سے ایسے اشعار کے لفظی و معنوی نقائص کی طرف توجہ دلائی ہے جو اب بھی مقبول و معروف عام ہیں۔ ایسے بھی ہیں جن کی تفہیم میں شارحین نے نئی دلالتیں اور موشگافیاں پیش کی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اتنی کڑی گرفت کیوں؟ دراصل نیاز جس طرح نزاکت ہائے زبان کے محرم راز تھے اسی طرح صحت زبان و بیان کے پاسدار بھی۔ آپ کی مومن پسندی کی ایک وجہ شاید یہی ہے۔ لیکن غالب کی غلطیوں پر گرفت کی وجہ غالب کا خود عظیمی احساس اور یہ سوال نظر آتا ہے کہ اتنی بڑی تخلیقی فطانت سے ایسے لفظی و معنوی اسقام کیوں؟ گو وہ اس کا ایک جواز بھی فراہم کرتے ہیں اور وہ یہ کہ شاعر جب کسی خاص جذبے سے متاثر ہو کر اسے شعر میں تبدیل کرنا چاہتا ہے تو کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس پر ایک کیفیت خود مقناطیسیت یا Self Hynotism کی طاری ہو جاتی ہے اور وہ اس سے اس درجہ مغلوب ہو جاتا ہے کہ اس کا جذباتی وجود اس کے منطقی وجود کو محو کر دیتا ہے اور وہ اپنے تصور و خیال کی لذت میں اتنا کھو جاتا ہے کہ اظہار جذبات کے ذرائع کی طرف اس کا ذہن منتقل ہی نہیں ہوتا اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ الفاظ یا اسلوب بیان خیال کا ساتھ نہیں دیتے اور شعر بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔[4] چنانچہ یہ جواز بھی غالب کی غلطیوں پر گرفت کی بنیاد بن جاتا ہے۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ نیاز صاحب غزل یا نظم کی قدر و قیمت کا تعین خالصتاً الفاظ و تراکیب کی مناسبت پر ہی کرتے ہیں۔

جناب نیاز کے بقول غالب فطرتاً بڑا خود آگاہ (Self-Conscious) تھا اور اس کو اپنی شاعرانہ عظمت کا گہرا احساس تھا۔ آپ غالب کے اسی احساس تفوق کو نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھتے ہوئے مانتے ہیں کہ وہ خسرو اور سعدی پر جس استدلال کے ساتھ اپنا تفوق جتاتا ہے وہ پاکیزہ ہے۔ پھر آپ غالب کے اس دعوے کی بھی تحسین کرتے ہیں کہ شعراء کوشش کر کے فنِ شعر تک پہنچے اور یہاں فنِ شعر خود مجھ تک پہنچا...... ع

ما نہ بودیم بدیں مرتبہ راضی غالب
شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فنِ ما[5]

البتہ آپ کو ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی اس رائے سے (کہ ہندوستان میں دو ہی الہامی کتابیں ہیں ..... ایک وید مقدس اور دوسری دیوان غالب) اختلاف ہے گو اس رائے سے اتنا اختلاف نہیں جتنا اس کی بنیاد سے ہے۔ یعنی یہ رائے غالب کی شعری فلسفہ طرازی کو پیش نظر رکھ کر دی گئی ہے اور

یہی بات آپ کے نزدیک غلط ہے۔ دراصل شاعری کے بارے میں آپ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ شاعری الہام ہے اور اس کا وظیفہ بیانِ درد اور حکایت محبت ہے، اظہار فکر و فلسفہ نہیں۔ اس لئے آپ کے نزدیک غالب کی شاعری کا وہی حصہ بیکار ہے جسے فلسفہ طرازی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود آپ مومن کی فلسفہ طرازی کو ترجیح دیتے ہیں کیونکہ اس میں تغزل کا رنگ غالب ہے۔[6]

"غالب اور بیدل" کے مضمون میں آپ غالب کو بیدل کا متبع قرار نہیں دیتے کیونکہ وہ اس کاوش میں ناکام رہے جس کی وجہ یہ ہے کہ بیدل نے صرف فلسفہ تکوین کو پیش نظر رکھا اور اس میں بھی خصوصیت کے ساتھ خالق و مخلوق کا تعلق، قدرت کی بے پایاں وسعت، اس کے مظاہر و آثار، اپنی محدود و ناکام جستجو اور آخر میں وحدت وجود کا تصور[7] جو اس نوع کی سعی و جستجو کا حتمی نتیجہ ہے۔ جب کہ غالب نے اس رنگ کو مادی شاعری اور مادی تغزل پر منطبق کرنا چاہا۔ لہذا اس نے اس رنگ میں جو لکھا وہ اس کیف سے خالی رہا جو بیدل کے یہاں پایا جاتا ہے۔ اسی لئے غالب نے اس رنگ کو چھوڑ دیا۔ البتہ بیدل کے آپ بے حد معترف ہیں اس لئے کہ وہ ان کے نزدیک شاعر سے زیادہ بلند چیز بلکہ اس سے بھی ارفع ایک خلاق سخن تھا اور اس کا ہر لفظ ایک نغمۂ لاہوتی تھا جس کی مثال سوائے الہامی کتابوں کے کسی اور جگہ نہیں ملتی۔[8] آپ بیدل کے نظریہ شاعری کو بھی غالب کے ایسے تصور سے زیادہ بلند سمجھتے ہیں اور غالب کی تراکیب کو بھی (بشمول تراکیب مومن) بیدل کے اثرات کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔[9]

کتاب کا دوسرا حصہ جس کا عنوان "قدر و معیار کی جستجو" ہے، سترہ مضامین پر مشتمل ہے جو پاک و ہند کے نامور غالب شناس اہل قلم نے تحریر کئے ہوئے ہیں۔ .... پہلا مضمون جناب مالک رام کا ہے جس میں غالب کے اس تصور کو جو عظمت انسان کے بارے میں ہے کو اجاگر کیا گیا ہے۔ آپ کے بقول تکوین عالم کی غرض ہی وجود انسان ہے اور اس کائنات کا سارا کارخانہ اس ہی کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور یہی غالب کہتے ہیں۔

ز آفرینش عالم غرض جز آدم نیست

مگر نقطۂ ما، دورِ ہفت پرکار است

جناب مالک رام کا خیال ہے کہ علامہ اقبال نے ایک نظم میں خدا اور انسان کے درمیان جو مکالمہ لکھا ہے وہ بہت حد تک غالب کے اس مذکورہ شعر کی تفسیر معلوم ہوتا ہے۔

جناب امتیاز علی خاں عرشی نے غالب کے دعاوی کے حوالوں سے غالب کا معیارِ شعر و سخن

متعین کرنے کی محققانہ کاوش کی ہے۔ مثلاً غالب کے نزدیک سوائے امیر خسرو دہلوی کے کوئی مسلم الثبوت شاعر نہیں۔ ہندی شاعروں اور ادیبوں کے بارے میں غالب کا خیال ہے کہ یہ لوگ راہِ سخن کے غول ہیں۔ اس طرح آپ نے شعر و سخن سے متعلق بہت سے موضوعات پر غالب کی آراء کا احاطہ کیا ہے۔[11]

مولانا غلام رسول مہر کی "غالب بحیثیت نقاد" کے موضوع پر بحث خوب ہے۔ آپ کے نزدیک اس موضوع پر مرزا غالب کے خیالات کا اردو اور فارسی نظم و نثر میں کافی مواد موجود ہے بلکہ بعض کتابیں تو مستقل طور پر بائے بسم اللہ سے لے کر تائے تمت تک تنقید ہی کے تحت آتی ہیں۔ مثلاً "قاطع برہان"، "لطائف غیبی"، "سوالات عبدالکریم" اور "تیغ تیز" حالانکہ اس زمانے میں فن تنقید ارتقاء کے موجودہ درجے تک نہیں پہنچا تھا۔ مولانا مہر کی تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ جس طرح غالب نے اپنے نادر اسلوب فکر سے قدیم اور دورِ جدید میں برزخ کا مقام پیدا کیا اسی طرح تنقید میں بھی ان کو برزخ کا مقام حاصل ہے۔ چنانچہ انہوں نے پچھلوں سے کامل قطع نہ کرتے ہوئے آنے والوں کے لئے نئے راستے پیدا کئے اور اپنی انقلاب آفریں فطرت سے کام لے کر جدید دور کی بنیادیں استوار کیں۔ بلکہ ہمارے ادبیات کو مرزا نے جس نہج پر ڈالا تھا یہ آج تک اسی نہج پر جاری ہے۔[12]

"غالب ہمہ رنگ" میں مجنوں گورکھپوری نے غالب کی تخلیقی عظمت اور ذہنی آفاقیت پر خامہ فرسائی کی ہے۔ آپ کے بقول اردو شاعری میں جو شخصیتیں تاریخی سانحات کی حیثیت رکھتی ہیں ان میں غالب کی شخصیت سب سے زیادہ ممتاز ہے۔ آپ کی تحقیقی نظر نے غالب کے بارے میں ڈاکٹر بجنوری کی معروف رائے کا بھی سراغ دیا ہے کہ انہیں یہ اشارہ غالب کی اس فارسی رباعی سے ملا جس میں اس نے دعویٰ کیا ہے کہ اگر فنِ سخن کوئی دین ہوتا تو اس دین کی ایزدی کتاب "یہ" دیوان ہوتی۔[13] آپ نے اپنے خوبصورت مضمون کو اس بات پر منتج کیا کہ غالب نے اقبال کو پیدا کیا اور اقبال نے بعد کے تمام شاعروں کو بالکل اسی طرح جیسے انگریزی ادب کے مشہور مورخ اور نقاد کے بقول کیٹس نے ٹینی سن کو پیدا کیا اور ٹینی سن نے بعد کے تمام انگریزی شاعروں کو۔

آل احمد سرور نے "غالب کا ذہنی ارتقاء" میں غالب کو قدیم و جدید کا سنگم قرار دیا ہے ان کے نزدیک غالب ایک دور کے خاتم اور دوسرے کے موجد ہیں۔ اسی وجہ سے ان کی شاعری ہماری تہذیب کی سب سے اہم کروٹ کو ظاہر کرتی ہے اور اسی وجہ سے حدیثِ دلبری صحیفۂ

کائنات بن جاتی ہے۔[14]

احتشام حسین نے اپنے مضمون "غالب کی بت شکنی" میں بڑی خیال انگیز باتیں کی ہیں۔ آپ کے نزدیک غالب کے یہاں بت سازی، بت فروشی، بت پرستی اور بت شکنی کی ہر منزل ملتی ہے جس میں بت شکنی کا جذبہ سب سے زیادہ ہے جب کہ بت شکنی، زندگی کو نئے تجربوں کی راہ پر ڈالنے، بندھے ٹکے اصولوں سے انحراف کر کے زندگی میں نئی قدروں کو جستجو کا نام ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اپنے مقالے "غالب کے کلام میں استفہام" میں غالب کے استفہامیہ کی ایمائیت اور معنی آفرینی پر خیال انگیز بحث کی ہے۔ آپ کے بقول "غالب کا کلام زفرق تا بہ قدم، کرشمہ دامنِ دل میکشد کا مصداق ہے"، آپ کے نزدیک غالب کے اسلوب کی ندرت اور کمال صرف اسی خوبی میں مضمر ہے کہ اس نے صرف استفہامیہ لب ولہجہ سے کام لیا اور اس تخلیق کو جدت خیالی سے اس طرح ہم آہنگ کیا کہ شعریت کے نغمے دلکش ہوتے گئے۔"[15] آپ نے بہت سی مثالوں سے اپنے اس خیال کو موثر بنایا ہے۔

شمس الرحمن فاروقی نے بھی "اندازِ گفتگو کیا ہے؟" میں اسی استفہامیہ انداز کے شعری اثرات پر خامہ فرسائی کی ہے۔ آپ کا کہنا ہے کہ استفہام 20 ویں صدی کا مزاج ہے چنانچہ غالب کے یہاں تجسس اور ڈراما کی جو فضا ملتی ہے وہ انہیں 20 ویں صدی کے ذہن کے قریب لے جاتی ہے۔ آپ نے علمائے بلاغت کے حوالے سے بیان کی اقسام پر بحث کرتے ہوئے بہت سی مثالوں کے ساتھ استفہامی یا تمنائی انشائیہ بیان کو خبریہ بیان پر ترجیح دی ہے۔ آپ کے خیال میں غالب کے یہاں اسرار کی جو کیفیت ہے، اس کی بڑی وجہ غالب کے استفہامیہ اشعار ہیں۔

کاظم علی خان نے "بہادر شاہ ظفر کی کتاب پر غالب کی تقریظ" کا پس منظر بیان کرتے ہوئے غالب کے تنقیدی انداز کا تجزیہ کیا ہے۔ .... عبدالباری آسی نے "موازنہ مومن و غالب" میں بعض اصناف سخن مثلاً مثنوی، قصیدہ، رباعی اور غزل کے حوالے سے یکساں نوعیت کے مضامین میں دونوں شعراء کے اندازِ سخن گوئی اور موضوعات کی Treatment میں موازنہ کیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ غالب کے یہاں استدلال زیادہ ہے اور مومن کے ہاں تغزل۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنے مضمون میں بہت سی مثالوں کے ذریعے زبان (بالخصوص غالب کی نثری زبان) پر فارسی کے اثرات اور انگریزی الفاظ کے استعمال کا جائزہ لیا ہے۔ آپ کے نزدیک غالب نے فارسی لفظوں اور ترکیبوں کا استعمال ایسی برجستگی کے ساتھ کیا ہے کہ ان سے نثر زیادہ موثر اور زیادہ معنی خیز ہو گئی ہے[16] .... پھر غالب نے اردو میں فارسی اور عربی

اسماء کے استعمال میں بھی جدت کی راہ اپنائی ہے اور وہ یہ ہے کہ انہوں نے ان زبانوں کے انہی الفاظ کے ساتھ فارسی افعال کا بھی اردو میں ترجمہ کر دیا حالانکہ قبل ازیں اردو نے جو بہت سے فارسی اور عربی اسماء مستعار لئے تھے ان کے ساتھ افعال اردو ہی کے مستعمل ہیں۔ (17)

سراج الحق مچھلی شہری نے "مرزا غالب کا مذہب" میں کئی دلائل و براہین اور اقوال و افعالِ غالب سے اور پھر ان کے صوفیانہ طرزِ فکر کے حوالے سے، لوگوں کے مزعومہ دلائل برائے تشیع کے باوجود، مرزا کو سنی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، حالانکہ آپ کا یہ کہنا بھی ہے کہ مرزا کا کوئی مستقل مذہب نہ تھا اور اسی وجہ سے ان کی ذات تشیع و تسنن کے تشخصات و امتیازات اور قوم و ملک کی قیود سے یکسر بے نیاز تھی۔

ڈاکٹر سید معین الرحمن نے "غالب اور سقوط دہلی (انگریزوں کے مظالم، دستنبو کی روشنی میں)" میں تحقیق و تشہید سے ثابت کیا ہے کہ مرزا نے دستنبو کی تصنیف ہی اس لئے کی تھی کہ وہ اس کے ذریعے قلعہ معلیٰ سے اپنے تعلق کے داغ کو مٹانا چاہتے تھے اور تحریک آزادی کو "رستخیز بے جا" قرار دے کر انگریز حکام کی نظر میں سرخرو ہونا چاہتے تھے۔ اور وہ بھی پنشن کے اجراء اور خطاب و خلعت پانے کی خاطر۔ اس مضمون میں نئی تحقیق یہ ہے کہ آپ نے انگریز مورخین کے اعترافات اور شہادتوں کی روشنی میں اس جواز کی تغلیط کی ہے جو غالب نے دستنبو میں انگریزوں کے ظلم و عدوان کے لئے پیش کئے۔

جناب خلیل صدیقی نے "غالب کا اسلوب" میں اسلوب پر خیال انگیز بحث کرتے ہوئے اسلوب غالب کے تشکیلی عناصر کا جائزہ لیا اور اس ضمن میں بہت سے غالب شناسوں کی آرا کے حوالے دے کر غالب کے اسلوب کی حسن کاری کا احاطہ کیا ہے۔ .... ڈاکٹر ابو محمد سحر کا تحقیقی مضمون "نسخہ حمیدیہ اور اس کی اہمیت" معلومات افزاء ہے۔ اس میں آپ نے نسخہ حمیدیہ کی غلطیوں اور اس سے وابستہ غلط فہمیوں کی نشاندہی کی ہے۔ مثلاً

پہلی بات یہ ہے کہ اسے ڈاکٹر بجنوری نے نہیں بلکہ مفتی انوار الحق ڈائریکٹر تعلیمات بھوپال نے مرتب کیا ہے جس میں انہوں نے نسخہ بھوپال، متداول دیوان غالب اور ان کے کچھ اور اشعار کو یکجا کیا اور پھر اس کتاب کو نواب زادہ حمید اللہ خان (چیف سیکریٹری بھوپال) سے منسوب کر کے 1921 میں دیوان غالب جدید المعروف نسخہ حمیدیہ کے نام سے شائع کر دیا جس میں ڈاکٹر بجنوری کا وہ تبصرہ بھی بطور مقدمہ شامل کیا جو انہوں نے صرف متداول دیوان غالب کو مدِ نظر رکھ کر لکھا تھا۔

اصل بات یہ تھی کہ ڈاکٹر بجنوری جب بھوپال میں مشیرِ تعلیم تھے تو انجمن ترقی اردو کے لئے دیوان غالب کا ایک نیا ایڈیشن ترتیب دے رہے تھے۔ تب انہیں نسخہ بھوپال کا علم ہوا۔ یہ نسخہ غالب کا ترتیب دیا ہوا آخری قلمی دیوان تھا۔ جب غالب نے 1841ء میں سید المطابع دہلی سے اپنا دیوان طبع کرایا تو اس مطبوعہ دیوان میں بہت سے وہ اشعار شامل نہ کئے جو قلمی دیوان میں موجود تھے۔ یا پھر اس کے کئی اشعار میں ردو بدل کر کے اس میں شامل اشاعت کر دیا یوں اس قلمی دیوان میں کلامِ غالب کا ایک بڑا حصہ مطبوعہ دیوان میں شامل نہ ہو سکا۔ یہ قلمی دیوان ریاست بھوپال کی حمیدیہ لائبریری میں محفوظ رہ گیا اور نسخۂ بھوپال کہلایا۔ جب یہ نسخہ ڈاکٹر بجنوری کے ہاتھ لگا تو انہوں نے اس قلمی دیوان کے کلام کو متداول دیوان کے اشتراک کے ساتھ طبع کرنے کا خاص منصوبہ بنایا۔ لیکن عمر نے وفا نے کی اور وہ 1918ء میں ہی راہی عدم ہو گئے۔ تب یہ ذمہ داری مفتی انوار الحق ڈائریکٹر تعلیمات کو سونپی گئی۔ ان کے طبع کردہ نسخہ حمیدیہ کی تدوین میں ایک خرابی یہ ہوئی کہ قلمی نسخے کی انفرادیت بھی گم ہو گئی اور وہ تاریخی شعور بھی مبہم ہو گیا جو اس قلمی نسخے سے حاصل ہوتا تھا۔ دوسری خرابی یہ ہوئی کہ یہ قلمی نسخہ بھی غائب ہو گیا۔ امتیاز علی عرشی کی تحقیق کے مطابق اس کی ایک غلطی یہ تھی کہ قلمی دیوان کے بہت سے اشعار شامل اشاعت نہیں ہوئے۔ دوسرے اس میں بعض ایسے اشعار موجود ہیں جو قلمی دیوان میں موجود نہ تھے لیکن انہیں یہاں قلمی ظاہر کیا گیا۔ پھر محلِ استعمال بھی غلط بتایا گیا۔ جناب مالک رام نے اس میں کتابت کی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے۔

آفتاب احمد خان نے "کلام غالب کی شرحیں" میں اپنے ذاتی کتب خانے میں موجود اکاون شرحوں کا تذکرہ اور ان پر مجملاً تبصرہ کیا ہے۔

تیسرے حصے میں "غالب اور روسی مستشرقین" کے عنوان کے تحت آٹھ مقالات ہیں جن میں دو بابا جان غفار روف کے ہیں۔ ان مقالات سے غالب کی شخصیت اور شاعری میں روسی ادباء کی گہری دلچسپی اور اس کے مطالعہ میں ان کی دقت نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان ادباء نے اپنے حیاتیاتی نقطۂ نظر کے حوالے سے غالب شناسی میں بعض ایسی جہتوں کی طرف اشارے کئے ہیں جن پر اردو نقادوں کی توجہ کم رہی ہے۔ بالخصوص ترقی پسندانہ اندازِ نظر اور انسان دوستی کے تصورات۔ ذیل میں ان مستشرقین کی آرا کا اجمالاً جائزہ لیا جاتا ہے۔

جی وائی علی اوف نے "سوویت یونین میں غالب کی تخلیقات کا مطالعہ" کے عنوان سے تفہیم غالب کا اور بابا جان غفار روف نے غالب کی مقبولیت کا جائزہ پیش کیا ہے۔ ان کے بقول

یہاں غالب کی تخلیقات کا تجزیہ کرنے کی پہلی کوشش 1924ء میں کی گئی۔ جس کے دو پس منظر تھے۔ ایک تو ہندوستان کے وسطِ ایشیاء کے ساتھ صدیوں پرانے ادبی اور تہذیبی تعلقات نیز ایرانی تہذیب کے گہرے اثرات، دوسرے سوشلسٹ انقلاب کے بعد مشرقی اقوام کی تحریک قومی آزادی میں سوویت مستشرقین کی دلچسپی اور اس کے نتیجے میں بیدل اور غالب کی شاعری سے تعلق .... چنانچہ 1924ء میں باباجان غفوروف کی "مشرقی منتخبات" کی پہلی جلد شائع ہوئی، جس میں ایم کلیا گینا کو ندراتی تیوا کا غالب کی چھ غزلوں کا روسی زبان میں ترجمہ شامل تھا۔[18] ....
پھر جدید ہندوستانی زبانوں اور ادب کے ممتاز سوویت ماہر اکادمیشین اے۔ پی۔ بارانکوف نے ہندوستانی ادیب جوالادت شرما کی کتاب غالب پر تبصرہ لکھا۔ آپ نے ڈاکٹر عبداللطیف کی ادبی تصنیف "غالب" پر بھی تنقید کی۔ اس سے قبل آپ نے ہندوستانی ادیب قاضی عزیز الدین کی کہانی "لنگوتری" کے اپنے یوکرینی ترجمے کے پیش لفظ میں غالب کا ذکر کیا تھا۔ آپ نے اپنی کتاب "جدید ہندوستانی نثر کے نمونے" مطبوعہ 1933ء میں بھی غالب اور ان کی شاعری کا سرسری تذکرہ کیا اور اس میں ایک غزل کا روسی زبان میں ترجمہ بھی شامل کیا۔ پھر جنگ عظیم اور بعد کے حالات کی بناء پر مطالعہ غالب میں ایک طویل وقفہ پیدا ہو گیا۔ لیکن پانچویں دہائی کے اوائل سے جب سوویت یونین میں ان ایشیائی اور افریقی اقوام کی تہذیب اور ادب کا مطالعہ شروع ہوا جنہوں نے نوآبادیاتی استبداد کا جوا اتار پھینکنے کا تہیہ کر لیا تھا تو اس مطالعہ میں غالب کی شاعری کو بھی شامل کر لیا گیا۔

1957 سے ماسکو سے مشرق کے منتخب کلام کا مجموعہ بعنوان "مشرقی المناخ"[19] ہر سال شائع کیا جانے لگا اس کے دوسرے شمارے میں غالب کی بعض نظموں کے ترجمے شائع ہوئے۔ ان کے ساتھ دی۔ کالیگن کا ایک مضمون بھی طبع ہوا۔ 1962ء میں تاجک علماء اے۔ غفوروف اور ایس پلاتودا نے ماسٹر کی ڈگری کے لئے غالب کے متعلق دو بسیط مقالے لکھے جن میں پلاتودا کا مضمون "شاعر مشور ہند" مطبوعہ "مشرقِ سرخ" قابل ذکر ہے۔

غالب کی زندگی اور شاعری پر پہلی کتاب تاجک زبان میں اے۔ غفوروف کی شائع ہوئی جس میں مصنف نے فارسی شاعری کے نظریاتی عنصر پر زیادہ توجہ کی ہے۔ 1965ء میں ایک چھوٹی سی کتاب تاشقند میں شائع ہوئی جس میں غالب کے اردو دیوان کی منتخب غزلوں کے ازبک ترجمے شامل ہیں۔ ایس پلاتودا کی کتاب "غالب کے اردو مکاتیب" کے عنوان سے شائع ہوئی۔ اس ضمن میں الیکسی سخاچوف کا مقالہ "اردو ادب" بھی اہم ہے جس میں یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ غالب کی

ساری امیدوں اور خیالات کا ایک ہی رخ تھا کہ تخلیق کی آزادی حاصل ہو۔

آئی۔ ایس۔ رابینووچ کی کتاب "ہندوستان کے ادب" میں غالب کی شاعری کے ہندوستانی مزاج اور نوعیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تاجکستان میں مطبوعہ اے غفوروک کی کتاب "منتخب" میں غالب کی 150 غزلیں، 50 رباعیات، قصائد کے نمونے اور غالب کے فارسی کلیات کی دوسری اصناف شامل ہیں۔ اس کتاب میں "پنج آہنگ"، "مہر نیمروز"، "دستنبو" اور "درفش کادیانی" کے نثری اقتباسات بھی شام ہیں۔[19] اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ دس ہزار کا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ .... 1969ء میں غالب کی برسی منانے کے لئے غالب پر مقالات کا ایک مجموعہ شائع کیا گیا جس میں سوویت یونین کے علاوہ دوسرے ملکوں کے ممتاز مستشرقین کے لکھے ہوئے مقالے بھی شامل ہیں۔[20]

باباجان غفاروف کی غالب کی شاعری پر گہری نظر ہے۔ ان کے بقول "غالب جیسی شاعرانہ بصیرت کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ ان کے سلسلہ ہائے خیال کی پیچ در پیچ روش پر عقل حیران رہ جاتی ہے۔ پھر غالب کی انسان دوستی اس عظیم تخلیقی عنصر کی حامل ہے جو ان کی شاعری کو زندہ جاوید بنا دیتا ہے۔"[21] ...... ای چیلی شئیف کے نزدیک غالب کی شاعری اور ان کا عالمی نقطۂ نظر اردو ادب کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اس نے اردو ادب میں ترقی پسندانہ رجحانات کے فروغ و ارتقاء کے لئے بنیادی حالات کو جنم دیا۔[22] ایل آر گوردن پولنسکایا کے خیال میں غالب کے جمالیاتی تصورات کی ایک نمایاں خصوصیت ان کی گہری انسان دوستی ہے البتہ ان کے خیالات میں گہرا تضاد ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ خیالات قدیم اور جدید نظریوں کی کشمکش کے آئینہ دار ہیں۔[23]

اپنے دوسرے مضمون "غالب..... ایک مطالعہ" کے مطابق باباجان غفوروف کی رائے ہے کہ غالب عالمی تہذیب کے خزانے کا ایک بیش قیمت ہیرا ہیں۔ اپنی اس وسیع آفاقیت کی بنا پر کئی محققین ان کا تقابل گوئٹے سے کرتے ہیں اور ہم سوویت یونین میں پشکن سے۔

غضنفر علی اوف کا خیال ہے کہ غالب نے فکر و خیال اور جمالیات کی وہ زمین تیار کر دی ہے جس پر بعد میں محمد اقبال کی شاعری کے پھول کھلے۔[24]

اے۔ سوخاچیف نے "حالی اور مرزا غالب" میں حالی کی شعری و فکری عظمتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی "یادگار غالب" کا تجزیہ کیا ہے۔ ان کے نزدیک غالب کی شاعری میں نئے آدرشوں کی تڑپ ہے۔

این پریگرینا نے اپنے تفکر خیز مضمون میں صوفیانہ و عشقیہ اردو شاعری میں استعاراتی نظام کا تجزیہ کیا ہے اور پھر چند استعاروں مثلاً "شمع و پروانہ" اور "شاہ و گدا" کے حوالے سے غالب اور اقبال کا موازنہ کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ غالب کے یہاں لوازمات کے استعمال میں زیادہ وسعت اور آزادی سے کام لیا گیا ہے جب کہ اقبال کے یہاں ایک ہی موضوع کو زیادہ گہرائی کے ساتھ برتنے کا رجحان ہے۔[25]

کتاب کا آخری حصہ "شخصیت" چار مضامین پر مشتمل ہے۔ پہلا مضمون ڈاکٹر شوکت سبزواری کا ہے جس میں آپ نے شخصیت کی خصوصیات اور اقسام پر بحث کرتے ہوئے غالب کو فعلی (فعالی) شخصیت قرار دیا ہے۔ آپ کے بقول ایسی شخصیتیں "انانی" ہوتی ہیں۔ چنانچہ غالب کی خود بینی، خود پسندی اور پھر عزت نفس اور خودداری کا شدید احساس ان میں ایک انفرادی شان پیدا کرتا ہے۔[26]

پروفیسر عبد القادر سروری نے "غالب کی افتاد طبع" میں رشک کے مادے کو ان کی شاعری کا اہم خاصہ قرار دیا ہے۔ آپ کے نزدیک یہ خاصہ نہایت نفیس مرقعوں کی تخلیق کا سبب بنا ہے۔ آپ نے کلام غالب سے رشکیہ مرقعوں کو پیش کر کے ان کی افتادِ طبع کے اس پہلو پر خوب روشنی ڈالی ہے۔

فراق گورکھپوری نے "غالب پھر اس دنیا میں" کا مضمون بزبان غالب لکھا ہے۔ اس کے مطابق غالب اس دنیا میں آ کر سماجی، معاشرتی اور سیاسی انقلاب دیکھ کر حیران ہوتے ہیں۔ پھر دلی، چاندنی چوک، کوچہ چیلاں اور کوچہ بلی ماراں میں اپنے تصورات کے مطابق نئی زندگی کی نئی بہاریں دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ کتابوں کی دکانوں میں دیوانِ غالب کے مختلف النوع ایڈیشن، مرقع چغتائی اور اپنی بین الاقوامی مقبولیت کو دیکھ کر ششدر رہ جاتے ہیں اور یہ جان کر خوش ہوتے ہیں کہ میں نے شاعری کو جو عظمت دی وہ اقبال کے ہاتھوں پروان چڑھی ہے۔

پروفیسر حمید احمد خاں نے "اسد اللہ خاں تمام ہوا" کے عنوان سے ایک سوانحی تمثیل تحریر کی ہے۔ آپ نے اس تصور پر کہ "غالب کی زندگی اپنے آغاز و انجام اور درمیانی واقعات کی ترتیب و ارتقاء کے لحاظ سے ایک ڈرامائی کیفیت رکھتی ہے" غالب کے دور آخر کی ایسی ڈرامائی تشکیل کی ہے جس سے فکر و نظر کے کئی دریچے کھلتے ہیں۔ یہ ڈراما نصف صدی کے واقعات کا پس منظر فراہم کرتا ہے۔

مجموعی طور پر یہ کتاب غالب فہمی میں فکر و نظر کے بہت سے دریچے کھولتی ہے۔ کتاب کی

گیٹ اپ بھی خوب ہے۔ البتہ composing کی بعض لفظی غلطیاں کھٹکتی ہیں۔ اسے "الوقار پبلی کیشنز" لاہور نے شائع کیا ہے۔ انتساب معروف ادیب، شاعر اور نقاد ڈاکٹر طاہر تونسوی کے نام ہے۔ اس لئے بھی کہ بقول ڈاکٹر سلیم اختر "ہیں اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری ان کے مداح ہیں" اور اس لئے بھی کہ اس کتاب کی اشاعت میں آپ کا بڑا رول ہے۔

حوالہ جات

1۔ ڈاکٹر سلیم اختر (پیش لفظ) غالب شناسی اور نیاز و نگار، ص16، الوقار پبلیکیشنز، لاہور 1998ء

2۔ 3۔ نیاز فتح پوری (غالب کا طرز شاعری اور شاعرانہ خصوصیات)، غالب شناسی اور نیاز و نگار، ص22، 24، 32

4۔ نیاز فتح پوری (کلام غالب کا خرد بینی مطالعہ) غالب شناسی اور نیاز و نگار، ص45

5۔ نیاز فتح پوری (غالب کا طرز شاعری اور شاعرانہ خصوصیات)، غالب شناسی اور نیاز و نگار، ص32

6۔ 7۔ نیاز فتح پوری (غالب کی الہامی شاعری) غالب شناسی اور نیاز و نگار، ص86

8۔ نیاز فتح پوری (غالب و بیدل) غالب شناسی اور نیاز و نگار، ص100

9۔ نیاز فتح پوری (مومن و غالب کی فارسی ترکیبیں) غالب شناسی اور نیاز و نگار، ص105

10۔ مالک رام (انسان کی خلافت الٰہیہ اور غالب) غالب شناسی اور نیاز و نگار، ص111

11۔ امتیاز علی عرشی (غالب کا معیارِ شعر و سخن) غالب شناسی اور نیاز و نگار، ص121

12۔ غلام رسول مہر (غالب بحیثیت نقاد) غالب شناسی اور نیاز و نگار، ص146-147

13۔ مجنوں گورکھپوری (غالب ہمہ رنگ) غالب شناسی اور نیاز و نگار، ص154

14۔ آل احمد سرور (غالب کا ذہنی ارتقاء) غالب شناسی اور نیاز و نگار، ص165

15۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری (غالب کے کلام میں استفہام) غالب شناسی اور نیاز و نگار، ص186

16۔ 17۔ ڈاکٹر خلیق انجم (غالب کی زبان پر فارسی اثرات، انگریزی الفاظ کا استعمال) غالب شناسی اور نیاز و نگار، ص266-277

18۔ 19۔ باباجان غفاروف (سوویت یونین میں غالب کی مقبولیت) غالب شناسی اور نیاز و نگار، ص370، 374

20۔ جی وائی علی اوف (سوویت یونین میں غالب کی تخلیقات کا مطالعہ) غالب شناسی اور نیاز و نگار، ص364

21- بابا جان غفاروف (سوویت یونین میں غالب کی مقبولیت) غالب شناسی اور نیاز و نگار، ص 374
22- ای۔ چیلی شئیف (19ویں صدی کا ہندوستانی ادب اور مرزا غالب) غالب شناسی اور نیاز و نگار، ص 394
23- ایل آر گوردن پولنسکایا (غالب کا فلسفہ حیات) غالب شناسی اور نیاز و نگار، ص 401، 407
24- غضنفر علی اوف (فارسی میں غالب کا رنگِ تغزل) غالب شناسی اور نیاز و نگار، ص 412
25- این پریگرینا (غالب اور اقبال ... اسالیب کا تقابلی جائزہ) غالب شناسی اور نیاز و نگار، ص 434
26- ڈاکٹر شوکت سبزواری (غالب کی شخصیت) غالب شناسی اور نیاز و نگار، ص 440

غالب نے شاعری کی ماہیت اور اس کی حیثیت کا از سرِ نو جائزہ لیا اور اس کے نئے معیار متعین کیے۔ غالب کے نزدیک شعر کا منصب یہ ہے کہ وہ انسان کے ذوقِ جمیل کو نکھارے، اس کی روح کو مسرت بخشے اور اس پر اس انجانے حسن کو بے پردہ کر دے جو ہے تو یہیں مگر اس تک عام نظر کی رسائی نہیں ہوتی۔ غالب نہ کہا کہ شعر نہ کلامِ موزوں ہے، نہ سخن کا پردہ بلکہ وہ "حسن" ہے اور جب شاعر شعر کہتا ہے تو وہ تخلیقِ حسن کا کارنامہ انجام دیتا ہے۔

وہی اک بات ہے جو واں نفس، یاں نکہتِ گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

(ڈاکٹر ظہیر فتح پوری۔ "غالب، روایت اور جدیدیت" فنون، غالب ایڈیشن۔ ص 117، لاہور 1969ء)

"بازیافتِ غالب"، ایک تاثر

پروفیسر شوذب کاظمی

ڈاکٹر سید معین الرحمن کے بارے میں مرحوم سجاد باقر رضوی کا یہ جملہ کلیدی حیثیت رکھتا ہے کہ "معین صاحب نے تحقیق جیسے خشک کام کو تخلیق کی شادابی عطا کی ہے۔" یہ شادابی ڈاکٹر معین الرحمن کی تالیف "بازیافتِ غالب" میں اپنی مخصوص مہک کے ہمراہ جلوہ گر ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ ڈاکٹر معین الرحمن کی غالب شناسی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اگر انہیں غالبیات کی مختلف اور متنوع سمتوں کا رمز شناس اور قطب نما کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ ایک مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کے ہنر سے واقف ہیں چنانچہ اگر بازیافتِ غالب کے کچھ رنگ آپ کو تحقیق نامہ 6 میں بھی جھلکتے دکھائی دیں تو حیران مت ہوئیے گا کہ وہ غالب شناسی کو ہر اس میڈیا سے عام کر دینا چاہتے ہیں جو میسر آ جائے یہی وجہ ہے کہ گذشتہ مارچ سے 1998ء کے اوائل میں جو نمائشِ کتب برغالب لاہور میں منعقد ہوئی اس میں 1969ء سے 1982ء تک کے چودہ پندرہ برسوں میں ڈاکٹر سید معین الرحمن کے ذاتی ذخیرۂ غالبیات میں چار سو کے لگ بھگ کتب کے ساتھ ساتھ جو کچھ بھی تھا اسے عوام کے لئے بغرضِ استفادہ عام کر دیا۔ یہی نہیں کہ اس میں محض تصانیفِ غالب کی اشاعتیں تھیں بلکہ نظم و نثرِ غالب کے مختلف انتخاب، نگارشاتِ غالب کے تراجم، کلامِ غالب کی تشریحات، غالب کے اسلوبِ نثر کی ادعائی کاوشیں، غالب کی ؟ میں نعت و غزلیات کے مجموعے، غالب کے عہد و حیات پر مبنی ڈرامے، ناول، رپورتاژ، اشاریے، کتابیات سبھی کچھ شامل تھا۔

ڈاکٹر سید معین الرحمن خود بھی ایک قد آور غالب شناس اور ماہرِ غالبیات ہیں۔ اس لحاظ سے وہ غالب کے قدر دانوں کے قدر دان بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نئی صدی کی آمد پر ان کے زیر سایہ کئی نسلیں پروان چڑھ رہی ہیں جو ان کی طرح غالبیات کو بجا طور پر ادبیات کا ایک مستقل شعبہ تصور کرتی ہیں۔

ڈاکٹر معین الرحمن کی غالب شناس حلقوں میں ہر دلعزیزی کا ایک باعث یہ بھی ہے کہ وہ معمولی سے معمولی لکھنے والے کو نظر انداز نہیں کرتے اور نہ ہی نئے اہلِ قلم کی ایسی کاوشوں کو بغیر

اعتراف کئے قبول کرتے ہیں جو انہوں نے غالبیات کے کسی نئے رُخ کو متعارف کروانے کے لئے کی ہوں البتہ اپنے حواشی کے ذریعے کم مدلل کوششوں کو اسی معیار سے ہمکنار کرتے رہتے ہیں جو غالب شناسی کے ذیل میں ہونا چاہیے چنانچہ ان کا یہ عمل حد درجہ حوصلہ افزائی عطا کرتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ نفسا نفسی اور مصروفیت کے اس دور میں ان سے مہمیز پا کر نئی نسل اپنے تہذیبی ورثے اپنے ادبی سرمائے کو محفوظ کرنے کی مساعی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی ہے۔ یہ ادبی سرمایہ محفوظ ہی نہیں ہو رہا بلکہ عام بھی ہو رہا ہے۔ کسی بڑے علمی موضوع سے عشق کی علامت یہ نہیں کہ آپ کے پاس اس موضوع سے متعلق کیا کچھ ہے بلکہ عشق کا تقاضا تو یہ ہے کہ اس کی خوشبو سے باغ علم و ادب کا کوئی گوشہ خالی نہ رہے۔ کوئی تشنہ ذہن سیراب ہونے سے نہ رہ جائے۔

ڈاکٹر معین الرحمن ایسے غالب کے سچے اور کھرے طرفداروں کا دم پر غنیمت ہے جو پرواز سے تنگ کر نہیں گرتے بلکہ راہ کی پرخاریاں انہیں اور حوصلہ دیتی ہیں۔ آفاق کی دھندلاہٹیں ان کے پروں میں تازہ توانائی بھر دیتی ہیں۔ ملاحظہ کیجئے صرف رواں سال میں غالبیات کے حوالے سے نئی اور تازہ ایڈیشنوں پر مبنی کتب کی تعداد دہائی سے متجاوز ہے ادب کے دوسرے شعبوں پر آنے والی ان کی تصنیفات کا تو ذکر ہی نہیں۔ اور پھر صرف تعداد پر منحصر نہیں تحقیقی، تنقیدی اور تخلیقی معیار کے اعتبار سے ایک متوازن سلسلہ ہے ایک ربط ہے جو ڈاکٹر سید معین الرحمن کی تصنیفات میں جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ ایک شہد ہے جو چھوٹی مکھی کا شہد ہے۔ ڈاکٹر معین الرحمن نے بھی موضوع سے متعلق چھوٹی چھوٹی حقیقتوں کو کائناتِ غالب سے کشید کر کے بڑی حقیقتوں میں تبدیل کر دیا ہے۔

غالب پیمائی پر محیط ایک تہائی صدی کا سفر "بازیافت غالب" کی صورت میں سامنے آیا ہے ڈاکٹر معین الرحمن اس موضوع میں آج بھی روز اول کی سی کشش محسوس کرتے ہیں۔ بیس عنوانات پر مشتمل "بازیافتِ غالب" دو بڑے حصوں پر مشتمل ہے پہلے میں چند غالبیاتی نوادر اور معدوم نگارشات کی باز نوشت ہے اور دوسرے میں کچھ اشاریاتی مطالعات غالب شامل ہیں۔

پہلے حصہ "چند غالبیاتی متعارفات" کی نو تحریریں پرانے جرائد یا دیگر نادر ماخذ سے مستعار ہیں۔ انہی تحریروں میں سے پہلی تحریر 1878ء کی ہے اور آخری تحریر تیس برس پہلے کے ایک روزنامہ سے تلاش کی گئی ہے۔ 1878ء یعنی کم و بیش سوا سال پہلے کی نادر و نایاب تحریر ماہرِ غالبیات ڈاکٹر ایس ایم اکرام (1908ء - 1973ء) کے گلگشن سے دریافت ہونے والا ایک

تراشہ ہے جو پانچ صفحات پر مشتمل ہے اور بلیک وڈز ایڈنبرگ میں ماہ جنوری میں شائع ہوا۔ اس تراشے میں غالب کے مربی، عہدِ غالب کی دہلی کے گورنر ولیم فریزر کے قتل کی روداد کہانی کے طور پر بیان ہوئی ہے۔ اس معاملے سے دلچسپی "حیات غالب کا ایک حساس باب" ہے اس لئے بازیافت غالب میں اسی عنوان سے شامل ہے ڈاکٹر معین الرحمن نے اس تراشے کا اردو ترجمہ بھی افسر ساجد کے شکریہ کے ساتھ شامل کتاب کیا ہے اور اصل متن کا عکس بھی فراہم کیا ہے۔

غالب پر انیسویں صدی کی ایک اہم تحریر زیر عنوان سید احمد شفیع فرید آبادی کا سو برس سے زیادہ قدیم مضمون "مرزا اسد اللہ خان غالب" نادرات غالب میں ایک اہم اضافے کے طور پر شامل کتاب ہے۔ مضمون کے مصنف نواب علاؤالدین احمد علائی (1833۔ 1884 ء) کے داماد تھے اور اس حوالے سے غالب کے قرابت دار بھی۔ ان کے ایک سہرے کا عکس بھی مضمون سے پہلے دیا گیا ہے۔ حواشی میں ڈاکٹر سید معین الرحمن نے اہم نکتوں کی وضاحت بالصراحت کی ہے۔

"غالب کے شاگرد میر مہدی مجروح" منشی وجاہت حسین صدیقی کی نوے برس پرانی تحریر ہے یہ قیمتی نگارش مخزن مئی 1907ء کی اشاعت سے دریافت ہوئی۔ صاحب مضمون داغ کے شاگرد تھے۔ مضمون میں میر مہدی مجروح کی شخصیت اور شاعری سے متعلق بہت سی معلومات ملتی ہیں۔

غالب پر "راوی" کی اولین منظوم نگارش متعارفہ انبساط امین عباسی دراصل غالب کی غزل پر پچاسی برس قدیم خمسہ لالہ پران ناتھ دتہ کا تعارف ہے خمسہ کا عکس بھی شامل کتاب کیا گیا ہے خمسہ میں غالب کے درج اشعار تخمیس کئے گئے ہیں۔

دوست غم خواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا
بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا
حضرتِ ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھاویں کہ سمجھائیں گے کیا
آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چُھٹ جائیں گے کیا
خانہ دارِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتارِ بلا زنداں سے گھبرائیں گے کیا
ہے اب اس معمورے میں قحطِ غم الفت اسد
ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہیں کھائیں گے کیا

یہ خمسہ رسالہ راوی گورنمنٹ کالج لاہور مارچ 1912ء کی اشاعت سے دریافت ہوا۔
غالب پر رفیق خاور کی پینسٹھ برس پرانی دو نگارشات کو بھی انبساط امین عباسی نے متعارف کروایا ہے ان میں سے ایک "غالب کی ذہنیت" 1932ء اور دوسری "موازنہ ذوق و غالب" 1933ء ہے ان میں سے پہلی راوی اور دوسری خاقانیٔ ہند لاہور میں شائع ہوئی تھی۔
غالب سے متعلق ن-م راشد کی دو یادگاریں "اردوئے معلّٰی" اور "بات چیت" ڈاکٹر سید معین الرحمن نے دریافت کر کے حواشی کے ساتھ شاملِ بازیافتِ غالب کی ہیں اور ان میں سے ایک میں درج اس شعر کے بارے میں بتایا ہے کہ یہ غالب کا نہیں ہے۔

جس میں لاکھوں برس کی حوریں ہوں
ایسی جنت کا کیا کرے کوئی

"بیگم مرزا غالب کی کہانی" پروفیسر حمید احمد خان کی بیان کردہ ہے۔ اور ڈاکٹر معین الرحمن کی مرتب کردہ کتاب "غالب شخصیت اور شاعری" کے ذکر کے ساتھ شامل کتاب ہے جو حمید احمد خان کی تحریروں کا مجموعہ ہے۔ یہ مضمون ریڈیو لاہور سے 23 اپریل 1942ء کو نشر ہوا تھا۔

غالب سے متعلق نصف صدی پرانی ایک نادر اور معدوم نگارش ڈاکٹر آفتاب احمد کی ہے جو "غالب اور بجنوری" کے عنوان سے ادب لطیف کی 1945ء کی اشاعتوں میں سے ایک میں شائع ہوئی تھی۔ یہ مضمون نگار کی غالب پر اوّلین تحریر تھی۔
"مستقبلیاتِ غالب" جمیل الدین عالی کا تحریر کردہ غالب کا ایک دور بینی مطالعہ ہے۔
بازیافتِ غالب کے دوسرے حصے میں گیارہ عنوانات قائم کر کے چند اشاراتی مطالعاتِ

غالب کی جانب رہنمائی کی گئی ہے سب سے پہلے رسالہ ماہ نو کا پچاس سالہ جزوی اشاریہ غالب ہے جس میں 188 لکھنے والوں کے 267 رشحاتِ قلم کو موضوع بنایا گیا ہے اور بنیادی اور ثانوی ماخذات بھی درج کئے گئے ہیں۔ دوسرے نمبر پر اسی رسالے کا 1997ء تک انتخاب، تیسرے نمبر پر اسی رسالے کی تازہ اشاعت مارچ 1998ء کا مفصل ذکر ہے۔ چوتھے اور پانچویں عنوانات رسالہ راوی سے متعلق ہیں۔ پہلے پچاس سالہ غالب نما اور پھر تازہ شمارہ غالب مئی 1998ء کا ذکر ہے۔ چھٹے نمبر پر غالبیات ڈاکٹر فرمان فتحپوری کا اشاریہ مرتب کیا گیا ہے۔ ساتویں نمبر پر ماہر غالبیات گپتا رضا کی تالیفات کا اشاریہ نما درج ہے اگلے دو عنوانات میں ان کی دو غیر مطبوعہ تالیفات اور ان کے ذخیرہ غالبیات اور غالب شناسی پر سیر حاصل مواد فراہم کیا گیا ہے۔ آخری دو عنوانات میں غالب پر 1969ء سے 1982ء تک کی مطبوعہ کتابوں کا ذکر ہے جو ذخیرۂ غالبیات سید معین الرحمن کا اہم حصہ ہے۔ اور غالب سیمینار اور نمائش کتب دسمبر 1997ء کا احوال مفصل ہے۔ دوسرے حصے کی ترتیب میں انبساط امین عباسی، عظمت رباب، ندرت سجاد، عاصمہ وقار نے ڈاکٹر سید معین الرحمن کی بھرپور معاونت کی ہے۔

الغرض "بازیافت غالب" غالبیات میں ایک اہم اضافہ ہے۔ بلاشبہ ڈاکٹر معین الرحمن کے اسلوب خاص کی شادابی نے اسے تحقیق و تنقید کا شاہکار اور خاصے کی چیز بنا دیا ہے جسے ارباب علم اکیسویں صدی میں بھی بطور حوالہ کام میں لاتے رہیں گے۔

کتابیات

1۔ سید معین الرحمن ڈاکٹر "بازیافتِ غالب" الوقار پبلی کیشنز لاہور 1998ء

2۔ سید معین الرحمن ڈاکٹر مدیر تحقیق نامہ۔6 شعبہ اردو گورنمنٹ کالج لاہور 1998ء۔

غالب ہمارے سامنے مربوط، منظم اور زندہ استعارہ ہے اور ہم اس کے سامنے ٹوٹے پھوٹے بکھرے ہوئے بے شمار نشانات ہیں۔ ہمیں غالب کا ساتھ دینے کے لئے خود کو سمیٹنا ہوگا اور خود کو استعارہ بننے سعی کرنا ہوگی۔

(سجاد باقر رضوی)

غالب کے خطوط اور سرائیکی زبان

پروفیسر شوکت حسین مغل

اردو زبان نے جن مقامی اور غیر ملکی کئی زبانوں کی خوشہ چینی کی ہے جس میں سرائیکی زبان بھی شامل ہے۔ پروفیسر شوکت حسین مغل نے اردو زبان میں سرائیکی زبان کے الفاظ و مرکبات اور محاورات کے استعمال اورمشابہات کے نقش ہائے رنگارنگ کو تلاش کرنا اپنی قلمی کاوش کا مقصود بنا رکھا ہے۔ اس سلسلے میں آپ نے زبانِ دلی ، باغ و بہار، دیوانِ درد، دیوانِ میر، دیوانِ غالب، مثنوی سحر البیان، نظیر اکبر آبادی، رانی کیتکی کی کہانی اور ڈپٹی نذیر احمد کی نثر نگاری وغیرہ میں ایسے الفاظ و افعال اور محاورات و مرکبات تلاش کئے ہیں جو لہجے اور تلفظ کے معمولی فرق کے ساتھ اردو زبان میں مستعمل ہیں۔ ذیل میں اس نوع کی ایک کاوش خطوطِ غالب کے حوالے سے پیش کی جاتی ہے۔

ادارہ

غالب 1797ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے اور 1869ء میں دہلی میں وفات پا گئے۔ انہوں نے ساری زندگی دہلی میں گذاری ان کی شاعری اور نثر میں دہلی کی خاص زبان اور روزمرہ موجود ہے جس پر فارسی کے اثرات نمایاں ہیں۔

غالب کی بیشتر نثر ان کے خطوط پر مشتمل ہے۔ غالب جدید اردو کے بانی سلاست کے سالار اور سادگی کے موجد ہیں۔ انہوں نے نثر کو جو رنگ عطا کیا اس کی تقلید بعد کے ادبا، نے کی، ان کی نثری زبان میں موجود سرائیکی زبان کے اثرات جو دہلی کی زبان پر حالات نے ثبت کئے تھے بخوبی دیکھے جا سکتے ہیں، ذیل میں چند ایسے ہی الفاظ، افعال اور تراکیب کی نشاندہی کی جارہی ہے۔

میرے سامنے غالب کے خطوط پر مشتمل اردوئے معلیٰ کی وہ تین جلدیں ہیں جو مجلس ترقی ادب لاہور نے 1961ء میں شائع کی ہیں، اس لئے حوالے کے طور پر ان جلدوں اور خطوط کے نمبر ساتھ دیئے جارہے ہیں۔

سرائیکی الفاظ	خط کے الفاظ	خطوط کے فقرات
اُگار کے	اوگاہ کے (وصول کر کے)	واصل خاں نامی ایک سپاہی تمہارے دادا کا پیش دست تھا وہ کٹروں کا کرایہ اوگاہ کر ان کے پاس جمع کراتا تھا۔ (حصہ اول خط نمبر 375)
آبری	آبری (جلد کے اوپر پھولدار کاغذ)	اور انگریزی آبری جلدیں الگ الگ۔ (حصہ اول خط نمبر 328)
بدلی	بَدلی (تبادلہ)	برخوردار میرزا عباس کی بدلی کی خبر میں نے پہلے ہی سے سنی ہے، مگر یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں گئے۔ (حصہ سوم خط نمبر 42)
بھرنا بھرن	بھرنا بھرنا (نقصان پورا کرنا)	پر دیکھا چاہیے کہ صاحب مطبع کو کیا منظور ہے اگر وہ کاغذ کی قیمت کا عذر کریں تو ہم پانچ سات روپے سے اور بھی ان کا بھرنا بھریں گے۔ (حصہ اول خط نمبر 292)
پُتر	پتر (بیٹا)	برہما کا پُتر دو دن بیمار پڑا تیسرے دن مر گیا۔ ہے ہے! کیا نیک بخت غریب لڑکا تھا۔ (حصہ اول خط نمبر 328)
پَت رہن	پَت رہنا (عزت بچنا)	خزانے سے روپیہ آ گیا ہے میں نے آنکھ سے دیکھا تو آنکھیں پھوٹیں۔ بات رہ گئی۔ پَت رہ گئی۔ حاسدوں کو موت آ گئی۔ (حصہ اول خط 195)
پھیر	پھیر (چکر گردش، نحوست)	رپورٹ کی روانگی کی دیر ہے چند روز اور بھی قسمت کا پھیر ہے (حصہ سوم خط نمبر 54)
پیدا کرن	پیدا کرنا (دولت کمانا، جائیداد بنانا)	بھائی! تم سنو تو سہی۔ تمہارا دادا بہت کچھ پیدا کر گیا ہے۔ علاقے مول لئے تھے اور زمیندارا اپنا کر لیا تھا۔ (حصہ اول خط نمبر 375)

سرائیکی الفاظ	خط کے الفاظ	خطوط کے فقرات
تُرٹ تُرٹ گن	ٹوٹ ٹوٹ گئے (بار بار ٹوٹے)	اللہ اللہ! قلعے میں اکثر اور شہر میں بعض، وہ شاہجہانی عمارتیں ڈھائی گئی ہیں کہ کدال ٹوٹ ٹوٹ گئے۔ (حصہ اول خط نمبر 333)
ٹکے دی آمد نئیں	ٹکے کی آمد نہیں (کوئی آمدنی نہیں)	اس کے پاس ایک پیشہ نہیں، ٹکے کی آمد نہیں (حصہ اول خط نمبر 453)
چکاون	چکانا (طے کرانا۔ ختم کرانا)	جھگڑا ان کی طرف سے ہے تم اس کو یوں چکاؤ۔ (حصہ اول خط نمبر 434)
خُرمے	خُرمے (کھجور کا پھل)	خدا جانے وہ خُرمے کس مزے کے ہوں گے۔ (حصہ اول خط نمبر 469)
دال روٹی	دال روٹی (معمولی خوراک/دعوت)	اور ہماری دال روٹی قبول کرو گے؟ (حصہ اول خط نمبر 442)
دَھپالگن	دھپالگنا (دھکا لگنا، نقصان ہونا)	اگر منشی بہاری لال میرا اور شہاب الدین کا دوست نہ ہوتا تو پچاس روپیہ کا مجھ کو دھپا لگتا۔ (حصہ اول خط نمبر 451)
ڈھائی گزا	ڈھائی گزا (اڑھائی گز کا)	میں نے ایک ولایتی چغہ اور ایک شال رومال ڈھائی گزا دلال کو دیا تھا اور اس وقت روپیہ لے کر آیا تھا۔ (حصہ اول خط نمبر 97)
ڈِھل نہ کرو	ڈھیل نہ کرو (تاخیر نہ کرو)	صاحب اب کام میں ڈھیل نہ کرو۔ کام میں تعجیل کرو (حصہ اول خط نمبر 290)
سینکڑا	سینکڑا (ایک صد)	جانتا ہوں کہ وہ سینکڑا پورا کرنے کی فکر میں ہوں گے۔ (حصہ اول خط نمر 134)
شادی کماون	شادی کمانا (کسی کا شادی پر رقم حاصل کرنا)	گویا میں نہ تھا کہ اپنا سازوسامان لے کر چلا جاتا۔ دوجانے جا کر شادی کماؤں اور پھر اس فصل میں کہ دنیا کرہ نار ہو۔ (حصہ اول خط نمبر 429)

سرائیکی الفاظ	خط کے الفاظ	خطوط کے فقرات
فرمہ	فرمہ (طباعت کی پلیٹ)	اگر ایک فرمہ نثر کا باقی تھا تو اب قصیدہ چھاپا جاتا ہوگا۔ (حصہ اول خط نمبر 132)
قسمت آلی	قسمت والی (خوش قسمت)	میں یوں سمجھتا ہوں کہ یہ چھوکری قسمت والی اور حرمت والی تھی۔ (حصہ اول نمبر 237)
لہناں	لہنا (لینا۔ واجب الوصول)	تم سچ کہتے ہو۔ بھائی اللہ کی غم خواری اور مدد گاری کا کیا کہنا ہے۔ مگر انور سے مجھ کو لہنا نہیں، یاد رکھنا کہ وہاں سے مجھے کچھ نہ آئے گا۔ (حصہ اول خط نمبر 247)
مدت/مدد	مدد (امداد، تعاون)	اخیر خط پر صاحب کمشنر بہادر نے حکم دیا کہ سائل کو بطریق مدد خرچ سو روپے مل جائیں۔ (حصہ اول خط نمبر 206)
مُہورت	مہورت (نیک گھڑی)	دیکھئے شہر بسنے کی کون سی مہورت ہے۔ (حصہ اول خط نمبر 205)
ہُشیار تھیون	ہوشیار ہونا (نیند سے جاگنا)	جاگ اٹھا، تڑپا کیا، پھر سو گیا۔ پھر ہوشیار ہو گیا۔ (حصہ اول خط نمبر 326)

غالب کی نثر میں ان تمام روایات کا عکس نظر آتا ہے جو برصغیر میں ظہوری کے عصر سے خاص رنگ ڈھنگ اختیار کرتی ہوئی آگے بڑھیں اور انیسویں صدی کے ہندوستان کو ورثے میں ملیں۔ ان کی نثر میں مختلف اسالیب کی خصوصیات کے ساتھ انفرادی رنگ و آہنگ کا احساس ہوتا ہے .... یہ غالب کا ذاتی آہنگ و اسلوب ہے جو عہدِ مغلیہ کی تہذیبی زندگی اور ادبی روایات کا امین ہوتے ہوئے نئے تجربوں کی جانب راہنمائی کرتا ہے۔ یہ عظمتِ فن جہاں تک عہدِ مغلیہ کا تعلق ہے غالب کے علاوہ ہندی نژاد نثر نگاروں میں کسی کے ہاں نظر نہیں آتا۔

(لطیف اللہ، غالب اور سبک ہندی)

گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن میں ایک سیمینار بعنوان
غالب ایک عہد ساز شخصیت

15 فروری اتوار کا دن غالب کی 129ویں برسی کے موقع پر ایجوکیشن کالج کے ممتاز ادیب اور دانشور پرنسپل جناب طاہر تونسوی صاحب نے اگلے دن یعنی سوموار کو "غالب کا دن" کے طور پر منانے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لئے بھرپور تیاریاں کی گئیں۔ ممتاز ادیبوں، نقاد، دانشور اور محققین نے اس میں شرکت کی۔ کالج میں بھرپور نظم و ضبط نے طلبہ کی سیمینار ہال میں حاضری کو یقینی بنا دیا۔ چنانچہ تل دھرنے کو جگہ نہ رہی۔

اس تقریب کا اہتمام کالج کی "غالب اکادمی" نے کیا جس کے عہدیداران میں جناب ڈاکٹر شمیم ترمذی صاحب صدر، جناب شوکت مغل صاحب نائب صدر اور طلبہ میں سے سیکرٹری کے فرائض حماد الرحمن نے سرانجام دیئے۔ ڈاکٹر مختار ظفر صاحب نے انتظامی معاملات سنبھالے ہوئے تھے۔ ان کی چابکدستی اور تیز عملی قابل داد و دید تھیں۔ تلاوت کلام پاک اور نعت اقدس کے بعد طالب علم کامران صدیقی نے اپنا مقالہ بعنوان "غالب، اردو اور قومی شناخت" نہایت جوش خطابت سے پڑھا اس میں انہوں نے دو باتیں بے انتہا اہم کہیں کہ سلطان ٹیپو کے دور میں اردو زبان ہندوستان میں اگر اتنی ہی طاقتور ہوتی جتنی غالب کی کاوشوں کے بعد ہو چکی تھی تو انگریز کے لئے ہندوستان ناقابل تسخیر قلعہ بن گیا ہوتا۔ اس کے علاوہ انہوں نے کہا کہ قوموں کی روحانی زندگی جرأت و بے باکی کے ساتھ تفکر سے ہی قائم رہتی ہے جس کی اولین روایت غالب نے پیش کی پھر اقبال نے اسے آگے بڑھایا۔ ان کے بعد طالب علم محمد سعدی نے غالب کی غزل گا کر سنائی۔ پھر طالب علم مجاہد حسین قمر نے غالب پر ایک جامع مقالہ پڑھا جس میں ان کی ظرافت کی مثالیں پیش کی گئیں۔ انہوں نے محفل کو کشت زعفران بنا دیا اور غالب کی ظرافت نے صدیوں بعد بھی لوگوں کو ہنسنے پر مجبور کر دیا۔

ان کے بعد طالب علم شہباز حمید نے غالب کی ایک غزل ترنم سے پڑھی جسے بے حد سراہا گیا۔ پھر حبیب اللہ طالب علم نے غالب کی شاعرانہ عظمت پر مختلف اقتباسات کا حوالہ دے کر روشنی ڈالی۔ اب غالب کی مدح میں ذاتی غزل پیش کرنے کے لئے خالد نعیم تشریف لائے۔ ان کی

غزل بے حد پسند کی گئی۔ پھر طالب علم مبشر حسین نے غالب کی عظمت کو زبردستی تسلیم کرانے کے سے انداز میں ایک روایتی تقریر جھاڑ دی اور اپنے مخالفین کو گویا بزعم خود چپ کرا دیا کہ غالب واقعی عظیم تھا۔ ان کے بعد طالب علم محمد سلیم نے بھی مختصر سے مقالہ پڑھا اب مشہور شاعر خادم رزمی صاحب اسٹیج پر تشریف لائے اور ایک غزل اور چند اشعار کے ٹکڑے پیش کئے۔

زیست اک کرب کے سوا کیا ہے

یہ عطا ہے تو پھر سزا کیا ہے

بیٹھ کر آج اپنے ملبے پر

کل کے بارے میں سوچنا کیا ہے

ان کے بعد ڈاکٹر شمیم ترمذی صاحب نے "غالب کی نفسیات" پر ایک سیر حاصل مقالہ پڑھا جس میں غالب کی انانیت ایک ایسے تحفے کے طور پر سامنے آئی جس نے غالب کی شخصیت اور فن کو کبھی کمزور نہ ہونے دیا۔ اب مہمان خصوصی ڈاکٹر محمد امین صاحب نے انہیں مشرقی دانش کا نمائندہ شاعر کے طور پیش کیا اور اقبال کی طرح زندگی کا شاعر قرار دیا۔ انہوں نے کہا:

"ہر شاعر پر شعری واردات اور تجربات کی نوعیت ایک سی ہوتی ہے۔ مگر اسلوب ہر ایک کا اپنا ہوتا ہے جو ہر کسی سے مختلف ہوتا ہے۔"

پھر ادارے کے سربراہ جناب ڈاکٹر طاہر تونسوی صاحب نے ایک مقالہ بعنوان "پاکستان میں غالب شناسی کی روایت" پڑھا۔ اور اب تک غالب پر جو تنقیدی تحقیقی کام ہوا اس پر مختصر روشنی ڈالی۔ انہوں نے غالب کو ایسی استثنائی شخصیت قرار دیا جن کے فن اور شخصیت کو دوام حاصل ہے۔ آخر صدر محفل جناب لطیف الزماں صاحب تشریف لائے۔ انہوں نے غالب کی شخصیت پر مختلف اکابرین کی آراء پیش کی اور خاص طور پر رشید احمد صدیقی کی رائے تفصیلاً پڑھی۔

تقریب کے اختتام پر طالب علموں کی پوزیشن کا اعلان کیا گیا۔ جس میں مقالہ پڑھنے والوں میں پہلے نمبر پر کامران صدیقی اور دوسرے نمبر پر مجاہد حسین قمر کا نام آیا۔ ترنم کے ساتھ غزل پیش کرنے میں محمد سعدی نے پہلی اور شہباز حمید نے دوسری پوزیشن حاصل کی جبکہ غالب کی مدح میں غزل پڑھنے پر خالد نعیم کو خصوصی انعام دینے کا اعلان کیا گیا۔
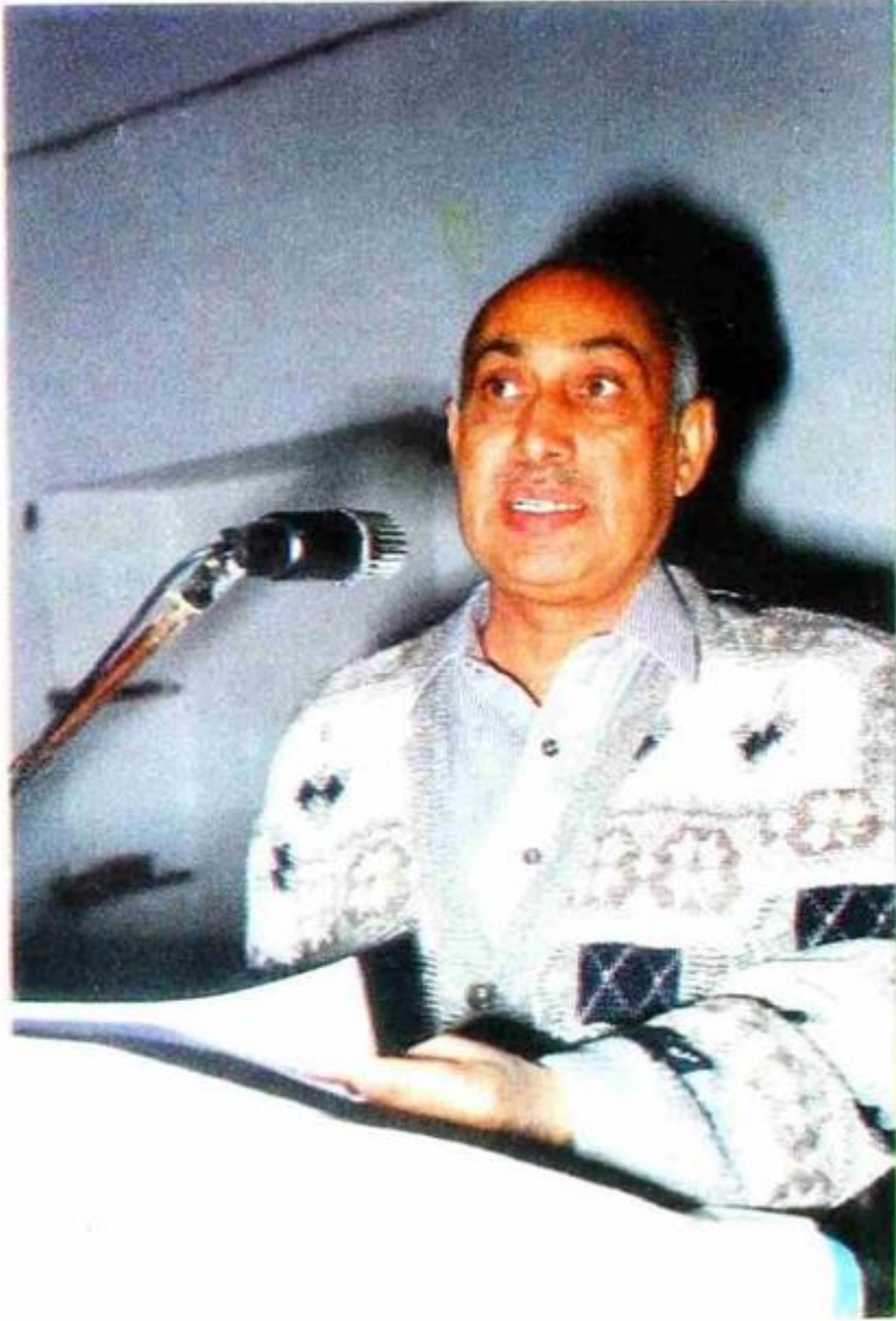
پروفیسر ڈاکٹر طاہر تونسوی' یوم غالب کی تقریب میں اظہار خیال کر رہے ہیں

یوم غالب کی تقریب میں سٹیج کا منظر' پروفیسر ڈاکٹر طاہر تونسوی' پروفیسر لطیف الزماں خاں' پروفیسر محمد امین' پروفیسر شوکت مغل (سیکرٹری بزم غالب
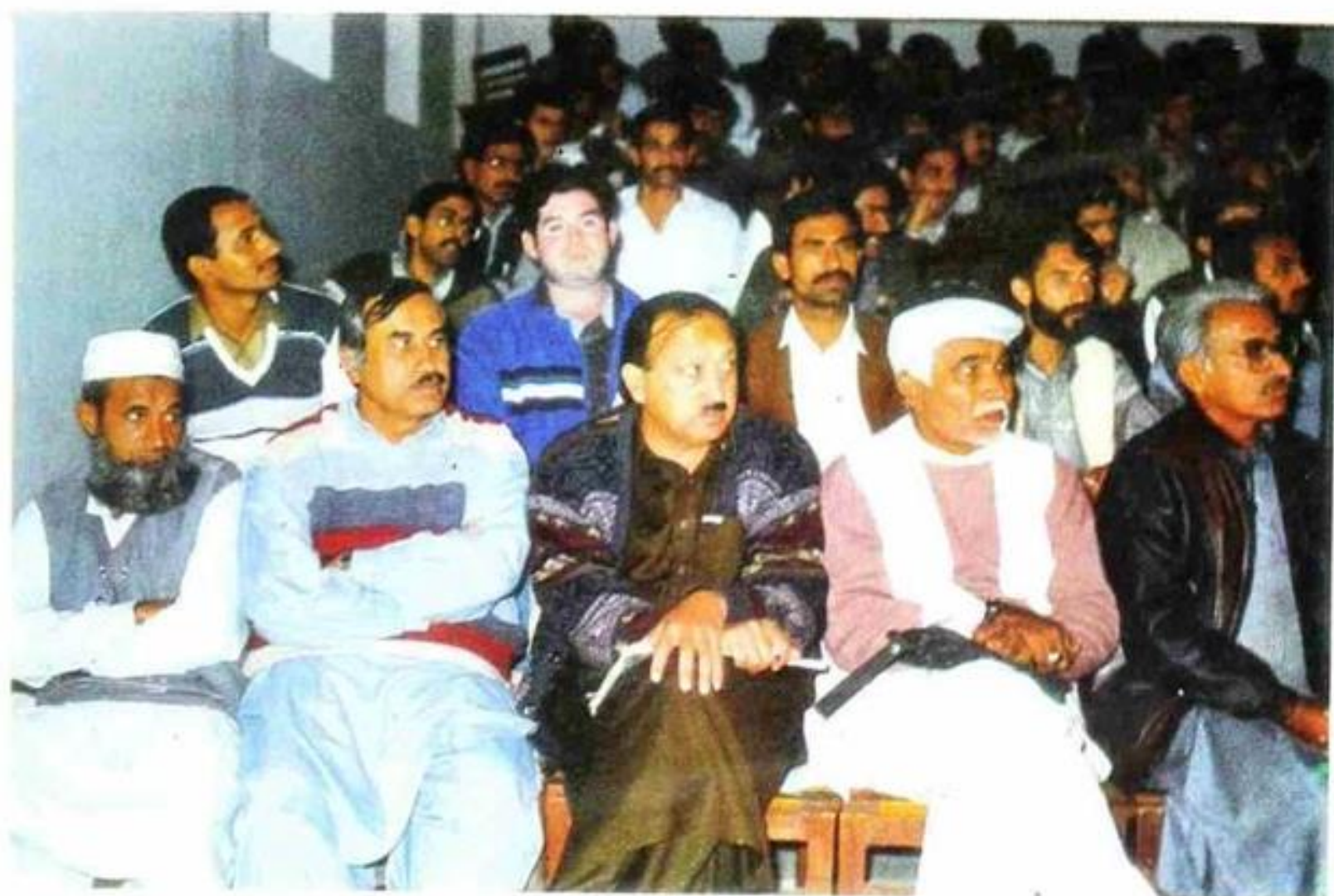
یوم غالب کی تقریب میں اساتذہ اور طلبہ کا انہماک (سامعین کی ایک سائیڈ کا منظر)

یوم غالب کی تقریب میں صدر بزم غالب ڈاکٹر شمیم حیدر ترمذی خطاب کر رہے ہیں

پروفیسر ڈاکٹر مختار ظفر، بزم غالب کی تقریب میں سامعین سے مخاطب ہیں

یوم غالب کی تقریب، ڈاکٹر محمد امین اظہار خیال کر رہے ہیں۔

بتقریب یوم غالب، سیکرٹری بزم، پروفیسر شوکت مغل کا اظہار خیال

گلبانگ غزل

نذر غالب

ڈاکٹر اسلم انصاری

لبم از زمزمہ یاد تو خاموش مباد
غیر تمثال تو نقش ورق ہوش مباد

(غالب)

☆

دلِ سودا زدہ ام عشق فراموش مباد
در رہِ عشق مرا ہمتِ کم کوش مباد
بارِ گل بار نباشد پی تزئین بہار
باغ ویران نشود، شاخ سبکدوش مباد
نقش می بندم و آوای نوی می آرم
آئنہ کور مشو، شہر گران گوش مباد
یا رب این جادۂ پیچانِ وفا گم نشود
ہیچ رہ غیر ازیں راہ سمن پوش مباد
طبعِ من ساز من است و سخنم نغمہ ای من
یا رب این ساز و نواچون لبِ خاموش مباد
ہمچو مینای جنون کزمئی یادت مست است
بی خیالِ رخِ تو آئنۂ ہوش مباد
گر بہار آئنۂ حسن دلآرای تو نیست
شاخ گل پاش و رہ گلکدہ گل پوش مباد
بادہ تریاکِ سمِ عشقِ سمن بو یانست
ہیچ کس بی ضررِ عشق قدح نوش مباد
یار می آید و خونم بہ عروقم بدود
بر رخم زردیٔ اندوہ کم از دوش مباد
شہر ملتان و نوا ریزی ای گلبانگِ غزل!
یا رب این تمکدہ بی مستی و بی جوش مباد!

غالب کی زمین میں ایک غزل

پروفیسر شوذب کاظمی

لوحِ جبیں کو یوں بھی سنوارا کرے کوئی
اپنی زمیں پہ شکر کا سجدہ کرے کوئی

اوڑھا کرے ردائے محبت جو دیس کی
اس کی برابری کا نہ دعویٰ کرے کوئی

خود احتسابیوں کو بسا کر نگاہ میں
نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی

میرا وطن ہے رشکِ ارم اس میں شک نہیں
پالے اسے تو کچھ بھی نہ چاہا کرے کوئی

احسانِ روحِ قائدِ اعظم جو مان لے
احساں کسی کا پھر نہ گوارا کرے کوئی

ایماں، یقین، عزم و عمل اس کی جان ہیں
سکھ پائے گا جو اس کی تمنا کرے کوئی

شوذب وطن کے چاہنے والوں کی خیر ہو
کوئی نہ ہو ملول نہ رویا کرے کوئی

"اگرچہ فاسق و فاجر ہوں مگر وحدانیت خدا اور نبوت خاتم الانبیاء کا بہ دل معتقد اور بہ زبان معترف ہوں۔ خدا تعالیٰ اور رسول ﷺ کی قسم جھوٹ نہ کھاؤں گا۔"
(غالب بنام نواب کلب علی خاں)

گوشۂ ڈاکٹر سلیم اختر

- "شعور و لاشعور کا شاعر، غالب"
پر
ایک گفتگو
شرکاء: احمد ندیم قاسمی
ڈاکٹر خواجہ زکریا
ڈاکٹر سلیم اختر
حسن رضوی
سعید مرتضیٰ زیدی
ڈاکٹر آغا سہیل
سراج منیر
طارق عزیز

- "شعور و لاشعور کا شاعر، غالب"، تجزیہ — ڈاکٹر طاہر تونسوی

- ڈاکٹر سلیم اختر کی نفسیاتی تنقید — ڈاکٹر سہیل احمد

- ڈاکٹر سلیم اختر، بحیثیت نقاد — پروفیسر شوذب کاظمی

پروفیسر ڈاکٹر سلیم اختر

میری تمام گفتگو کھوئے ہوؤں کی جستجو

ڈاکٹر سلیم اختر کی کتاب
"شعور ولاشعور کا شاعر .... غالب"

پر
.... ایک گفتگو ....

(یہ گفتگو "جنگ" لاہور کے ادبی ایڈیشن مورخہ 27 فروری 1985ء کو شائع ہوئی اسے یہاں غالب شناسی کے ذیل میں دوبارہ پیش کیا جارہا ہے۔)

میزبان: حسن رضوی، سعید مرتضیٰ زیدی

شرکاء: احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر آغا سہیل، ڈاکٹر سلیم اختر، سراج منیر، طارق عزیز

حسن رضوی۔ غالب کی ایک سو سولہویں برسی کے موقع پر ہم نے ادارہ "جنگ" کی جانب سے ملک کے معروف دانشوروں کو "جنگ فورم" میں مدعو کیا ہے تاکہ غالب کی شخصیت اور فن پر گفتگو کر کے اس عظیم شاعر کو خراج عقیدت پیش کیا جائے۔ ہمارے آج کے مذاکرے کا موضوع ہے "شعور اور لاشعور کا شاعر ۔ غالب" اس مذاکرے میں شرکت کے لئے جناب احمد ندیم قاسمی، جناب قتیل شفائی، جناب ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، جناب ڈاکٹر آغا سہیل، جناب ڈاکٹر سلیم اختر، جناب سراج منیر اور طارق عزیز کو دعوت دی گئی ہے جبکہ میرے ساتھ میزبان کی حیثیت سے شریک ہیں جناب سعید مرتضیٰ زیدی۔ میں زیدی صاحب سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ مذاکرے کا آغاز کریں۔

سعید مرتضیٰ زیدی۔ جنگ فورم کے تحت نامور شعراء کی برسی منانا ایک مستحسن اقدام ہے پندرہ فروری غالب کی تاریخ وفات ہے اس کی مناسبت سے آج ہم غالب کی برسی منانے کے لئے

ہم یہاں جمع ہوئے ہیں۔ ہمارے آج کے مذاکرے کا موضوع جیسا کہ ابھی حسن رضوی صاحب نے بتایا "شعور اور لاشعور کا شاعر۔ غالب" ہے اس موضوع پر حال ہی میں ڈاکٹر سلیم اختر کی کتاب منظر عام پر آئی ہے جسے فیروز سنز لمیٹڈ نے خوبصورت سرورق کے ساتھ شائع کیا ہے اس کتاب میں دس مقالات شامل کئے گئے ہیں جن میں غالب کو شعور اور لاشعور کا شاعر قرار دیا گیا ہے ہم نے آج کے مذاکرے میں نامور شاعروں، نقادوں اور ادیبوں کو دعوت دی ہے کہ وہ اس کتاب کے حوالہ سے ہمارے قارئین کو بتائیں کہ ایک شاعر بیک وقت شعور اور لاشعور کا شاعر کس طرح ہو سکتا ہے۔ سب سے پہلے جناب احمد ندیم قاسمی سے گزارش ہے کہ وہ اس موضوع پر اظہار خیال فرمائیں۔

احمد ندیم قاسمی۔ غالب اردو غزل کی تاریخ کا پہلا شاعر ہے جس نے شعور اور تعقل کو اپنی فکر کی کائنات میں سے خارج نہیں کیا بلکہ انسانی ذہن کی اس حیرت انگیز قوت سے بھرپور کام لیا اور شعور و وجدان کو باہم یوں آمیخت کیا کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا ناممکن ہو گیا اگر ایسا نہ ہوتا تو غالب اس پائے کے شعر کیسے کہہ لیتا!

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

ہمارے مشہور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے اگر غالب کو شعور اور لاشعور کا شاعر قرار دیا ہے تو یہ ایک ناقابل تردید سچائی ہے لاشعور کی کارفرمائیوں کو تو ہم میر کے زرگر بچوں اور قصاب بچوں کے تھکا دینے والے۔ بیزار کر دینے والے ذکر اذکار سے بھی اخذ کر سکتے ہیں مگر انسانی مزاج کی ایک ایسی صنعت کو جس نے انسان کو غاروں سے نکال کر اور درختوں سے اتار کر کرۂ قمر تک پہنچا دیا ہے یعنی عقل و شعور کو غزل کی سی نازک صنف سخن کا ایک ناگزیر حصہ بنا دینا اولاً غالب ہی کا کام ہے ناگزیر یوں کہ غالب کے بعد حالی اور اقبال، فراق اور فیض، ناصر اور شکیب تک چلے آیئے آپ کو شعور و لاشعور کی جلوہ گری پہلو بہ پہلو نظر آئے گی اور یہ دین غالب ہی کی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی نئی تصنیف "شعور اور لاشعور کا شاعر۔ غالب" اس لحاظ سے ہماری تنقید میں اولیت رکھتی ہے کہ اس سے پہلے غالب کے کلام کا نفسیاتی مطالعہ اکا دکا مضامین میں تو کیا گیا ہے مگر باقاعدہ ایک کتاب کی صورت میں غالب کی سی بڑی شخصیت کا نفسی تجزیہ شاید پہلی بار ہوا ہے۔

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا۔ قاسمی صاحب آپ نے درست فرمایا کہ مختلف ناقدین نے اکا دکا

مضامین لکھ کر غالب کے رجحانات کا نفسیاتی تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے مگر ڈاکٹر سلیم اختر کی انفرادیت اس بات میں ہے کہ انہیں نے پہلی مرتبہ اس شرح و بسط کے ساتھ غالب کے لاشعوری رجحانات پر بحث کی ہے۔

ڈاکٹر آغا سہیل۔ قطع کلامی ہوتی ہے ڈاکٹر صاحب۔ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ نظری تنقید کے ذیل میں اردو میں بہت کم کام ہوا ہے آج سے پینتیس (35) سال پہلے پروفیسر ڈاکٹر شبیہ الحسن نونہروی نے فرائڈ کے حوالہ سے خصوصاً اور یونگ اور ایڈلر کے حوالوں سے عموماً غالب کی شخصیت اور شاعری پر جب ایک خاص زاویہ نظر اختیار کیا تھا تو ادب کے قارئین نے اس سے خصوصی دلچسپی کا اظہار کیا تھا لیکن ہمارے دوست ڈاکٹر سلیم اختر نے تو نفسیات کو اپنا اوڑھنا بچھونا ہی بنا لیا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اب گذشتہ پندرہ بیس سال سے موصوف نفسیات کے بغیر نوالہ بھی نہیں توڑتے تاہم نفسیات کو لقمہ تر بھی نہیں سمجھتے۔ نفسیات کے تمام ممکنہ دبستانوں سے رجوع کرتے رہتے ہیں اور بسا اوقات عسیر الحصول ماخذ تک پہنچ کر تنقید کے نفسیاتی دبستان سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے مشکلات بھی پیدا کر دیتے ہیں جو ان کی ایک عالمانہ ادا ہے۔

حسن رضوی۔ ہماری اردو شاعری میں غالب کی حیثیت مسلم ہے سراج منیر صاحب میں آپ سے یہ پوچھنا چاہوں گا کہ "شعور اور لاشعور کا شاعر۔ غالب" میں صرف غالب کی شخصیت اور فن کا حوالے سے گفتگو کی گئی ہے یا اس میں اس عہد اور ماحول کے شعور اور لاشعور کو تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس میں غالب زندگی بسر کر رہے تھے۔

سراج منیر۔ آپ نے درست فرمایا کہ ہماری شاعری میں غالب کی جو حیثیت ہے وہ محتاج تفصیل نہیں۔ غالب کی ایک تاریخی اہمیت اس اعتبار سے بھی ہے کہ اس کی شخصیت ایک ایسے تہذیبی مرحلے پر واقع ہے تاریخ و تہذیب کے دھارے ٹکراتے ہیں اور مل جل کر ایک نئی سمت اختیار کرتے ہیں یہ وقت عموماً ایسا ہوتا ہے جب بڑے شعراء اور فنکاروں کی ذات میں وہ طوفان پیدا ہوتے ہیں جن سے آگے چل کر قوموں کے نفسیاتی سانچے نمو پذیر ہوا کرتے ہیں اس اعتبار سے غالب کی ذات اور شخصیت کا مطالعہ ہمارے ہاں کم کم کیا گیا ہے۔ غالب کی شاعری کے مطالعوں میں فطری طور پر اس کی نفسیاتی ساخت کی طرف اشارے ملتے ہیں لیکن یہ اشارے یوں کفایت نہیں کرتے کہ جب تک اس شخصیت کو مسلسل ایک خاص زاویہ نظر سے موضوع مطالعہ نہ قرار دیا جائے اس وقت تک اس کے گہرے مضمرات سامنے نہیں آسکتے۔

ڈاکٹر سلیم اختر کی کتاب "شعور اور لاشعور کا شاعر۔ غالب" محض ایک شخصیت پر ہی

کتاب نہیں بلکہ یہ ایک پوری تہذیب کے شعور و لاشعور اور ان کے تخلیقی ربط سے متعلق ہے
ڈاکٹر صاحب نے اردو میں نفسیاتی دبستان کو جس طرح رواج دیا اور تنقید میں اس علم کو جس تخلیقی
مہارت کے ساتھ برتا وہ بھی کوئی تفصیل طلب موضوع نہیں اس لئے اس میدان میں ان کی حیثیت
مسلم ہو چکی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ کتاب ایک دو نشستوں کی تخلیق نہیں بلکہ اس کے پیچھے
بیس برسوں میں ہونے والی ذات کی پوری نمو شامل ہے۔ جب ایک شخص کسی موضوع کی طرف
بار بار پلٹ کر جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ موضوع اس کی ذات میں کسی گہری سطح پر اثر
انداز ہے غالب کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کی یہ کتاب اس صورتحال کی آئینہ داری کرتی ہے۔
معاشرے میں غالب کو دیکھنے کے جو انداز وجود میں آئے فنون لطیفہ نے جس طرح غالب کی
شخصیت کو دیکھا یہ سب کچھ اس کتاب کے مختلف مضامین میں زیر بحث آیا ہے اور اس طرح
معاشرے اور ادبی فضا کے ساتھ غالب کا تخلیقی ربط پورے طرح زیر بحث آگیا ہے۔

احمد ندیم قاسمی۔ میں سمجھتا ہوں کہ نفسیات ایک ایسا علم ہے جس کی حدود کو اگر متعین نہ
رکھا جائے اور اسے بے لگام کر دیا جائے تو تخلیقی کائنات کے مضمرات میں بھی مداخلت کرنے سے
باز نہ آئے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کو اس کا علم ہے چنانچہ انہوں نے شروع ہی میں وضاحت کر دی ہے
کہ ان کی رائے میں نفسیات کو محدود رکھنا چاہئے اور کسی خصوصی مثال سے عمومی نتائج اخذ نہیں
کرنے چاہئیں اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ غالب کی نفسیات کا مطالعہ کرنے کے لئے بھی اس
کے عصر اور اس عصر کے معاشرے کے تناظر میں رکھ کر پرکھنا چاہیے اس حقیقت کو نظر انداز
نہیں کرنا چاہیے کہ اس دور کے معاشرتی معیاروں کے مطابق وہ ایک مرتبہ و مقام والے خاندان کا
فرد ہونے کے باوجود مرتبہ و مقام سے محروم ہوتا تھا اور اگر اس نے قصیدے لکھے تو یہ اس کی خوشامد
پسندی نہیں تھی بلکہ یہ بھی اس دور کی روایت کے علاوہ ضرورت بھی تھی اس صورتحال میں غالب
کی نفسیات کا اتنا دخل نہیں تھا جتنا معاشی جبر اور معاشرتی دباؤ کا تھا ڈاکٹر سلیم اختر نے بہت اچھا
کیا کہ شاعر کے نفسی تجزیئے سے پہلے اپنا یہ اصول واضح کر دیا کہ غزل میں روایتی، رسمی اور تقلیدی
رنگ غالب آچکا تھا۔ چنانچہ اس طرح کی رسمی شاعری سے شاعر کا نفسیاتی جائزہ لینا گمراہ کن ہو سکتا
ہے۔ اور غالب تو بنیادی طور پر ایک روایت ساز شاعر تھا۔ ڈاکٹر سلیم اختر غالب کے رسمی اشعار
کو اسی لئے لاشعور کی بحث میں لائے ہی نہیں غالب کی روایت پسندی صرف "سبزہ خط" تک جا
سکی ورنہ میر جیسے شاعر کے ہاں تو امردوں اور لونڈیوں کی قطاریں کھڑی ہیں غالب تو حقیقت کو
حقیقت مانتا ہے غم کو غم کہتا ہے اور عام عشق کے ساتھ غم روزگار اور غم دنیا کو برابر کی اہمیت

دیتا ہے چنانچہ غالب شعور اور اس کے لاشعور کے مطالعے کا حتمی اور حقیقی سامان فراہم کرتا ہے
ڈاکٹر سلیم اختر نے جہاں بھی غالب کی نرگسیت کا مطالعہ کیا ہے وہاں دور کی کوڑی لانے کی بجائے انہوں نے غالب کو اس کی شاعری اور خطوط کے آئینہ میں دیکھا ہے اور یوں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں چھوڑی۔

حسن رضوی۔ ڈاکٹر آغا سہیل صاحب سے گذارش ہے کہ اس کتاب کے بارے میں ان کے تاثرات کیا ہیں؟

ڈاکٹر آغا سہیل۔ میں نے ڈاکٹر سلیم اختر کی کتاب کا بالاستعیاب مطالعہ کیا ہے لیکن ذرا مختلف انداز میں اور وہ اس طرح کہ پہلے میں نے ان تمام اشعار کو دیکھا جو ان مقالات میں استعمال ہوئے ہیں دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنی خوردبین سے غالب کے جن اشعار کو نخچیر کیا ہے اور ہدف بنایا ہے انہیں دیکھا اور شکر کیا کہ اشعار کا وہ ذخیرہ جو میرے ذہن کے کسی گوشے میں پڑا ہوا ہے اس کا بیشتر حصہ ان کی دسترس سے محفوظ رہا اسے آپ حریفانہ، معاصرانہ، معاندانہ، یا ستم ظریفانہ چشمک نہ سمجھیں بلکہ یہ محض حصہ برادرانہ کے طور پر ہم دونوں کے مابین ایک خاموش سمجھوتہ ہے کہ ہماری فکری سطحیں متوازی ہوتے ہوئے بھی جزوی طور پر کہیں نہ کہیں الگ ہو جاتی ہیں دوسرے وہی طریقہ برتا جو معروف ہے یعنی تمام مقالات کو پڑھ ڈالا۔ ان مقالات کو پڑھنے کے بعد اطمینان یہ ہے کہ نشان منزل کے تعین میں جو کتابیں جو مقالے اور جو افکار معاون و مددگار ہوں گے ان میں سلیم اختر کی تمام کاوشیں عموماً شامل ہوں گی اور مذکورہ بالا کتاب بطور خاص حوالے کی کتاب بن کر کتب خانوں میں محفوظ رہے گی۔

سعید مرتضیٰ زیدی۔ نفسیاتی تنقید نظر سے اس کتاب کی کیا اہمیت ہے میرا استفسار جناب سراج منیر سے ہے۔

سراج منیر۔ زیدی صاحب! اگر نفسیاتی تنقید کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو یہ کتاب خود اپنی جگہ مطالعے کا ایک اچھا موضوع ہے کہ اس کے مختلف مضامین میں ربط کی نوعیت کو پیش نظر رکھ کر سراغ لگانے کی کوشش کی جا سکتی ہے کہ ایک خلاق تنقیدی ذہن کا اصول نمو کیا ہوتا ہے۔ غالبیات میں یہ کتاب ایک مختلف انداز نظر کی نمائندہ ہے تشریح و تعبیر کے بجائے ذات کی تہوں میں جھانک کر نتائج مرتب کرنے کا اسلوب رکھتی ہے اور موجودہ تنقیدی صورتحال میں یہ چیز کمیاب اور قیمتی ہے۔

سعید مرتضیٰ زیدی۔ طارق عزیز صاحب "شعور اور لاشعور کا شاعر۔ غالب" تفہیم غالب میں

ہماری کیا مدد کر سکتی ہے؟

طارق عزیز۔ شعور اور لاشعور کا شاعر غالب میں عظیم اردو شاعر غالب پر ایک نئے زاویے سے نگاہ ڈالی گئی ہے یہ کتنی حیرت کی بات ہے کہ غالب جن کی شاعری نفسیاتی اسرار سے پر ہے ان کے اس پہلو پر آج تک کسی نے توجہ نہیں کی اس سے پہلے جتنے بھی ناقدین یا ماہرین غالبیات نے غالب کے اس پہلو پر قلم آزمائی کی ہے ان کا کام ایک آدھ مضمون سے آگے نہیں بڑھا جبکہ غالب کے خطوط اور شاعری کے اس غالب ترین محرک کا تفصیلی تجزیہ کرنے کی ضرورت ہمیشہ محسوس کی جاتی رہی ہے یہ پہلا موقع ہے کہ ڈاکٹر سلیم اختر نے اس جانب توجہ کر کے تفہیم غالب میں ایک نئی روایت کا اضافہ کیا ہے جو غالبیات میں ہمیشہ انتہائی افادیت اور اہمیت کا حامل رہے گا۔

حسن رضوی۔ قتیل شفائی صاحب آپ کافی دیر سے خاموش بیٹھے ہوئے ہیں ہم اس کتاب کے بارے میں آپ کے خیالات جاننا چاہتے ہیں۔

قتیل شفائی۔ غالب پر ڈاکٹر سلیم اختر کے مقالات کا مجموعہ میرے مطالعے کا ایک خوشگوار تجربہ ہے اگرچہ میں تنقید و تحقیق کے خشک اور دشوار اسالیب کا بہت کم متحمل ہو پاتا ہوں لیکن ڈاکٹر سلیم اختر کی تحریروں کا بے ساختہ پن اور ان کی شگفتگی ذہن و نظر کو آگے بڑھنے کے لئے راستہ دیتی چلی جاتی ہے۔ اور مجھ ایسا سہل پسند قاری بھی اپنے آپ کو یہ تحریریں پڑھنے پر مجبور پاتا ہے۔ مکمل غالب کا تجزیاتی جائزہ تو اب اتنا مشکل نہیں رہا کہ سینکڑوں ضخیم کتابیں اس ضمن میں پہلے ہی اہل قلم کی رہنمائی کرتی ہوئی مل جاتی ہیں البتہ غالب کو عمر کے کسی الگ خانے میں رکھ کر اس کا جائزہ لینا حقیقتاً مشکل بھی تھا اور دلچسپ بھی مجھے خوشی ہے کہ ڈاکٹر سلیم اختر نے انیس برس تک غالب کو الگ سے ایک مقالے کا موضوع بنایا ہے اور غالب سے اسد کو الگ کر کے ایک ایسے شعری سفر کی نشاندہی کی ہے جس سے غالب کی ارتقائی منازل اور اس کے بدلتے ہوئے فنی راستوں کو سمجھنے میں بڑی مدد ملی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی "مختصر ترین تعریف" یوں کی جا سکتی ہے کہ وہ پیتل کے بہت بڑے ڈھیر میں سونے کی ڈلی ہے اور سونا کبھی پرانا نہیں ہوتا۔

سعید مرتضیٰ زیدی۔ "شعور اور لاشعور کا شاعر۔ غالب" میں کچھ اختلافی پہلو بھی ہمارے سامنے آتے ہیں قاسمی صاحب آپ کے نزدیک کن پہلوؤں سے اختلاف کیا جا سکتا ہے؟

احمد ندیم قاسمی۔ جی ہاں ان سے اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر ان کے خلوص نیت اور ان کے توازن و تناسب سے انکار کرنا مشکل ہے۔ مثلاً مجھے ان سے یہ اختلاف ہے کہ انہوں نے جگہ جگہ پر

غالب کے جذبہ رشک کو "مریضانہ" بلکہ "شدید مریضانہ" کہا ہے یہی وہ مقام ہے جہاں علم نفسیات محبت کو مرض میں بدل دیتا ہے میں شاید علم نفسیات سے نابلد ہونے کی وجہ سے یہ سمجھتا ہوں کہ رشک کا جذبہ شدید لگاؤ اور شدید محبت ہی سے پیدا ہوتا ہے اور اگر شدید لگاؤ اور شدید محبت ہی کو نفسی مرض سمجھ لیا جائے تو الگ بات ہے ورنہ رشک ایک لطیف، حسین اور فطری جذبہ ہے۔ جو شخص رشک محسوس نہیں کرتا وہ یقیناً کسی نفسیاتی الجھن کا شکار ہے۔ ایسا محبوب جو شاعر سے "خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے" وہ شاعر کا نقطہ معراج عشق ہے اور یہ دو انسانوں کی باہمی وابستگی کی انتہا ہے مگر ڈاکٹر صاحب نے تو غالب کی رجائیت کو بھی مریضانہ کہہ ڈالا ہے اور اس کے احساس برتری (نرگسیت) کو بھی اس کے احساس کمتری کی پیداوار قرار دیا ہے مجھے اس نوع کے متعدد مقامات پر ڈاکٹر صاحب سے اختلاف ہے اس کے باوجود ڈاکٹر سلیم اختر کی تازہ کتاب پڑھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا ہے جیسے مجھے اپنے محبوب شاعر غالب کے حوالے سے کچھ اور روشنی حاصل ہوئی ہے اس کی نرگسیت کے انداز بھی محبوبانہ ہیں اور اس کے جنسی رجحانات بھی نارمل مردوں کے سے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اچھا کیا کہ ان کا تجزیہ کر دیا اس کتاب میں اگر "غالب کے تضادات کا مطالعہ" کے عنوان سے بھی ایک مضمون شامل ہو جاتا تو کتاب کی افادیت میں مزید اضافہ ہو سکتا تھا خود ڈاکٹر صاحب کے ارشادات سے ثابت ہے کہ غالب کے ہاں فرار بھی ہے اور رجائیت بھی ہے غم بھی ہے اور زندگی کی مسرتوں سے لذت یابی بھی ہے۔ وہ مریضانہ رجحانات سے آزاد ایک نارمل انسان بھی ہے اور شدید مریضانہ رشک و رجائیت کا شکار بھی ہے علم نفسیات میں ان تمام تضادات کا کوئی نقطہ اتصال تو یقیناً ہو گا اس کا مطالعہ بہت دلچسپ ہو سکتا تھا۔

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا۔ میں یہاں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ نفسیاتی تنقید میں فنکار کی نفسیاتی الجھنوں کا سراغ لگانے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ نقاد اسے ایک گھٹیا انسان ثابت کرنا چاہتا ہے نفسیات دان انسان کو تقریباً اسی نظر سے دیکھتا ہے جو جبری صوفیوں کا نقطہ نظر ہے۔ یعنی انسان کو عموماً ورثے میں اور پھر لازماً ابتدائی ماحول میں جو کچھ ملتا ہے وہی اس کی شخصیت کی تعمیر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نفسیاتی نقاد شاعر کی شخصیت کے تجزیئے سے اس کے کام تک پہنچتا ہے اور کلام میں جس طرح اس کا شعور اور لاشعور مل جل کر تاثرات تیار کرتا ہے انہیں مربوط انداز میں پیش کر دیتا ہے اس لئے ہمارے بہت سے اہل دانش نفسیاتی طریق کار سے محض اس غلط فہمی کی بناء خوفزدہ رہتے ہیں جیسے ذہنی تجزیئے کا مطلب کسی مجرم کو ثابت کرنا ہو یہ بات میں نے اس وجہ سے کہی ہے کہ نفسیاتی نقاد کے طریقہ کار کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ڈاکٹر سلیم اختر کو پہلے بھی

گالیاں دی جا چکی ہیں۔ دوسرے اہم بات یہ ہے کہ نفسیاتی نقاد فنکاروں کی درجہ بندی نہیں کرتا وہ یہ نہیں بتاتا کہ کون عظیم لکھنے والا ہے اور کون معمولی درجے کا ہنر مند ہے وہ ہمارے لئے فقط یہ کرتا ہے کہ فنکار کے ذہن کو سمجھنے کے لئے بنیاد فراہم کر دیتا ہے اور ہمارے لئے فنکار کے کام کی تحسین زیادہ گہری ہو جاتی ہے۔ میں ڈاکٹر سلیم اختر کی کتاب "شعور اور لاشعور کا شاعر۔ غالب" کو اسی نقطہ نظر سے دیکھتا ہوں۔ غالب کے ہاں نسلی تفاخر کا احساس یا انکی نرگسیت یا ان کے رشک کے مضامین در حقیقت ایک غیر منقسم غالب کو ہمارے سامنے لاتے ہیں اور جس انداز میں ڈاکٹر صاحب نے غالب کا تجزیہ کیا ہے اس سے ان کے کلام کو سمجھنے میں مزید سہولتیں فراہم ہو جاتی ہیں۔ اس وجہ سے میں اس کتاب کو غالبیات کے بہت بڑے ذخیرے میں اہم کتب شمار کرتا ہوں۔

سعید مرتضیٰ زیدی۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آج کی محفل مذاکرہ میں "شعور اور لاشعور کا شاعر۔ غالب" کے مصنف ڈاکٹر سلیم اختر کو بھی مدعو کیا گیا ہے انہوں نے بہت حوصلہ سے نقادوں کی گفتگو سنی ہے اب آخر میں ان سے گزارش ہے کہ وہ اپنی کتاب کے بارے میں یا آج کی گفتگو کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کریں۔

ڈاکٹر سلیم اختر۔ سب سے پہلے تو مجھے "جنگ فورم" کے ارا کین اور معزز مہمانوں کا شکریہ ادا کرنا ہے کہ میری کتاب کے بارے میں اظہار خیال کا یہ موقع فراہم ہو سکا آپ سب میرے مزاج سے واقف ہیں کہ میں نے آج تک اپنی کسی کتاب کی تقریب رونمائی نہیں کرائی بلکہ اب تو میں تبصرے وغیرہ بھی نہیں کراتا لیکن "شعور اور لاشعور کا شاعر۔ غالب" غالب کی شخصیت اس کی شاعرانہ اہمیت اور میرے مخصوص تنقیدی مزاج کی عکاسی کرتی ہے اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ذہن میں رکھئے کہ سلیم احمد مرحوم کی "غالب کون" کے بعد اور ایسی کوئی کتاب نہیں آئی جس نے غالب کے بارے میں نئے مباحث کو جنم دیا ہو۔ مجھے توقع ہے کہ میری کتاب کچھ سوالات کا باعث بن سکے گی اس کے حوالے سے کچھ نئے نکات پر بھی غور ممکن ہو سکے گا اور میں سمجھتا ہوں کہ غالب فہمی میں مَیں بھی اس ناچیز کنٹری بیوشن کے ذریعے اپنی تنقیدی محبت کا حق ادا کر سکوں گا۔ غالب کی عظمت کو سب سلام کرتے ہیں آج سے نہیں بلکہ ایک صدی سے زائد عرصہ ہونے کا آیا کہ اردو شاعری میں اس کا سکہ رواں ہے یوں سمجھئے کہ تخلیقی عمل سے غالب کے شعور اور لاشعور کی ٹکسال میں اشعار کی صورت میں جو سکے ڈھلے، وہ آج بھی زر خالص ہیں۔ میں خود کو غالب شناس یا غالب فہم کہنے کی جسارت نہیں کر سکتا کیونکہ میں نے ہمیشہ طالب علمانہ زندگی بسر کی

ہے اور غالب کی شخصیت اور اس کے افکار کی یہ نفسیاتی تشریح بھی میری نفسیات اور غالب سے طالب علمانہ دلچسپی کا مظہر ہے۔ آپ اسی اہم علم اور اہل الرائے حضرات کو اس کتاب میں کوئی خوبی نظر آئی تو یہ میرے لئے باعث عزت ہے۔

حسن رضوی۔ "جنگ فورم" میں آپ کی تشریف آوری سے آج ہماری جو عزت افزائی ہوئی ہے اس کے لئے میں آپ سب کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

ایک مرتبہ آتش کے شاگرد میر وزیر علی صبا نے اپنی غزل اصلاح کے لئے پیش کی۔ غزل کا پہلا شعر تھا۔

فصلِ گل میں مجھے کہتا ہے کہ گلشن سے نکل
ایسی بے پر کی اڑاتا نہ تھا صیّاد کبھی

آتش نے پہلے مصرعے میں ایک اصلاح سے شعر کو زمین سے آسمان پر پہنچا دیا۔ اب شعر یوں ہو گیا۔

پَر کتر کر مجھے کہتا ہے کہ گلشن سے نکل
ایسی بے پر کی اڑاتا نہ تھا صیّاد کبھی

شعور و لاشعور کا شاعر ...... غالب

ڈاکٹر طاہر تونسوی

اردو تنقید میں ڈاکٹر سلیم اختر بہت اہم نام ہیں خاص طور پر نفسیات کے تناظر میں انہوں نے اردو ادب کی کئی اصناف کا بھرپور مطالعہ کیا ہے اور یوں اس وقت وہ برصغیر پاک و ہند کے واحد نقاد ہیں جنہیں نفسیاتی تنقید کے دبستان کا سرخیل قرار دیا جاسکتا ہے۔ لحہ موجود تک ان کی جتنی بھی تنقیدی کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں نفسیات کا مطالعہ موجود ہوتا ہے۔ چنانچہ "نگاہ اور نکتے" سے لے کر "تخلیق اور لاشعوری محرکات" تک ان کی تمام تنقیدات اسی سے متوصف ہیں اور یہی حال ان کی تازہ کتاب "شعور اور لاشعور کا شاعر ... غالب" کا ہے۔

غالب پر اردو میں بہت کام ہوا ہے اور غالب صدی میں تو دیگر زبانوں میں اتنا معیاری کام ہوا ہے کہ اب غالبیات نے ایک مستقل موضوع کی صورت اختیار کرلی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے بھی غالب پر کئی نئے زاویوں سے مضامین لکھے اور مقالات قلمبند کئے اور شاعری کے ساتھ ساتھ خطوط غالب کا نفسیاتی مطالعہ کیا ایسے تمام مضامین زیر تبصرہ کتاب میں شامل ہو کر غالب کے ایک نئے مطالعے کا منظر نامہ پیش کرتے ہیں۔ کتاب کا نام بھی اپنی بھرپور نفسیایت معنویت لئے ہوئے ہے اور اس میں شعور اور لاشعور کی اصطلاحوں کے ذریعے غالب کے فکر و فن اور اس کی شخصیت کے باطن میں جھانکا گیا ہے اور یوں اس کے ان مخفی گوشوں کو نمایاں اور اجاگر کر کے غالب کی نئی تفہیم سامنے لائی گئی ہے اور یہ ڈاکٹر سلیم اختر کی تنقیدی اور نفسیاتی اپچ ہے کہ انہوں نے اصل غالب کو سامنے لاکھڑا کیا ہے اور اس کے تمام تر مشہور پہلوؤں کی واضح اور نمایاں نشاندہی کر دی ہے۔ اس کتاب میں دس مقالات ہیں جن میں نو مقالات غالب کی شاعری اور نثر کے نفسیاتی مطالعے کی ذیل میں آتے ہیں جبکہ دسواں مقالہ عبدالرحمن چغتائی (مصور پاکستان) اور غالب کے ذہنی رابطہ کے بارے میں ہے جو مرقع غالب کی تصاویر کے حوالے سے ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے غالب کا مطالعہ جن حوالوں سے کیا ہے وہ یہ ہیں۔

غالب کا نفسیاتی مطالعہ .... شعور و لاشعور کا شاعر .... مرد عاشق کی مثال .... غالب .... غالب کی نرگسیت .... غالب کی شاعری میں جنس .... غالب۔ مکتب غم دل میں

.... غالب، آتش زیرپا، بیاضِ غالب کا تجزیاتی مطالعہ .... یہ سب مضامین غالب کی شاعری سے متعلق ہیں جبکہ غالب خطوط کے آئینے میں .... غالب کے خطوط سے تعلق رکھتا ہے۔

غالب کی تفہیم اور اس کے نئے زاویوں سے مطالعے اور خاص طور پر نفسیات کا علم استعمال کرنے کے لئے ڈاکٹر سلیم اختر نے کہیں پر بھی نفسیات کو زبردستی ٹھونسنے کی کوشش نہیں کی بلکہ جہاں کہیں نفسیاتی عمل کی ضرورت محسوس ہوئی وہیں پر ہی نفسیات کی دھار استعمال کی اور یوں انہوں نے غالب کے اندر ہی سے سب کچھ نکالا۔ اس بات کا اعتراف انہوں نے خود اپنے پیش لفظ میں بھی کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔ ''نفسیاتی تجزیہ بے حد محتاط عمل کا نام ہے اسے سنسنی خیزی کے لئے نہیں ہونا چاہئیے .... اگر اہل نظر نے میری تحریروں کو کسی قابل جانا تو اس لئے کہ میں صرف اسی وقت نفسیات سے کام لیتا ہوں جب اس کے ذریعہ سے تخلیق یا تخلیق کار پر نئے سرے سے روشنی ڈالنی ممکن ہوسکے۔ میں نے نفسیات کو کبھی بھی اندھے کی لاٹھی نہیں بنایا۔''

اس وضاحت سے جہاں خود ڈاکٹر سلیم اختر کے نفسیاتی تنقید اور نفسیاتی فارمولے اپنانے کے نظریے کا پتہ چلتا ہے وہاں غالب کے نفسیاتی مطالعوں کے ذریعے خود غالب کے نفسی رجحانات کو بھی سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

اردو میں غالب وہ شاعر ہیں جن کے ہاں شخصی اور فکری سطح پر کئی تضادات ملتے ہیں اور اس کے اشعار میں جو پہلو داریت ہوتی ہے اس کی تہ تک پہنچنے کے لئے کئی حربے استعمال میں لانے پڑتے ہیں۔ تب کہیں جا کر گنجینہ معنی کا طلسم کھلتا ہے اور میں دیانت داری سے یہ سمجھتا ہوں کہ اس طلسم کے کھولنے کا اسم اعظم نفسیات ہی کے پاس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر سلیم اختر نے نفسیات کی چابی سے غالب کی شخصیت اور اس کے فکر و فلسفے کا بھاری قفل کھولا ہے اور ''غالب اندر سے کیا ہے اور باہر سے جو دکھائی دیتا ہے ویسا ہے بھی یا نہیں'' کے بارے میں سب کچھ منور کر دیا ہے۔ اس پس منظر میں غالب کی نرگسیت، غالب آتش زیرپا، غالب کی شاعری میں جنس اور مرد عاشق کی مثال۔ غالب، مزید ارمضامین ہیں خاص طور پر ڈاکٹر سلیم اختر کے نفسیاتی نتائج نے، جہاں غالب کے اشعار کی صحیح اور حقیقیت پسندانہ تفہیم کو سامنے لایا ہے وہاں غالب کی شاعری سے یقینی طور پر پہلی بار حظ اٹھانے کا موقع فراہم کیا ہے اور اس طرح غالب کی قلبی چاہت کو سمجھنے میں بھی مدد ملی ہے۔ ''غالب کی شاعری میں جنس'' والے مضمون میں غالب کے کلام کے حوالے سے جن دو رجحانات کا سراغ لگایا گیا ہے ان میں ایک کمزوری کا احساس اور دوسرا نظارہ پرستی کا شوق ہے اور ان دو رویوں کو اجاگر کرنے اور ایسے اشعار کی تخلیق کے پس منظر میں نفسیاتی عوامل کی

کارفرمائی کا سراغ ڈاکٹر سلیم اختر کی نفسیاتی تنقیدی بصیرت کا غماز ہے۔ اسی طرح غالب کے ہاں پابوسی کا جو رویہ ملتا ہے اس کے تمام محرکات کو موضوع بحث لایا گیا ہے۔

یوں دیکھا جائے تو اس کتاب کا ہر مضمون اپنے اندر ایک نیا مضمون رکھتا ہے اور مطالعہ غالب کے نئے در وا ہوتے جاتے ہیں اور اس میں شامل سارے مضامین اپنے موضوع، مواد اور نتائج کے اعتبار سے غالب پر حقیقی اور اصلی صورت کو سامنے لاتے ہیں جن پر ماہرین غالب میں سے کسی نے بھی اب تک قلم نہیں اٹھایا اور نہ ہی اس پہلو سے غالب کے مطالعے سے نتائج بر آمد کئے۔ اگرچہ ڈاکٹر سلیم اختر نے نفسیات کے ذریعے سنسنی خیزی نہیں دکھائی تاہم اتنا ضرور ہے کہ انہوں نے جس طرح غالب اور تفہیم غالب کے سلسلے میں نفسیاتی مطالعہ کیا ہے وہ قاری کو چونکاتا ضرور ہے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس سے پہلے غالب کی یہ تصویر سامنے نہیں آئی۔ اس پس منظر میں یہ کتاب غالب کو سمجھنے اور اس کے تخلیقی محرکات کو لاشعور اور شعور کے حوالے سے پرکھنے اور درست نتائج نکالنے میں معاون ثابت ہوتی ہے اور ان مضامین میں ایک نیا غالب سامنے آتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے تو کسر نفسی سے کام لیتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ اگر یہ کتاب غالب فہمی میں کوئی نیا زاویہ مہیا کر سکے تو یہ میرے لئے اعزاز ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ شعور اور لاشعور کا شاعر غالب کا نئے سرے سے مطالعہ آسان ہو جاتا ہے اور غالب کے فکر و فن کے کئے نئے گوشے سامنے آتے ہیں۔ اس اہم اور خوبصورت کتاب کو معروف اشاعتی ادارے فیروز سنز نے خوبصورت گیٹ اپ کے ساتھ شائع کیا ہے۔

> "غالب اتنے بڑے شاعر تھے کہ ان کے ہاں سائکی Psyche نے اپنے جملہ خزائن کو گویا الٹ دیا اور نسل کا وہ سرمایہ شعری قالب میں ڈھلنے کے لئے مہیا ہو گیا جو Archetypal Images کی صورت میں موجود تو ہوتا ہے لیکن ابھرتا صرف وہاں ہے جہاں فنکار کے شعور اور لاشعور کے مابین آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہو جائے۔"
>
> (ڈاکٹر وزیر آغا۔ "وہ زندہ ہم ہیں")

ڈاکٹر سلیم اختر کی نفسیاتی تنقید

ڈاکٹر سہیل احمد خان

پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے لکھے گئے مقالات کا مطالعہ بالعموم اذیت ناک تجربہ بن جاتا ہے۔ عمومیت زدہ طول کلامی، بنا بنایا سانچہ گھڑے گھڑائے چلتے ہوئے فقرے اب اتنے عام ہیں کہ ان مقالات کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ہر مقالے میں وہی سیاسی سماجی پس منظر کا باب انھی چند کتابوں کی بنیاد پر لکھا جاتا ہے جو مدتوں سے رائج ہیں، ایک جعلی قسم کی بقراطیت، غلط سلط مغربی حوالے، ایک بات کو کھینچتے کھینچتے اس کا سرا گم کرنے کا انداز۔ غرضیکہ یہ ہمارے تعلیمی زوال کا ایک دردناک پہلو ہے۔ سلیم اختر کا مقالہ "نفسیاتی تنقید" جو اب کتابی شکل میں شائع ہوا ہے اس پس منظر میں قدرے خوشگوار تاثر چھوڑتا ہے۔ سلیم اختر صاحب کے سامنے بھی یہی مجبوریاں تھیں اور یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے ان سانچوں کو استعمال نہیں کیا مگر اتنا ضرور ہے کہ ان مجبوریوں کے ہوتے ہوئے بھی وہ روشِ عام سے کچھ ہٹ کر ضرور چلے ہیں۔ مذکورہ بالا پس منظر میں یہ ہمت بھی کم توجہ طلب نہیں۔ یوں اس مقالے میں نفسیاتی تنقید کے بارے میں اتنا مواد جمع ہو گیا ہے جو کہیں اور یکجا موجود نہیں۔

سلیم اختر کی خوش قسمتی کہہ لیجئے کہ انہیں اپنی پسند کے موضوع پر کام کی اجازت مل گئی۔ ان کی تمام تر علمی کاوشوں کا مرکزی نقطہ نفسیات سے دلچسپی ہے اور یہ مقالہ لکھتے ہوئے انہیں اپنے اس محبوب موضوع پر نسبتاً جم کر سوچنے اور نئے مواد کے مطالعے کا موقع ملا۔ یوں یہ مقالہ صرف پیشہ ورانہ دلچسپی تک محدود نہیں رہا۔ اچھا ہوتا اگر یہ مقالہ فرائڈ اور اس کے بعد کی نفسیات ہی سے بحث کرتا اور نئی نفسیات سے پہلے نفسیاتی نقادوں کی سراغ رسانی نہ کی جاتی کہ اس کا دائرہ کار الگ ہے تاہم سلیم اختر نے یہاں بات کو بہت زیادہ طول نہیں دیا۔ خیر اس سے ہٹ کر دیکھیں تو سلیم اختر صاحب نے بنیادی طور پر مندرجہ ذیل امور کو زیادہ اہمیت دی ہے:

(ا) اردو میں نفسیات کے بارے میں موجود مواد (چاہے وہ طبع زاد ہو یا ترجمہ) کی نشاندہی۔

(ب) نفسیات کے علم کے انسانی شخصیت اور فنون لطیفہ کے بارے میں تصورات

کی وضاحت اور ان تصورات کے تنقید پر مرتب ہونے والے اثرات کی بحث۔

(ج) نفسیاتی تنقید کے نمائندوں کے مضامین کا تجزیہ اور نفسیاتی تصورات کا حوالہ دینے والے نقادوں کے اٹھائے ہوئے مباحث کا خلاصہ۔

(د) اس دبستان تنقید کی حدود کا تعین، اس کے محاسن کا ذکر اور اس پر ہونے والے اعتراضات کا جائزہ۔

ان امور کے حوالے سے یہ تصنیف خاصی معلومات افزا ہے خصوصاً اردو میں نفسیات کے موضوع پر تحریروں کی نشاندہی کے سلسلے میں سلیم اختر نے بڑی محنت سے کام لیا ہے۔ قارئین کو اس مواد کی فراہمی کے لئے ان کا شکر گزار ہونا چاہیے کیونکہ اس طرح اردو میں نفسیاتی مباحث کی پوری تاریخ سامنے آجاتی ہے۔ کئی فراموش شدہ مضمون نگاروں سے شناسائی ہوئی ہے۔ اس مواد کو دیکھ کر ایک اور بات بھی ذہن میں آتی ہے۔ نئی نفسیات کے فروغ کے ساتھ ہی اردو میں اس کے بنیادی تصورات سے دلچسپی لینے والے بھی سامنے آ گئے کتابوں کے تراجم ہوئے، مضمون لکھے گئے ادب اور تنقید پر اس مکتب فکر کے اثرات مرتب ہونے لگے۔ یہ کوششیں چاہے آج ان کا جو بھی درجہ ہو اس حقیقت کی غماز ہیں کہ اس وقت اردو کی ادبی فضا میں نئے تصورات اور علوم کی کیسی پیاس موجود تھی۔ آج اتنے اداروں اور معاشی ترقی کے دعووں کے باوجود کیا ہم نئے تصورات سے اردو کے دامن کو اس طرح وسیع کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کیا ہم نے اپنے زمانے کے علوم سے اتنی دلچسپی کا اظہار کیا ہے؟ یہ سوچنے کی بات ہے۔

اس تصنیف کی ایک اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ سلیم اختر نے معروضی رویہ اپنانے کی کوشش کی ہے۔ وہ نفسیات سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں اور نفسیاتی تنقید کو عملی طور پر اپنائے ہوئے ہیں لیکن مقالے میں وہ بے جا جذباتی ہونے کی کوشش نہیں کرتے اس توازن کو حاصل کرنے کے لئے وہ یقیناً جذباتی کشمکش سے گزرے ہوں گے۔

اس تبصرے میں اس تصنیف کے مجموعی انداز سے بحث کی گئی ہے، جزوی اختلافات کے بیان کو ضروری نہیں سمجھا گیا البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ بعض اغلاط معمولی کاوش سے درست ہو سکتی تھیں مثلاً صفحہ 110 پر ن۔م۔ راشد کے بارے میں لکھتے ہیں: "راشد نے تنقید کم لکھی صرف چند مقالات ہی ملتے ہیں۔" اس کے بعد وہ پانچ مقالات کی نشان دہی کرتے ہیں۔ راشد نے چاہے تنقید کم لکھی ہو مگر ان کے مقالات کی تعداد ان مقالات سے کہیں زیادہ ہے جس تیقن سے سلیم صاحب نے بات کی ہے اس کی اس مقام پر ضرورت نہ تھی اسی فہرست میں انہوں نے

"نئی تحریریں" میں شائع ہونے والے مضمون "شاعر کی تین آوازیں" کا ذکر کیا ہے۔ یہ راشد صاحب کا مضمون نہیں بلکہ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے مشہور مضمون کا ترجمہ ہے۔ نیز اسی شمارے میں ابن انشا کی نظم "خزاں کی ایک شام" کا تجزیہ جو سلیم صاحب نے راشد سے منسوب کر دیا ان کا کیا ہوا نہیں۔

غالب کے بارے میں لکھے گئے نفسیاتی مضامین کے ضمن میں آفتاب احمد خان کے اہم مضامین کا ذکر بے حد سرسری ہے اور سلام سندیلوی جیسے نقادوں پر زیادہ لکھا گیا ہے اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ بہر حال اس طرح کے جزوی امور سے قطع نظر سلیم اختر کی اس تصنیف میں اردو میں نفسیاتی تنقید کے مباحث کا مہارت سے احاطہ کیا گیا ہے اور مجموعی طور پر یہ اہم تصنیف ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر نفسیاتی نقاد ہیں اور نفسیاتی نقادوں کے یہاں کبھی کبھی الجھاوا پیدا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ضروری نہیں کہ ہر تجزیہ صحیح نتائج پر منتج ہو۔ ڈاکٹر صاحب کے مضامین کا مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ ان کا ذہن اپنے موقف کے سلسلے میں بالکل واضح اور صاف ہے۔ وہ جو بات کہنا چاہتے ہیں بڑی صفائی سے کہہ جاتے ہیں۔

(ڈاکٹر اے۔ بی۔ اشرف۔ "میر، غالب اور اقبال" ص 177)

ڈاکٹر سلیم اختر بحیثیت نقاد

...... ایک مطالعہ ......

پروفیسر شوذب کاظمی

ڈاکٹر سلیم اختر وطن عزیز کے ان چند لکھنے والے خوش نصیبوں میں ہیں جن پر ان کی زندگی میں اعلیٰ سطح کا تحقیقی کام ہو چکا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انہوں نے تنقید، نفسیات، افسانہ، تاریخ، بچوں کا ادب جیسے شعبوں میں قابل توجہ کام کیا ہے اور تنقید و تاریخ ادب میں تو ان کا نام صف اول کا ہے اور یہ تقاضا کرتا ہے کہ اس پر اعلیٰ سطحی تحقیقی کام کیا جائے۔ یہ الگ بات ہے کہ ابھی تک ہمارے ہاں کسی زندہ شخصیت پر بڑی سطح کا تحقیقی کام منظور ہو کر تکمیل تک نہیں پہنچا۔ یہ اعزاز ڈاکٹر جلیل اشرف کا ہے جنہوں نے رانچی یونیورسٹی بہار بھارت سے کافی عرصہ پہلے "اردو تنقید کے فروغ میں سلیم اختر کا حصہ" کے عنوان سے پی-ایچ-ڈی کا مقالہ تحریر کیا اور سند فضیلت پائی۔

ڈاکٹر جلیل اشرف کی اسی تحقیق کا نچوڑ ان کی تازہ کتاب "ڈاکٹر سلیم اختر بحیثیت ایک نقاد" ٹی اینڈ ٹی پبلشرز لاہور نے پہلے پاکستانی ایڈیشن کی شکل میں شائع کی ہے۔ اس کتاب کا انڈین ایڈیشن 1998ء میں شائع ہو چکا ہے۔ زیر نظر کتاب پہلی اشاعت ہی کی عکسی صورت ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی تنقید ان کی پینتیس سے زائد کتابوں اور ان سینکڑوں مضامین سے مترشح ہے جو ادب اور زندگی کے مختلف موضوعات پر شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان کی شخصیت اور فن پر ڈاکٹر طاہر تونسوی کی کتاب "ہمسفر بگولوں کا" چودہ سال سے اس موضوع پر دنیائے تحقیق کے لئے بنیادی مواد فراہم کر رہی ہے۔ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی سے ایم-اے کی سطح پر دو طالبات نے ایسے تحقیقی مقالے تحریر کئے ہیں جو ڈاکٹر سلیم اختر کی تنقید اور افسانہ نگاری کا احاطہ کرتے ہیں۔ ایسے میں ڈاکٹر جلیل اشرف کا کتاب کے آخر میں ان تمام کاموں کا کتابیات میں شامل کر کے حرفِ آغاز میں یہ کہنا عجیب سا لگتا ہے کہ:

> "ڈاکٹر طاہر تونسوی کی کتاب "ہمسفر بگولوں کا" مجھے آخری وقتوں میں ملی تب تک میں بہت کچھ لکھ چکا تھا اس لئے اس کتاب کا اثر میری کتاب پر

کبھی محسوس نہیں کیا جاسکتا..... میں اس سے استفادہ کرنے کا مگر اپنے مقالے میں
اس کے زیر اثر کوئی تبدیلی کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔"

میرا ذاتی خیال ہے کہ سلیم شناس حلقوں میں اس بات کو عذر لنگ کے طور پر قبول کیا جائے گا۔ اہلِ تحقیق اس بات سے واقف ہیں کہ کسی موضوع پر مواد کی تلاش کا عمل شروع کرتے ہوئے ایسے ماخذات سے اخذ و قبول سے گریز کیا ہی نہیں جاسکتا جو اس موضوع کی بنیادی شہادتیں فراہم کرتے ہیں بلکہ ان سے لاعلمی کا اظہار محقق کے لئے ضرر رساں بھی ثابت ہوسکتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ایک پہلے سے موجود بڑے کام کی اپنے کام پر چھاپ لگنے کے خدشے کے پیشِ نظر فطری طور پر ہر ایسا محقق یہی کیا کرتا ہے۔

ڈاکٹر جلیل اشرف ایسا نہ کرتے تو بھی سلیم شناس حلقوں میں انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا جیسا کہ لیا جارہا ہے بلکہ ان کے احترام میں یک گونہ اضافہ ہوتا کیونکہ یہ کام یہاں روشنی کی اس کرن کے طور پر قبول کیا گیا ہے جو بقول پروفیسر جگن ناتھ آزاد "آگے چل کر ہمارے عالم ظلمات کو عالم تجلیات میں بدل سکتی ہے" ڈاکٹر جلیل اشرف کے تحقیقی کام کی یہ خوبی یقینی طور پر سراہے جانے کے قابل ہے کہ پس منظری مواد پر روایتی انداز میں زور دینے کی بجائے کفایت لفظی سے براہ راست معلومات فراہم کی ہیں۔

"ڈاکٹر سلیم اختر بحیثیت نقاد" سات ابواب پر مشتمل ہے۔ پیش لفظ پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا تحریر کردہ ہے۔ کتاب کا انتساب جلیل اشرف نے اپنے والدین کی پاک روحوں کے نام کیا ہے جن کی شفقتوں اور محبتوں کی یاد مصنف کے لئے روشنی اور رہنمائی کا باعث بنی رہی۔ حرف اول میں مصنف نے پروفیسر وہاب اشرفی کے لئے سپاس گزاری کا اظہار کیا ہے جن کی نگرانی اور رہنمائی میں یہ کام تکمیل کو پہنچا۔

کتاب کا پہلا باب ڈاکٹر سلیم اختر کے حالات زندگی اور تصنیفات و تالیفات سے متعلق ہے۔ دوسرے باب میں ڈاکٹر سلیم اختر کی نفسیاتی تنقید سے بحث کی گئی ہے۔ تیسرا باب "تفہیم اقبال اور ڈاکٹر سلیم اختر: نفسیاتی پس منظر" کے عنوان سے ہے۔ چوتھا باب "افسانہ، انشائیہ اور سلیم اختر، فنی مباحث سے تجزیے تک" کے حوالے سے ان اصناف پر سلیم اختر کی تنقید کا احاطہ کرتا ہے۔ پانچواں باب سلیم اختر کی دلچسپی کے موضوعات ادب اور کلچر، عورت مرد کے رشتے اور دیگر موضوعات سے تعلق رکھتا ہے۔ چھٹے باب میں ڈاکٹر سلیم اختر کے اسلوب تنقید اور ساتویں باب میں ان کی تنقید کی معنویت کو واضح کیا گیا ہے۔ حالات زندگی کے ذیل میں ذکر

آیا ہے کہ ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شعر گوئی سے کیا۔ اگر کچھ کلام نمونے کے طور پر اس کتاب میں بھی شامل ہوتا تو بہتر تھا۔ اسی طرح جہاں مقالے میں ان کی اقبال شناسی کو خصوصی جگہ دی گئی ہے ڈاکٹر سلیم اختر کی غالب شناسی بھی ان کی تنقیدی جہتوں میں خصوصی اہمیت کی حامل ہے اور اس لحاظ سے خصوصی مطالعے کا تقاضا کرتی ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنے قیام ملتان کے دوران تنقید اور خاص طور پر مجلسی تنقید کے فروغ کے لئے جو مساعی کی ہیں ان کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ اس دس سالہ قیام میں انہیں جو ادبی ماحول میسر آیا خصوصاً ڈاکٹر عرش صدیقی اور دیگر احباب کی رفاقت میں انہوں نے ایمرسن کالج کے جریدے "نخلستان" کا معیار جس انداز سے بلند کیا۔ ملتان سے ابھرنے والے ناقدین ڈاکٹر اے۔ بی اشرف، ڈاکٹر طاہر تونسوی، ڈاکٹر انوار احمد ایسے تشنگان علم کی سیرابی کا سامان انہوں نے کس طرح کیا۔ ان سب کا مطالعہ ان کی تنقید کے مزاج کا پس منظری مطالعہ ثابت ہو سکتا تھا لیکن جیسا کہ ڈاکٹر جلیل اشرف نے خود کہا ہے:

> "پاکستان اور ہندوستان ایک دوسرے کے نزدیک بھی ہیں اور دور بھی۔ دور اس لئے کہ ایک ایک کتاب، مضمون، رسالے وغیرہ کے حصول میں اب بھی مہینوں لگ جاتے ہیں۔"

انہوں نے جو کچھ بھی کیا ہے ان کی موضوع سے دلچسپی اور تحقیقی مزاج کا منہ بولتا ثبوت ہے اور اس پر پروفیسر جگن ناتھ آزاد، پیش لفظ میں تفصیل سے قلم اٹھا چکے ہیں، یقینی طور پر انہوں نے اس مقالے کو اپنے خلوص سے ادب پارہ بنا دیا ہے۔

اس میں کلام نہیں کہ ڈاکٹر سلیم اختر کی شخصیت اور ان کے فن سے متعلق اکثر باتیں اس مقالے کے ذریعے ہی عام ہوئی ہیں اور جو مجبوریوں کے باعث رہ گئی ہیں ان کی تکمیل کے امکانات روشن ہیں کہ ڈاکٹر سلیم اختر کا تخلیقی سفر ابھی جاری ہے۔ سب سے پہلے اور بڑے سلیم شناس ڈاکٹر طاہر تونسوی صاحب ڈاکٹر سلیم اختر سے متعلق تمام شعبہ ہائے ادب کے حوالے سے ایک تازہ کتاب کی تالیف میں مصروف ہیں اور پاکستانی جامعات میں نچلی سطحوں پر سبھی ادب کے طلباء وطالبات کو ان کی شخصیت اور فن کے حوالے سے تحقیقی کام تفویض کئے گئے ہیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر کی افسانہ نگاری کے حوالے سے ایم۔اے کے تحقیقی کام اور نیاز فتحپوری ایوارڈ کے سنین کو چھوڑ کر کتابیات 1998ء تک شائع ہونے والی کتب اور جرائد کا ذکر ہے۔ اس لحاظ سے ڈاکٹر سلیم اختر کا تخلیقی سفر دس سال آگے بڑھ چکا ہے۔ امید ہے وہ محققین جو ان دنوں

ڈاکٹر سلیم اختر کے حاسۂ انتقاد کا احاطہ کر رہے ہیں ان تمام اہم کاموں کو پیش نظر رکھیں گے جو ان کی اس تحقیق کے بعد کی دہائی میں سامنے آ چکے ہیں۔ ہمارے ہاں پاکستان میں بھی مقالات کے آخر میں منابع و ماخذات کا ذکر تحقیق کا لازمی حصہ تصور کیا جاتا ہے۔ (جیسا کہ کمال محنت سے ڈاکٹر جلیل اشرف صاحب نے اس کتاب میں کیا ہے)۔ لیکن اسے کتابیات صرف اس صورت میں قرار دیا جاتا ہے جب وہ مصنف وار الف بائی ترتیب میں درج کی جائیں۔ اس میں ایک سہولت اور آسانی یہ بھی واقع ہو جاتی ہے کہ قاری ایک ہی مصنف کی تصانیف کو یکجا دیکھ پاتا ہے۔ بعض محققین تو اس میں درجہ کا بھی لحاظ رکھتے ہیں کہ مصنف کی پہلے اشاعت پذیر ہونے والی کتابیں پہلے درج کرتے ہیں اور بعد کی کتابیں، بقید زمانی آجاتی ہیں۔ بہر کیف ڈاکٹر سلیم اختر صاحب کی ادبی خدمات پر ریسرچ کا سلسلہ جاری ہے۔ انشاءاللہ جلد ہی اعزازات کی اس فہرست کی تکمیل بھی ڈاکٹر طاہر تونسوی کی تحقیق کے ذریعے ہو سکے گی جو ڈاکٹر سلیم اختر بحیثیت نقاد کے آخر میں دی گئی ہے۔ اور اب تو شعبہ اردو مار کھم کالج آف کامرس ہزاری باغ کے استاد اور افسانہ نگار ڈاکٹر جلیل اشرف کے لئے "ہم سفر بگولوں کا" کی روشنی میں تحقیقی مجبوریوں سے ہٹ کر رائے قائم کرنے اور اس میں اضافوں کا راستہ بھی کھلا ہے۔ بہرحال انہیں ڈاکٹر سلیم اختر کی تنقید پر مربوط مواد فراہم کرنے کی تحقیقی کاوشوں پر مبارکباد قبول کرنے سے کوئی بھی محروم نہیں کر سکتا۔ سو اس کتاب کی کامیاب اشاعت بلکہ اشاعت ثانی پر بہت بہت مبارکباد۔

جس زمانے میں مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا فیض الحسن سہارنپوری اورینٹل کالج میں پڑھاتے تھے ان میں کسی بات پر شکر رنجی ہو گئی۔ جب مولانا سہارنپوری آزاد کے کمرے کی طرف سے ہو کر گزرتے تو ادھر منہ کرکے کھنکار کر تھوک دیتے۔ جب دو ایک مرتبہ یہ حرکت ہوئی تو آزاد سمجھ گئے کہ حرکت اتفاقی نہیں۔ کچھ روز بعد جب مولانا سہارنپوری ادھر سے گزرنے لگے تو مولانا آزاد کمرے کے دروازے پر منہ بنا کر کھنے گے۔ "ارے میں تو تھوکتا بھی نہیں"۔

اقبالیات

- ہم اور اقبال (از ڈاکٹر علی شریعتی) پر ایک نظر — ڈاکٹر مختار ظفر
- اقبال اور خانقاہ — سید حماد الرحمن (مدیر)

اخلاقیات

- سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے عملی پہلوؤں کی افادیت — محمد عامر اقبال (B.Ed)
- اسلام کا تصور اخلاق — ذوالفقار علی (B.Ed)

"ہم اور اقبال" پر ایک نظر

ڈاکٹر مختار ظفر

زیر نظر کتاب "ہم اور اقبال" کے فارسی متن کے مصنف ڈاکٹر علی شریعتی نے، حصہ دوم میں علامہ اقبال کے تعارف کا جو معیار متعین کیا ہے وہ اس سوال اور اس جواب پر مبنی ہے کہ "اقبال کا تعارف سچے انداز میں کس طرح کرایا جائے؟ جواب یہ کہ پہلے ہمیں اپنا تعارف کرانا چاہیے"۔ .... اپنی اس بات کی تشریح میں ڈاکٹر موصوف نے ایک حکایت بھی پیش کی ہے اور وہ یہ کہ .... "شیخ نے کہا، ایک محفل میں میں نے چودہ دلیلیں دیں اور خدا کے وجود کو ثابت کیا۔ شمس تبریزی جواب میں کہتے ہیں۔ اے شخص! میں اللہ کی طرف سے، جناب عالی کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ پھر کہا، اے شخص! جاؤ، اپنے آپ کو ثابت کرو، خدا کو تمہارے ثابت کرنے کی ضرورت نہیں" (1) شمس تبریزی کی یہ ہدایت ایک دائمی اور کلی قانون ہے۔ مراد یہ ہے کہ پہلے ہم خود دیکھیں کہ حقیقی طور پر ہم کیا ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔ علامہ اقبال نے بھی یہی کہا:

شاہد اول شعورِ خویشتن
خویش را دیدن بنورِ خویشتن
شاہد ثانی شعورِ دیگرے
خویش را دیدن بنور دیگرے (اقبال)

اپنے آپ کو پہلے جان لینے کی یہ بات گہری اور کثیر المفاہیم ہے جو خود نگری اور خود شناسی پر دلالت کرتی ہے مگر میں یہاں اس کا عمومی مفہوم لے کر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر اقبال کو سمجھنے اور جاننے کے لئے جس بلند فکر، عمیق نظر اور باخبر انسان کی ضرورت تھی وہ ڈاکٹر علی شریعتی کی ذات میں موجود ہے۔ کیونکہ اپنی کتاب "ماواقبال" کے حوالے سے، ماضی کے پس منظر میں، حال کے تناظر میں اور مستقبل کے پیش منظر میں، علامہ اقبال کی کثیر الابعاد شخصیت کو جس طرح سمجھا، جانا اور پیش کیا ہے وہ ان کی اپنے دامنِ نگاہ کو وسعتوں، وجدانی نظر کی جولانگاہوں اور تفکر و تدبر کی بلند پروازوں پر دال ہے

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا است

میرا سچا احساس جس میں ستائش کی کوئی بات نہیں، یہ کہتا ہے، کہ اس کتاب میں جو الفاظ ہیں، وہ ڈاکٹر علی شریعتی کے دل کے ٹکڑے ہیں۔ جو جملے ہیں وہ جہان معنی کے خزینے ہیں۔ جو نثر پارے ہیں وہ بصیرتوں کے دفینے ہیں۔ جو افکار ہیں، وہ گلستان حکم ہیں، جو خیالات ہیں وہ نکات عارفانہ ہیں۔ غرض یہ ایک ایسا گنجینۂ فکر ہے۔ جس میں بوقلموں زندگی اور زمانے کے بہت سے تصورات لولوئے لالہ کی طرح بکھرے ہوئے ہیں۔

"ماو اقبال" جو دو جلدوں پر مشتمل ہے ڈاکٹر علی شریعتی کے وصال کے بعد شائع ہوئی تھی۔ اس کی پہلی جلد ڈاکٹر موصوف کی اس تقریر پر مشتمل ہے جو آپ نے 1970 میں حسینیہ ارشاد تہران کے زیر اہتمام اقبال کانفرنس میں کی تھی۔ جب کہ دوسری جلد آپ کی ان تصانیف کا مجموعہ ہے جو آپ کے مرتبین نے اسی عنوان سے طبع کی تھیں۔ .... "ہم اور اقبال" اسی کتاب کا ملخص ترجمہ ہے جو جناب جاوید اقبال قزلباش کی گہری سوچوں کا حاصل اور ڈاکٹر سید علی رضا نقوی کی تصیحی عرق ریزی کا نتیجہ ہے۔ اس کتاب کا پہلا حصہ "ماو اقبال" کی پہلی جلد کا ترجمہ ہے جب کہ دوسرا حصہ، اصل کتاب کی دوسری جلد کے ایک حصے کا ترجمہ اور وہ بھی کچھ استثنا، اور تصرفات کے ساتھ، کیونکہ طولانی موضوعات، معترضہ جملوں، بعض مثالوں اور شہادتوں نیز ایرانی و فارسی کنایات و اشارات کو حذف کر دیا گیا ہے۔ ثقافتی قونصلر، سفارت اسلامی جمہوریہ ایران نے پاکستان کے ثقافتی معاہدے کی چالیسویں سالگرہ کی مناسبت سے اس کتاب کی اشاعت کر کے ہمیں یہ پیغام دیا ہے کہ عرفانِ اقبال کے یہ زاویے کس قدر دوررس بصیرت کے حامل ہیں۔

اس کتاب کے عنوان میں "اقبال" اور "ہم" دونوں استعاراتی جہتیں رکھتے ہیں۔ استعارے کا مفہوم کثیر سمتی اور متحرک ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ صرف خیال ہی کو نہیں چھوتا بلکہ خیال کے ساتھ جو جذبات اور احساسات وابستہ ہوتے ہیں ان کی شدت اور گہرائی کو بھی ابھارتا ہے۔ وہ متحرک اس معنیٰ میں ہے کہ اس کا مفہوم اپنی اشاریت کی وجہ سے تخیل کے لئے معنی کی راہیں کھولتا ہے۔ (2) چنانچہ یہاں "اقبال"، ہماری اس بنجر سرزمین اور اس دور کے پر آشوب اور طوفانی صحرا میں شادابی زرخیزی اور عظمت رفتہ کا استعارہ ہے .... جب کہ "ہم" اس مشرقی انسان کا استعارہ ہے جو اس خطہ ارض اور اس تاریخ سے وابستہ ہونے کے ناطے سے بحیثیت انسان فطرت اور مغرب کے گرانڈیل دیو کے سامنے کھڑا ہے اور جس کے وجود کے اثبات کے لئے سچی وجودی خود آگہی ہی ضروری ہے۔ کیونکہ وجودِ غیر کے بہت سے عناصر نے ہمارے اندر حلول کر کے ہماری تاریخی

فطرت کو آلودہ کر دیا ہے جس کے نتیجے میں "خود" کے بجائے "غیر" نے ہم میں گھر کر لیا ہے۔(3)
اس کتاب کے حصہ اول کے 87 صفحات چار نمایاں موضوعات پر مشتمل ہیں۔

(الف) دور حاضر میں مسلمانوں کا تشخص اور ان کی تکالیف اور استفسارات۔
(ب) میری بیسوی صدی کے آلام
(ج) پراگندہ اسلام اور منتشر علی
(د) عمارت کی تجدید

ایک طرف تو یہ وہ موضوعات ہیں جو اسلام، مسلمان اور عالمی انسان کے حال اور مستقبل کے بارے میں فکر مند دانش وروں کو آتش زیرپا رکھتے ہیں اور دوسری طرف یہاں وہ راہ متعین کی گئی ہے جس پر گامزن ہو کر مسلمان اپنی کمیت کو مشخص کر کے عمارتِ اسلام اور عظمتِ انسان کی پرشکوہ تجدید کر سکتے ہیں۔ .... اس کتاب کے دوسرے حصے کا نمایاں موضوع "جہاں شناسی" ہے جس کے ذریعے خود آگہی سے لے کر تیسری دنیا، اسلام، 20ویں صدی، مشرقی نظر اور مشرق کی طرف واپسی کے سارے پہلو روشن ہو جاتے ہیں۔

دور حاضر کے مسلمانوں کے بارے میں ڈاکٹر علی شریعتی کا خیال ہے، کہ اسلامی معاشرہ اپنے جمود اور تعطل کے دور میں تنگ قومی اور بند مقامی شکلوں کے اندر منجمد ہو کے رہ گیا ہے اور اسلام کی عالمی بصیرت اور تصورِ کائنات کو فراموش کر چکا ہے، جس کے نتیجے میں اسلام کی آفاقی وحدت پارہ پارہ ہو گئی ہے۔ اور مسلمان روایات، تاریخ اور گوناگوں جاہلیت سے مخلوط مذاہب، غیر اسلامی افکار اور مسخ شدہ عقائد کے دائرے میں محصور اور محبوس ہو کے رہ گئے ہیں۔

20ویں صدی کے آلام کے ضمن میں اپنی ذات کو نمائندہ بناتے ہوئے وہ مشرقی انسان کے اس المیے کا ذکر کرتے ہیں کہ اس صدی سے عملاً وابستہ ہونے کے باوجود وہ عملی طور پر اس میں جینے کا حق نہیں پا رہا۔ کیونکہ وہ اس کے جدید تمدن کی برکات سے محروم ہے۔ مگر ستم ظریفی یہ ہے کہ اس کے باوجود اُسے اس کے تمام انحرافات، مصائب اور بدبختیوں سے اسے حصہ بھی مل رہا ہے۔ جس سے اس کی تقدیر اور معاشرہ دونوں متاثر اور مجروح ہیں۔ ان کے بقول صنعت، علم، جبر، ترقی، انقلاب اور وجود و عدمِ وجود کا نام مغربی تمدن ہے، اور مشرقی انسان اس گرانڈیل دیو کے مقابل سینہ تانے کھڑا ہے۔ اب اُسے اِس بڑے طوفان کے اچھے اور برے مناظر میں، اپنے مقام کا تعین کرنا ہے۔ ....

پراگندہ اسلام کے حوالے سے اسلام کی عظمت اور مسلمانوں کے عملی تضادات کے

بارے میں ان کا خیال ہے کہ تاریخ میں پہلی بار، اسلام ایک ایسا مکتب تھا کہ جس نے مذہبی احساس اور مذہب کی معجزہ آسا طاقت کو، جو ہمیشہ فرد کے میلان بہ درون اور اس کی ذہنیت میں متشکل ہوتی ہے اور تزکیہ نفس اور عالی انسانوں کی تعمیر کر رہی ہوتی ہے، آسمان سے زمین پر لے آیا............
مگر اب اسلام بھی موجود ہے۔ مکتب اسلام بھی موجود ہے، مگر جس چیز نے مکتب اسلام کی اس انقلابی طاقت اور حیاتیاتی جوش و خروش کو اس سے چھین لیا ہے، وہ پیکر اسلامی کا بکھر جانا ہے۔ (4)

ع...... ہوس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے نوعِ انساں کو

اب سوال یہ ہے کہ اس شکستہ عمارت کی تعمیر اور تجدید کیسے اور کیونکر ہو؟ ڈاکٹر علی شریعتی اس کا یہ حل تجویز کرتے ہیں کہ اب ضروری یہ ہے کہ ہم واپس جائیں اور قُرونِ اولیٰ کی طرح مثالی شخصیتوں کی تشکیل اور مکتبِ اسلام کی تعمیر نو کریں اور اس منتشر کتاب کی دوبارہ شیرازہ بندی کریں، جس کا ہر ورق اور ہر باب جدا جدا ہے اور جدا جدا لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔ سوال یہ ہے کہ اب اس کی تدوین کیونکر ہو؟ اس کے لئے ایک صحیح فکر، ایک صحیح روح کی حامل اور ایک وجود کامل کی ضرورت ہے۔ اور 20 ویں صدی میں یہ کامل وجود علامہ اقبال کا ہے جس میں ان بنیادی عناصر کی شیرازہ بندی جلوہ گر ہوئی ہے۔

خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات

ڈاکٹر علی شریعتی کا خیال ہے کہ علامہ اقبال نے زمانے کی تمام فلسفیانہ اور روحانی منزلوں کو اپنی بصیرت، ایمان اور عرفانِ اسلامی سے صحت یابی کے ذریعے طے کیا اور یہ کہنا بجا ہوگا کہ وہ ایک ایسا مہاجر مسلمان ہے جو ہندوستان کے پراسرار اوقیانوس سے اٹھا اور یورپ کے پُر اقتدار بلند ترین کوہستان کی چوٹیوں پر پہنچ گیا، اور پھر اس درجہ عرفانی عظمتوں کے ساتھ ہمارے درمیان یعنی اسلام میں لوٹ آیا۔ (5) یہی رجوع خود شناسی ہے۔ اور یہ خود شناسی مشرق کی طرف واپسی کا نام ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر اقبال نے اس عالم شناسی کے ساتھ اور جہان و انسان کے بارے میں فلسفیانہ روحانی تفسیر کے ذریعے معاشرتی مکتب کی بنیاد رکھی جس کی منزل تمام انسانیت کی تعمیر نو اور نئے تمدن کی تشکیل ہے۔ لہذا یہ کہنا بجا ہے کہ یہی وہ شخص ہے جس نے 20 ویں صدی کی عمارت کو علی کی فکر پر تعمیر کیا ہے اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی تحریک، جس کا آغاز سید جمال الدین نے کیا تھا اور محمد عبدہ مصری نے اپنی جدید قرآنی بصیرتوں سے اس کی راہوں کو مستنیر کیا تھا، اقبال اس کو ارتقاء پر لے گیا۔

ع..... اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا

فیض یہ کس کی نظر لا ہے کرامت کس کی ہے

وہ کہ ہے جس کی نگہِ مثلِ شعاعِ آفتاب

ڈاکٹر علی شریعتی اسلامی نشاۃ ثانیہ کی اس تحریک کو Renaissance کا نام دیتے ہیں۔ کیونکہ قرونِ وسطیٰ کو اس یورپی تحریک کا نام اپنی روح کے ساتھ اب اسی کے لئے سجتا ہے۔

• آخر میں، میں اسی Quotation کے وہی الفاظ جناب علی شریعتی کی نذر کرنے کی جسارت کرتا ہوں، جو آپ نے علامہ اقبال کی نذر کئے تھے۔

"جب ہم کسی بڑے انسان سے متعارف ہوں جس نے کامیاب زندگی گزاری ہو، تو اس کی روح کو اپنے جسم میں بسا لیتے ہیں اور اس کے ساتھ جیتے ہیں۔ اور یہ عمل ہمیں زندگی بخشتا ہے۔"(6)

میں سمجھتا ہوں کہ اس کتاب کے حوالے سے میں، ڈاکٹر علی شریعتی سے جس طرح متعارف ہوا ہوں۔ اس نے مجھے بھی زندگی بخشی ہے۔

(یہ مضمون خانہ فرہنگ ایران ملتان میں "ہم اور اقبال" کی تقریب رونمائی میں پیش کیا گیا)

حوالے:

1۔ ڈاکٹر علی شریعتی۔ "ہم اور اقبال" (ترجمہ۔ جاوید اقبال قزلباش) ص100، دفتر ثقافتی قونصلر، اسلامی جمہوریہ ایران، اسلام آباد، 1996)

2۔ ممتاز حسین۔ "رسالہ در معرفت استعارہ" "نیا دور (دوسرا شمارہ) 3، 4، ص 97، کراچی

3۔ ہم اور اقبال، ص 103

4۔ ایضاً، ص 24، 29

5۔ ایضاً، ص 38

6۔ شاندل، "سبز کتابچے" ہم اور اقبال، ص 19

اقبال اور خانقاہ

سید حماد الرحمن
مدیر انگریزی

عارف کا ٹھکانا نہیں وہ خطہ کہ جس میں
پیدا کُلہِ فقر سے ہو طُرّۂ دستار!
باقی کُلہِ فقر سے تھا ولولہ حق!!
طُرّوں نے چڑھایا نشۂ خدمتِ سرکار

آخر اقبال خانقاہوں کے خلاف کیوں ہے؟

اس بات کی بہت واضح وجوبات ہیں۔ خانقاہوں کی بے عملی اور ترکِ اسباب کی تعلیم مسلمانوں کو میدان عمل سے دور کر رہی تھی۔ زندگی کی اونچ نیچ اور حالات کے مقابلے سے فرار کی چند راہوں میں سے ایک راہ مذہب اور تصوّت بھی ہے۔ خانقاہوں میں درس و تدریس اور علم و عمل کی وہ شاہراہیں جو کبھی ظاہر اور باطن ہر دو کی علویت تک پہنچا کر دوسروں نکے لئے مفید اور مقرب بارگاہ الٰہی بناتی تھیں اقبال کے دور میں رینگتے ہوئے مسلمان کو قصر مذلت کے اندھیروں کا پتہ دینے لگی تھیں۔ خانقاہیں اس وقت کے مسلمان کو ذہنی نشہ "دان" کر رہی تھیں اور ہندوستانی مسلمان کا تغافلِ مجرمانہ اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ انہیں اپنی حالت کا احساس تک نہ ہوتا تھا۔ ذکر و فکر صبح گاہی اور سستی کے افیونی کیف نے اپنی پہچان تک سے معذور کر دیا تھا۔

آں چناں زار از تن آسانی شُدی
در جہاں ننگِ مسلمانی شُدی

یا پھر

یہ ذکرِ نیم شبی یہ مراقبے یہ سرور
تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

خانقاہ کے مقدس ادارے کو بدنام کرنے والے ایسے علمائے بے عمل، صوفیائے ریاکار اور خرقۂ سالوس کے مہاجن تھے جن کے گمراہ کن اقوال و افکار نے ایک عام مسلمان کو اپنی انفرادی اور اجتماعی اہمیت پہچاننے سے عاجز کر دیا تھا۔ علماء کے فروعی مناظرات، مشائخِ کرام کی طریقتیں اور طور طریقے ذات کے مفاد کے گروہی غلطاں و پیچاں تھے۔ خواجگی کسی کے درد کا درماں ہونے کے بجائے جُبہ و دستار سے آگے ہی نہ بڑھتی تھی۔ اگرچہ تمام علماء تو علمائے سُو نہ تھے مگر علمائے ظاہر کا Exposure زیادہ ہونے کی وجہ سے بندۂ سادہ، خدا، مذہب، ذات، کائنات اور ہونے نہ ہونے کے گرداب میں ہچکولے کھاتا رہتا۔ بے عمل و منتشر۔

یہی شیخِ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیمِ بوذرؓ و دلقِ اویسؓ و چادرِ زہراؓ

اقبال کی بصیرت، عمل، وحدت کردار و افکار اور جستجوئے پیہم کو، مسلمان کی ضرورت گردانتی تھی اور اسی لئے اقبال نے بندۂ خاکی کے لئے عمل سے جنت و جہنم کی نوید بھی سنائی۔ اقبال مسلمان کو خانقاہ سے باہر نکالنا چاہتا ہے۔ بے یقین، بے مقصد اور بے منزل ہجوم بیکراں کو اقبال نے ملت بیضا اور وحدت ایمانی کے تصور سے آشنا کیا۔ خانقاہوں میں ھاؤ ھو کرنے کے بجائے قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی طرح نرم دمِ گفتگو اور گرم دمِ جستجو کی تلقین کرتے ہوئے عمل کی شاہی اور شاہ سوارانِ عمل کی شان بتائی۔

اقبال خانقاہ کے خلاف ہوتے ہوئے بھی اس کا دکھ محسوس کرتا ہے اور اقبال کو خانقاہ کے اجڑنے کا غم بھی ہے کیونکہ خانقاہیں اور مدرسے ہی وہ نظریاتی ٹکسال تھے جہاں اللہ کے شیر اور سپاہی ڈھلتے تھے۔

بقول اقبال!

تھا جہاں مدرسۂ شیری و شاہنشاہی
آج ان خانقہوں میں ہے فقط رُو باہی

اور

قُم باذن اللہ کہتے تھے جو رخصت ہوئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن!

اصل میں اقبال ان کرگسوں کے خلاف تھا جو شاہینوں کے نشیمن میں گھس گئے تھے اور

خانقاہوں کے زرِ خالص کو برابر مِس خام بنا رہے تھے۔ اقبال خانقاہ کے ظاہر سے بیزار تھا اور خانقاہ کی روح کو دوبارہ زندہ کرنے کا متمنی۔ اقبال اس خانقاہ کا خواہشمند ہے جس کے والی "قبلہ سرکار"، "رہبرِ سالکاں" قسم کی شے نہ ہوں بلکہ اصلی باطنی نظام پر فائز ہوں اور ملتِ اسلامیہ کے باعمل لوگ ہوں۔ رحمت کی بارش میں اپنے نصیب کا آنگن ہی سوکھا رہ جائے تو فائدہ ایسی بارش کا۔

شیوخِ حرم، قبلۂ محترم افراد کا مرتبہ دوسروں میں احساسِ کمتری پیدا کرنے کے علاوہ اور کیا کر سکا ہے۔ ساری دنیا، غوث، ولی، قطب، ابدال ہو جائے اگر ہم ہی اللہ والے نہ ہوئے تو فائدہ؟ جب تک کہ کسی صوفی کی "زندگی" ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی میں مثبت تبدیلی نہ لا سکے ہمارے لئے اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ خانقاہیں بسانے کے لئے انسان کا دل ہے۔ علم کی عملی تفسیر کے لئے مظاہرِ کائنات انسان کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ یہی اسلاف کا وہ طریقہ تھا جس کے لئے اقبال دعا گو تھا۔

اقبال کا نظریہ Pragmatic تھا۔ غلامی، ذہنیت کا نام ہے اور کسی بھی باعمل و باکردار Unison انسان کو غلام نہیں بنایا جا سکتا۔ جو علم، عمل میں نہ آئے وہ ایسے ہے جیسے گدھے پر کتابوں کا بوجھ۔ کمزور قومیں، حاکم قوموں کو Slow Poisoning کے طور پر مسلک گوسفندی کا درس دیتی ہیں جس سے وہ تن آسانی کا شکار ہو کر اپنا جوہر خودی کھو بیٹھی ہیں۔ یہی ہندو، یونانی اور بدھ فلسفے نے مسلمان علما، اور حاکموں کے ساتھ کیا۔ افلاطونی فلسفہ اعیان اور ایرانی تصوف نے ہندوستانی مسلمان کو بالکل بے عمل کر دیا تھا۔ شیرِ نر اپنے پنجے اور دانت بھول کر بھیڑوں کے ساتھ گھاس چرنے لگا۔

شیرِ بیدار از فسونِ میش خفت
انحطاطِ خویش را تہذیب گفت

اور اقبال کا وقت وہ وقت تھا جب بھیڑیں شیر کا استحصال کر رہی تھیں اور شیر کو احساسِ ذلت ہی نہ تھا۔

وائے بر عشقے کہ نارِ او فسرد
در حرم زائید و در بتخانہ مُرد

خانقاہ...... جو کبھی شیروں کی کچھار ہوا کرتی تھی وہاں روباہی جنم لے چکی تھی اور اقبال اس

کی اصلاح چاہتا تھا- خوابیدہ شیر کو شیروں والا علم سکھانا چاہتا تھا- اسی لئے اقبال نوحہ کناں ہے کہ

اب حجرۂ صوفی میں وہ فقر نہیں باقی

خونِ دلِ شیراں ہو جس فقر کی دستاویز

اقبال، مولانا رومی کو اپنا مرشد قرار دیتا ہے- اقبال نے رومی سے روحانی و فکری استفادہ کیا اور "پیرِ رومی" کے فیض نے "مرید ھندی" کو اقبال مند کر دیا- مگر اقبال نے رومی کی Philosophy of Self-Negation کو آگے بڑھانے کے بجائے انسان کو نکتہ پرکارِ ھستی کہا ہے اور کائنات کے مدار کا محور اقبال نے انسان کی ذات کو قرار دیا- عظمت آدم کو سامنے رکھتے ہوئے حادث و قدیم کے انطباق کے لئے "خودی" جیسا Dynamic نظریہ پیش کیا- اقبال

من عرفہ نفسہ فقد عرف ربہ

کو تسخیرِ کائنات بلکہ رموزِ حیات و ممات اور سلسلہ ہائے ناممکنات تک کو فتح کرنے کی دلیل قرار دیتا ہے-

اگر مسلمانوں کی ابتدائی تاریخ دیکھی جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ آنحضرت محمد ﷺ کے دور میں خانقاہ کا Institution نہیں ملتا- اس کی بڑی سیدھی سی وجہ یہ ہے کہ اس دور میں صحابہ کرامؓ خود باعمل و باکردار تھے وہ سب ہی صوفی تھے اور اسلام کی مکمل ترین شکل کے مطابق زندگی بسر کر رہے تھے اور سب سے بڑی بات یہ کہ منبعِ رشد و ھدایت ﷺ ان کے سامنے تھا- خانقاہ کی ضرورت ہی نہ تھی- بزبانِ اقبال

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری

کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری

ولایت و تصوف کی حقیقت ہے کیا؟ اصل میں ولایت و تصوف کا مطلب ہے Theory اور Practice میں Gap ختم کرنا- یا یوں کہا جائے کہ علم و فعل اور قول و عمل کو Correspondingly عملی صورت میں اجاگر کرنا- اقبال خانقاہ و مدرسے کا قائل ہے مگر جب ان اداروں سے نیم مردہ، سسکتے اور رینگتے ہوئے بے عمل مسلمان نکلیں تو پھر اقبال خدا کو بیچنے والے تاجرانِ حرم اور سادہ مسلمان کو ذھنی و روحانی بھول بھلیوں اور روح کی غلام گردشوں میں بھٹکانے والے خداوندانِ مکتب و پیرانِ طریقت کو کسی صورت میں معاف کرنے کو تیار نہیں- سچ تو یہ ہے کہ اقبال کا رویہ اور بیان آج کے رہبروں پر بھی صادق آتا ہے-

الغرض اقبال سکوت و ٹھہراؤ کے بجائے مسلمان کے لئے تگا پوئے دمادم کو باعث حیات سمجھتا ہے اور خانقاہوں کو Rebuke کرنے کے ساتھ ہی ان کی اصلاح کا دل سے خواہشمند ہے۔
یادر ہے کہ اقبال خود بھی قادری سلسلے میں بیعت تھا اور اللہ والوں سے ملنے کا شوقین۔
اقبال ہی کے الفاظ میں ایک مسلمان کا جذب دعا!

عطا اسلاف کا جذبِ دروں کر
شریکِ زمرۂ لایحزنوں کر
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا ہوں
مرے مولا مجھے صاحبِ جنوں کر

جستجو و آرزو، عمل کے محرک ہیں، ہر آرزو اپنی تکمیل کے ساتھ ایک نئی آرزو تخلیق کرتی ہے۔ نئی آرزو سے نیا عمل پیدا ہوتا ہے۔ ہر نئے عمل سے انسانی خودی اپنے ارتقاء کی ایک نئی منزل طے کرتی ہے، ان مراحل میں سے ہر ایک سوز و ساز و درد و داغ کی وارداتوں سے بھرپور ہے۔ انسان کی عظمت کی سب سے بڑی دلیل اور سب سے بڑا ثبوت یہی ہے کہ یہ دائرہ کبھی مکمل نہیں ہوتا اور زمان و مکان کی حدود و قیود انسان کے ارتقاء میں حائل ہونے سے عاجز ہیں۔
(فیض احمد فیض۔ میزان، ص 273 ناشرین، لاہور، 1962)

نظم

محمد نعیم حسن سرگانہ۔ بی۔ایڈ
سیکشن بی۔ رولنمبر 272

فضا کو یاد بھی نہیں
یہ بات آج کی نہیں
بہت دنوں کی بات ہے
بہار پُر شباب تھی
فضا بھی خوشگوار تھی
نہ جانے کیوں میں چل پڑا
میں اپنے گھر سے چل پڑا
کسی نے مجھ کو روک کر
بڑی ادا سے ٹوک کر
کہا کہ لوٹ آئیے
میری قسم نہ جائیے
مگر مجھے خبر نہ تھی
سوال پہ نظر نہ تھی
نہ جانے کیوں میں چل پڑا
میں اپنے گھر سے چل پڑا
کوئی نہیں جو روک کر
بڑی ادا سے ٹوک کر
کہے کہ لوٹ آئیے
میری قسم نہ جائیے..............
میری قسم نہ جائیے..............

تعلیمات

تعلیم کے عصری تقاضے

ڈاکٹر شمیم ترمذی

پاکستان میں رہتے ہوئے جب ہم "عصر حاضر کے تعلیمی تقاضے" یا "تعلیم کے عصری تقاضے" کہتے ہیں تو ہم دراصل اپنی "مثالیت پسندی" کا مظاہرہ کر رہے ہوتے ہیں۔ اس طرح ہم زمین پر کھڑے کھڑے آسمان کو چھونے کی بات کرتے ہیں۔ یوں ہم وادی کے نشیب میں رہتے ہوئے، پہاڑ کی چوٹی پر اڑتے بادل کو اپنی بانہوں میں لینے کی کوشش کرتے ہیں .... یاد رہے کہ "عصر حاضر" ایک وسیع اصطلاح ہے۔ یہ زمانہ پوری کائنات پر محیط ہے۔ اس زمانے میں ساری دنیا کی Activity شامل ہو جاتی ہے۔ اگر ہم پاکستانیوں کو تعلیم کے عصری تقاضوں کو پیش نظر رکھنا ہے تو سوال پیدا ہوگا کہ ہمیں کن تعلیمی تقاضوں کو پورا کرنا ہے؟ اُن کے تعلیمی نظام کو اپنانا ہے جو چاند کی سیر کے بعد مریخ کے سفر پر رواں رواں ہیں؟ یا اُن "ABORIGINESE" کے تعلیمی معیارات کو نمونہ بنانا ہے جو اب تک جنگل کی زندگی بسر کرنے پر مُصر ہیں؟ ظاہر ہے ہم کہ ٹھہرے آئیڈیالسٹ، تقدیر پرست اور صرف معجزوں کے انتظار میں جیون بتانے والے لوگ .... ہم لازماً سینے پر ہاتھ مار کر کہیں گے کہ اکیسویں صدی میں جب مریخ کی سطح پر کسی بھی ملک کا انسان قدم رکھے گا تو ہم پہلے سے وہاں موجود ہوں گے۔ آسمانوں پر اڑنا، خلاؤں کو مسخر کرنا، آفاق کو مٹھی میں لینا .... اچھا خیال ہے، سُہانا خواب ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ "A Nation on Vacation" کو حسین خواب دیکھنے کا حق بھی حاصل ہے لیکن اسے تعبیر صرف اور صرف اس وقت ملے گی جب وہ دنیا کو "A Nation on Wheels" بن کر دکھائے گی۔ اس کے لئے ہمیں تعلیم کے عصری تقاضوں پر کمند ڈالنے سے پہلے تعلیم کے قومی تقاضوں کو پورا کرنا ہوگا۔ قومی تقاضوں کی تکمیل کے بعد ہی آفاقی اور عصری معیارات کی بات ہمارے لبوں پر سجے گی۔

ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم تعلیم کے قومی تقاضوں کو شاید کمتر اور ارزاں سمجھ کر نظر انداز کرتے چلے آئے ہیں۔ تعلیم کے قومی معیارات کو دیسی قرار دے کر انہیں دیس نکالا دینے پر تُلے ہوئے ہیں اور بدیسی معیارات کا پٹا گلے میں ڈال کر اپنے اصل مالکوں کو اپنی وفاداری کا ثبوت فراہم

کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ یقیناً آپ کی سماعت نے بھی ہوا کی لہروں پر تیرتے ایسے فخریہ جملوں کو ضرور محفوظ کیا ہوگا مثلاً

* ہمارے تعلیمی ادارے کا نصاب وہی ہے جو واشنگٹن کے سکولوں میں پڑھایا جاتا ہے۔
* ہمارے نئے ادارے کی عمارت کا نقشہ آکسفورڈ یونیورسٹی بنانے والے Architect نے تیار کیا ہے۔
* ہماری پرنسپل، ایسی عظیم امپورٹڈ لیڈی ہے جس کا نسب، ساتویں پشت میں مانٹی سوری سے جا ملتا ہے۔
* ہمارے ادارے میں کوئی شخص بھی، سوائے انگریزی کے، کوئی زبان نہیں بول سکتا۔
* ہمارے ادارے میں داخل ہوتے ہی آپ کو یہ محسوس ہوگا کہ آپ پاکستان میں نہیں ہیں۔

آپ بتائیں کہ چند زر اندوزوں کو پاکستان میں رہ کر ان گمراہ کن اور وطنیت گریز جملوں کو نعرے کی صورت میں ادا کرنے کا حق کس نے دیا ہے؟ آپ فرمائیں کہ نام نہاد عصری اور آفاقی تعلیم کی منزل تک، اُڑ کر پہنچنے والے مٹھی بھر مراعات یافتہ لوگ، قومی تعلیم کی راہ پر لاکھوں پیدل چلنے والوں کے لئے حشر کا سامان کیوں کر رہے ہیں؟ ممکن ہے، آپ اس صورتحال کا سبب بتانے میں مصلحت سے کام لیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کی ایک وجہ قومی دھارے میں چلنے والوں کا احساس کمتری بھی ہے۔ محروم طبقے کے افراد واقعی یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ مشرق کی نجات، فقط تعلیم کے مغربیانے میں ہے اور پاکستان میں انگریزی بولے بغیر عزت کا حصول ناممکن ہے۔ ہمارے نوجوان دراصل ایک طرح کے تعلیمی فوبیا میں مبتلا ہیں۔ اُن کے قلب و ذہن پر بے سمت تعلیم اور بے روزگاری کا خوف مسلط ہے۔ انہیں اونچے معاشی طبقے کی اولاد کے شب خون کا خوف ہے۔ انہیں دوہرے تعلیمی نظام میں اپنی شناخت کے گم ہو جانے کا خوف ہے۔ انہیں اپنے گھر کے دروازے پر دستک دینے والے، دستانہ پوش ہاتھ کا خوف ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس خوف کی ماہیت کو ایک مثال سے سمجھانا آسان ہوگا .... دروازے کے باہر مرغی کٹ کٹ کر رہی تھی۔ گبھرو جوان گھر سے باہر نکلنے کو تیار نہ تھا۔ کہتا تھا "اندیشہ نہیں، یقین ہے کہ مرغی مجھے چگ جائے گی۔" اپنوں نے سمجھایا "تم صحتمند جوان ہو اور مرغی ننھی چونچ والی شے۔ وہ بھلا تمہیں کیسے چگ جائے گی؟ سمجھ میں آ گئی نا بات۔" جوان بولا "بالکل سمجھ گیا۔" پوچھا کہ اب باہر کیوں نہیں جاتے؟ نوجوان بولا "میں تو سمجھ گیا لیکن یہ بات مرغی نہ سمجھی تو میرا کیا بنے گا؟"

.... میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ہمارے نوجوان کو خدشہ ہے کہ انگریزی نہ بول سکا اور so called Quality Education حاصل نہ کی تو تہذیب کی مرغی اسے چگ جائے گی۔

اس خوف کو ختم کرنے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ خوب کے جذبے کی De-conditioning کی جائے۔ قومی دھارے کے تعلیمی اداروں کے معیار کو بہتر بنانے پر پوری توانائیاں صرف کی جائیں اور اساتذہ اپنے طلبہ کو باور کرائیں کہ ان کا مستقبل قومی تقاضوں کی تکمیل کرنے والی تعلیم ہی سے وابستہ ہے۔ یہی تعلیم انہیں معاشرے میں کامیاب و کامران کرے گی۔ ان کی بازار میں قیمت ہے۔ وہ بے خوف و خطر اپنے گھر سے باہر نکلیں۔ اب انہیں کوئی بھی طبقاتی اور تہذیبی مرغی کبھی نہ چگ سکے گی ....

دنیا بدل گئی۔ معاشرے کی ضروریات بدل گئیں، قوموں کی سماجی اور سیاسی اور اقتصادی قدریں بدل گئیں، لیکن ہم اپنے آپ کو اس تیزی کے ساتھ نہ بدل سکے جس کا ایک متحرک سماج مقتضی ہوتا ہے۔ روس اور امریکہ کی مسابقی دوڑ آسمانوں کو چھو رہی ہے۔ قرآنی الفاظ میں دونوں قومیں تسخیر مہر و ماہ کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔ لیکن وہ جسے سخر الشمس والقمر کی راہ دکھائی گئی تھی وہ ستاروں کی گزر گاہوں میں کہاں اور کیسے الجھ کر رہ گیا؟ ان قوموں کی قوت تسخیر کا ایک ہی راز ہے۔ انہوں نے حالات کے تقاضوں کے مطابق اپنے مندرجات تعلیم کو بدلا اور اس میں فکر کی اس شوخی کو باریابی کا موقع دیا جو انسان کو ناقابل تسخیر برفانی پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھنے کا عزم عطا کرتی ہے اور طوفان خیز سمندروں کے سینے کو چیرنے کا سودا۔

(ڈاکٹر محمد عبدالعزیز۔ تربیت اساتذہ کے مسائل)

انگریزی، ترقی اور ذریعۂ تعلیم

پروفیسر عمر قادری

عقل و دانش سے بہرہ ور ہر صاحب فہم جانتا ہے کہ زندگی اپنی اصلیت کے اعتبار سے مقصدیت کا نام ہے۔ کیونکہ بے مقصد زندگی حقیقتاً زندگی ہوتی ہی نہیں۔ اس کائنات میں اللہ تعالیٰ نے کوئی زندہ وجود ایسا تخلیق نہیں کیا جس کا کوئی مقصد یا افادیت نہ ہو، نباتات کی زندگی میں جھانکئے یا جمادات پر نظر ڈالئے، حشرات و حیوانات کو نگاہ میں لائیے، ان میں سے ہر ایک کو آپ یا تو ایک دوسرے کی ضروریات کو پورا کرتا ہوا دیکھیں گے یا خلق لکم ما فی الارض جمیعاً کی تعبیر کے مطابق انسانی ضروریات کا کفیل پائیں گے۔ جب انسان کے مقابلے میں کائنات کی یہ کم تر مخلوقات بے مقصد نہیں تو خود انسان کی ذات کیوں بے مقصد ہو سکتی ہے۔ انسان تو خود مقصود کائنات ہے سو اس کی زندگی کا تو مقصد بھی اس کے مقام و مرتبہ کے مطابق اعلیٰ ہونا چاہیے اور وہ فی الحقیقت ہے۔

اہل دانش کسی بھی دور کے ہوں یا کسی بھی علاقے اور نسل کے، سب کے ہاں یہ امر، امرِ مسلم ہے کہ زندگی اپنے مقاصد کی رفعت سے عبارت ہے اور مقاصد کی بلندی کا شعور تعلیم سے حاصل ہوتا ہے۔ حقیقی انسانی دانش اس پر بھی ہمیشہ متفق رہی ہے کہ انسانی زندگی کے مقاصد جزوی یا محض یک طرفہ نہیں ہوتے بلکہ جامعیت اور کلیت کے حامل ہوتے ہیں اور یہ بات اس لئے بھی بلا دلیل درست اور صحیح تسلیم کی جاتی ہے اور کی جانی چاہئیے کہ نفس انسانی نہ تو نرا حیوانی وجود ہے اور نہ ہی مجرد عقلی یا اخلاقی، اللہ نے نفس انسانی میں حیوانیت اور ملکوتیت (دانش نورانی) کو ایک دوسرے میں اس طرح ضم کر دیا ہے کہ ایک کا انکار دوسرے کے وجود کی بھی نفی پر منتج ہوتا ہے۔ اس تمام تر احساس و ادراک کا اصل ذریعہ بھی تعلیم اور صرف تعلیم ہے۔

تعلیم کیا ہے اور اس کے اہداف کیا ہیں، اس کو بھی جان لیجئے تعلیم ہے نموئی تغذیہ Growth Nutrition یعنی وہ غذا جس سے نفس انسانی کی نمو ہوتی ہے نفس انسانی کے تین پہلو ہیں۔ ایک اس کا حیوانی وجود، دوسرا عقلی وار تیسرا اخلاقی، دوسرے اور تیسرے کو ملا کر اس

کا نفسیاتی وجود کہ لیجئے یہ بھی جان لیجئے کہ نفسیاتی وجود یعنی عقلی و اخلاقی ہی اصل انسان ہے جو مادی وجود کو اپنے اظہار کا وسیلہ بناتا ہے۔ تعلیم اس نفسیاتی وجود کے لئے براہ راست اور مادی وجود کے لئے بالواسطہ نموئی تغذیہ مہیا کرتی ہے۔ اس نموئی تغذیہ کا اصل ہدف ہے نفس انسانی کی ہمہ گیر نشو نما یعنی انسان کے عقلی اور اخلاقی وجود کی اس طور پر تعمیر کہ وہ صحیح اور غلط، جائز اور ناجائز، حلال اور حرام، نافع اور ضار غرضیکہ حق و باطل میں ٹھیک ٹھاک امتیاز کرنے کے لائق ہو جائے تاکہ وہ حق کو ہر حال میں صحیح جانے اور بلا تردد قبول کرے اور باطل کو خواہ وہ کیسے ہی پرکشش پردوں میں لپٹا ہو پہچانے اور مسترد کرے۔

حق و باطل کا ایک معیار اہل مغرب کا ہے اور ایک ہم پاکستانیوں کا، حق و باطل سے متعلق اہل پاکستان کے تمام تصورات کا سرچشمہ ان کا دستور مملکت ہے جو اپنے نیو کلیس قرارداد مقاصد کی روشنی میں ریاست کو شورائیت کی حامل اسلامی جمہوریہ قرار دیتا ہے۔ سو آئین کے حوالے سے ہر وہ قوت حق ہوگی جسے اسلام حق قرار دیتا ہے خواہ مغرب اس پر کتنا ہی ناک بھوں چڑھائے اور ہر وہ بات باطل ہوگی جسے اسلام مسترد کرتا ہے۔ خواہ اہل مغرب کا حسی تمدن (Sensate Culture) اسے کسوٹی کے طور پر کیوں نہ قبول کر چکا ہو۔ اسلام جن رویوں کو مثبت قرار دیتا ہے، ہمیں پاکستانی تعلیم کو انہیں کی نشو نما کا ذریعہ بنانا ہے اور یہ ہر مسلم پاکستانی بچے کا بنیادی حق ہے اور اس میں کسی استثنا کو قبول نہیں کیا جاسکتا۔

سیاسی اور تعلیمی سطح پر اس آئینی تقاضے کو اگر عملاً قبول کر لیا جائے تو ہر تعلیمی ادارے، اس میں کام کرنے والے اسلام اور پاکستان کے شیدائی، ہر معلم اور اس میں اختیار کی جانے والی، ہر نصابی اور ہم نصابی سرگرمی کا ایک ہی ہدف ہوگا کہ وہ علمی، سیاسی، سائنسی اور تمدنی میدانوں میں آگے بڑھنے اور امت کو آگے بڑھانے کے لئے ہر بچے کو محمد علی جناحؒ، اقبالؒ اور ڈاکٹر عبدالقدیر بنائے، ایسا ممکن ہے اور بہت آسانی سے اور بہت جلد ممکن ہے شرط صرف یہ ہے کہ فیصلے دستوری تقاضے کے مطابق خالصتاً اپنے ہوں اور کسی غیر کو اس میں دخل اندازی کی ذرا سی بھی راہ نہ دی جائے۔ احساس کمتری کے خول کو توڑ دیا جائے، خود اعتمادی کے ساتھ آزادانہ فیصلے کئے جائیں۔ بیرونی اور اندرونی پراپیگنڈے کی دبیز چادر کو لپیٹ کر ملی ضروریات کو خالصتہً اپنی اور صحیح معنی میں حقیقت رس آنکھ سے دیکھا جائے، اگر سوچ کا یہ زاویہ جو سراسر حق ہے، سیاسی اور علمی سطح پر اختیار کر لیا جائے تو ہم ضمانت دیتے ہیں کہ دنیا اپنی ترقی کے لئے ہر حوالہ سے خواہ وہ مادی ترقی کا ہو یا روحانی ترقی کا، پاکستان اور اہل پاکستان کو اپنا پیشوا اور امام تسلیم کئے بغیر کوئی

چارہ کار نہ پائے گی۔

پورے شرح صدر کے ساتھ تسلیم کیا جانا چاہئیے کہ اس ملی ہدف کا حصول ممکن ہے تو صرف اور صرف تعلیم کو حقیقی معنوں میں نموئی تغذیہ بنا کر۔ یاد رکھئے کہ مادی خوراک نفسِ انسانی کے مادی وجود کو صرف اس وقت اونچا اٹھاتی ہے جب کہ وہ قابلِ ہضم ہو، ہضم کے خلاف کردار ادا کرنے والی ہر مادی خوراک نہ صرف یہ کہ نشوونما نہیں کرتی بلکہ جسم کو مختلف بیماریوں کے حوالے کر کے وقت، وسائل اور توانائی ہی نہیں اکثر خود نفسِ انسانی ہی کو ضائع کر دیتی ہے۔ بعینہٖ یہی مثال اس نفسیاتی وجود کی ہے جس کے لئے تعلیم تغذیہ کا کام کرتی ہے۔ وہ علم جو فہم سے ماورا ہو یا کسی ایسے ذریعہ سے متعلم تک پہنچایا جائے جو خود فہم کی راہ میں حائل ہو وہ بالکل اسی طرح انسان کے دل ودماغ اور عقل و اخلاق کے لئے زہریلے اثرات کا حامل ہوگا جس طرح سمی اثرات کی حامل مادی غذا، انسان کے مادی وجود کے لئے مہلک ہوتی ہے۔ بلکہ اس کے زہریلے اثرات، زہریلی مادی خوراک کے مقابلے میں کہیں زیادہ سنگین ہوں گے۔ جسمانی عیوب کو تو شاید کسی حد تک درست کیا جا سکتا ہے لیکن یہ تو دلوں تک کو ٹیڑھا کر دیتی ہے۔ اور نتیجتہً انسان اپنے انفرادی اور ملی تشخص ہی کو نہیں کھو بیٹھتا بلکہ ہر باطل اس کے لئے حق اور ہر حق اس کی نگاہ میں باطل دکھائی دینے لگتا ہے اور جسے اس سطح تک پہنچا دیا گیا، وہ اونچا تو کیا اٹھے گا، قیادت و سیادت کی خواہش تو بے چارا کیا کرے گا، اپنی ذات کے عرفان سے بھی جاتا رہے گا۔ بد قسمتی سے ہم اہلِ پاکستان بطور پاکستانی اپنی زندگی کے پہلے سانس یعنی 1947ء ہی سے اپنی خودی سے محروم کر دیئے گئے، تب سے اب تک اپنے ملی تشخص کی بازیافت کے لئے غیر کی سجھائی ہوئی راہوں میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں، شومئی قسمت کہ ہم نے ہر سرگرمی اسلامی کے سابقے کے ساتھ شروع کی لیکن عملاً سیکولر ہو کر، اور ہم نے اس منافقت کا سب سے زیادہ اور پوری دیدہ دلیری کے ساتھ اظہار کیا ہے تعلیم کے میدان میں، ہر کہ آمد عمارت نو ساخت، قومی کے نام پر تعلیمی پالیسیاں بنتی رہیں اور پے بہ پے بنتی رہیں، ہر پالیسی لفظاً خوش رنگ اور معنیً......؟ شاید اس پہلو سے بھی کچھ مفید ہی ثابت ہوتیں لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ عملی تنفیذ کے لئے پشت بمنزل ہو کر تیز قدمی ہی اختیار نہیں کی گئی، وقت، وسائل اور پوری توانائی کے ساتھ بگٹٹ دوڑ لگائی گئی۔ منزل کعبے کو ٹھرایا گیا اور رُخ ترکستان کا اختیار کیا گیا۔ نتیجتہً تعلیمی اداروں نے قوم کو انسان کے بجائے معاشی حیوان بنا دیا۔ ہر تعلیمی پالیسی کے بعد قوم آقاؤں اور غلاموں، حاکموں اور محکوموں کے متوازی طبقات میں تقسیم ہوتی گئی۔ خوش حالی اور بد حالی کے درمیان کی خلیج ہر پالیسی کے بعد وسیع تر

ہوتی گئی اور زیادہ گہری بھی، گو ہر تعلیمی پالیسی کا سابقہ لفظ "قومی" زیادہ جلی ہوتا گیا۔

برعکس نہند نامِ زنگی کافور

آیئے دیکھیں کہ ایسا کیوں ہوا؟ عوامل تو بہت سے ہیں اور ہر ایک اپنی جگہ شدت کے ساتھ توجہ کا طالب لیکن اس وقت ہم صرف "ترقی کے نام پر انگریزی کے بھوت" پر بات کریں گے۔

اس کے دو پہلو ہیں، ایک "انگریزی بطور ذریعۂ تعلیم" اور دوسرے "انگریزی ہر سطح پر بطور لازمی مضمون" پہلے ذریعۂ تعلیم کی بحث کو لیجئے، ہم اس سے پہلے خوب اچھی طرح جان چکے ہیں کہ تعلیم نفسِ انسانی یعنی عقلی اور اخلاقی وجود کے لئے غذا کا کام کرتی ہے اور ہم یہ بھی مان چکے ہیں کہ صحیح نشوونما اور اونچی اٹھان کا باعث صرف صرف وہی غذا ہوتی ہے جو ہضم ہو کر جزو بدن بنے، اب ایسی نفسیاتی غذا (تعلیم) جو اگرچہ کتنی ہی اہم کیوں نہ ہو اگر غلط ذریعہ سے یا غلط طریقے سے داخل وجود کرنے کی کوشش کی جائے گی تو کیا اسے وجود قبول کرے گا؟ یا اگر کرے گا تو کیا حقیقی ضرورت کے مطابق کرے گا؟ پاکستانی قوم کی گزشتہ نصف صدی کے ضیاع کے باوجود، اگر بودے، بے دلیل کمزور حوالوں سے عبدالدنیا اور عبدالمال قسم کے چند خود پرست طبقات کے عارضی دینوی مفاد کو مستقلاً جاری رکھنے کی خاطر انگریزی کے بھوت کو سر سے نہ اتارا گیا تو جو ایک ڈاکٹر عبدالقدیر خان خوش قسمتی سے قوم کے پاس اس وقت موجود ہے، ہم نہ صرف اسے ضائع کر دیں گے بلکہ آئندہ نسلوں کے لئے عبدالقدیریت کا دروازہ بھی بند کر دیں گے۔

سو آیئے، خالصتاً اپنے قلب و نظر کے حوالے سے اپنے بہتر حال اور روشن مستقبل کی خاطر ذریعہ تعلیم بننے والی زبان کے حقیقی معیار سے آگاہی حاصل کر لیں اور پھر جو معیار پر پوری اترے اسی کو ذریعۂ تعلیم کے طور پر اپنائیں:

1۔ ذریعہ تعلیم بننے والی زبان کو سیکھنے اور سکھانے والوں کے لئے لازماً آسان اور بے تکلفی سے قابلِ فہم ہونا چاہیے، ظاہر ہے ایسی زبان وہی ہو سکتی ہے جو یا تو مادری زبان ہی کی طرح اپنے اختیار کی بنیاد پر ایسا ماحول اور بے تکلف فضا خود تخلیق کر سکے۔

2 ۔ جس کی طرف سیکھنے والوں کا طبعی میلان موجود ہو اور جس کے پس منظر میں سیکھنے والوں اور سکھانے والوں کے ہاں نفرتیں اور کدورتیں نہ ہوں بلکہ اپنائیت اور محبت کا احساس موجود ہو۔

3۔ جس کے سیکھنے میں کم وقت، کم وسائل اور کم انسانی محنت درکار ہو۔

4 - جو اپنے اختیار کرنے والوں کے لئے نہ صرف یہ کہ بوجھل نہ ہو بلکہ اپنی مخصوص تہذیب و ثقافت سے ہم آہنگ ہو اور یہ ہم آہنگی ایک طرف ماضی سے ہو تو دوسری طرف حال سے اور تیسری طرف یہ مستقبل کے تحفظ اور ارتقاء کی بھی ضامن ہو۔

5۔ جس کا ذخیرۂ الفاظ وسیع ہو اور اس کے مزاج میں ایسی لچک موجود ہو کہ دوسری زبانوں کے الفاظ و اصطلاحات کو باسانی اپنے مزاج سے ہم آہنگ کر کے اپنے اندر جذب کر سکے۔

6۔ طالب علم کی نفسیات کے حوالے سے ذریعۂ تعلیم بننے والی زبان کے حق میں قبولیت کی فضا زبان کی اپنی اہلیت کی بنا پر موجود ہو اور قبولیتِ عامہ کے لئے وہ کسی پروپیگنڈے کی بھی محتاج نہ ہو۔

7۔ ذریعہ تعلیم کے طور پر اس کے عملی استعمال نے اپنے بولنے والوں کے لئے اس کی افادیت کو ثابت کر دیا ہو۔

8۔ ذریعہ تعلیم کو نہ صرف مقاصدِ حیات سے ہم آہنگ ہونا چاہئے بلکہ مقاصد تعلیم سے بھی۔

اب غور فرمائیے کہ آدمی نے اپنے آپ کو خود ہی فکر غیر کا پابند نہ کر لیا ہو تو بہت آسانی کے ساتھ سمجھا جا سکتا ہے کہ عقل و خرد کو چراغِ راہ بنانے والا کوئی بھی تمدن کبھی بھی اور کہیں بھی مقاصد حیات اور مقاصد تعلیم میں بُعد (دوری) کا روادار نہیں رہا، تعلیم اور زندگی دونوں کا نصب العین ہمیشہ ایک رہا ہے، خود اپنے دستور پر نظر ڈال لیجیے، قراردادِ مقاصد جسے آپ تنفیذ کی لئے اپنے دستور کا عملی حصہ بنا چکے، وہ اپنے اصل رنگ کے اعتبار سے مقاصد ہی کا بیان ہے اور اسی کو عمل میں لانے کے لئے زیادہ سے زیادہ خوبصورت لفاظی کا اہتمام ہر گزشتہ حکومت نے کیا ہے۔

تاریخ انسانی پر نظر رکھنے والا ہر صاحب فہم جانتا ہے کہ انسان نے جب سے اس دنیا میں قدم رکھا ہے، اس نے ترقی و ارتقا کو ہمیشہ پسند کیا ہے اور اس ترقی کے ہمیشہ دو پہلو رہے ہیں، ایک مادی اور دوسری نفسیاتی جو اپنے اصل مفہوم کے اعتبار سے عقل و اخلاق سے عبارت ہے اور جسے روحانی پہلو کے طور پر جانا پہچانا جاتا ہے۔

مادی ترقی کا ہدف سب جانتے ہیں کہ انسان کے لئے زیادہ سے زیادہ آسانیاں مہیا کرنا رہا ہے اور اس میں فی نفسہ کوئی بات ناپسندیدگی کی کبھی نہیں رہی آپ مادی ضروریات کی تکمیل مگر حقیقی مادی ضروریات کی تکمیل کے لئے پیداوار کے جتنے اونچے ڈھیر چاہیں لگاتے چلے جائیں، پسندیدہ ہی نہیں، بہت پسندیدہ ہوگا لیکن اگر ترقی کے دوسرے ہدف یعنی انسانیت کو نظر انداز

ہی نہیں قتل کر کے آپ یہ ڈھیر لگائیں گے تو اسے یقیناً ہر دانش مند کی نگاہ میں جرم و گناہ ہونا ہی چاہیے آپ اگر اپنے برتر وسائل کی بنا پر اگائیں تو کروڑوں ٹن غلہ لیکن امریکیوں کی طرح سنگ دلی سے کام لے کر اسے تھوڑے نفع پر قناعت کر کے محتاج انسانوں تک پہنچانے کے بجائے سمندر کی نذر کر دیں تو کون شریف آدمی ہے جو آپ کے اس تصورِ ترقی کو قبول کرے گا اور قدر کی نگاہ سے دیکھے گا۔ سو ترقی کا مفہوم داناؤں کی نگاہ میں ہمیشہ انسان اور انسانی زندگی کے ان دونوں پہلوؤں کو محیط رہا ہے اور اس تصور کے تحت ترقی کے ہمہ جہتی اہداف کو حاصل کرنے کا اصل ذریعہ ہمیشہ تعلیم بطورِ کل ہوتی ہے، آپ اسے اگر محض ذریعہ تعلیم کے ساتھ نتھی کر دیتے ہیں تو فی الحقیقت آپ اپنی ذات پر، ابنائے وطن پر اور آئندہ نسلوں پر سفاکانہ ظلم کرتے ہیں۔ اس پر مستزاد ظلم کی وہ مزید سفاکانہ شدت ہے جب پاکستانیوں کے دلوں میں کلائیووں اور ڈائروں کی مکاریوں کی نمائندہ انگریزی اپنی پوری نفرتوں کے ساتھ یہاں ذریعہ تعلیم کے طور پر نافذ کر دی جاتی ہے۔

ہم چاہیں گے کہ آپ انگریزی کو بطور ذریعہ تعلیم اور بطور واحد ذریعہ ترقی معروضی انداز میں تول کر بھی دیکھ لیں:

• تعلیمی حوالے سے مادی ترقی کا زیادہ تر تعلق نصابیات، مقاصد تعلیم کا تعین، طریق تدریس، طلبہ اور اساتذہ کی محنت، بہتر انتظام و انصرام، عام معاشرتی ماحول، بالخصوص تدریسی ماحول کی خوش گواری سے ہوتا ہے نہ کہ محض ذریعہ تعلیم سے، اگر مادی ترقی ہی اصل مقصودِ حیات ہو تو بلا مبالغہ اس اعتبار سے جاپان دنیا کا اصل امام ہے جس کی صنعتی پروڈکشن، اپنے حسن و افادیت کی بنا پر دنیا میں ایسی چھائی ہے کہ امریکہ بھی بلبلا اٹھا ہے اور اپنے ملک کے حق میں جاپانی مال کے داخلے کے خلاف قانون سازی پر اتر آیا ہے، چین دوسرا بڑا نام ہے جو دنیا کی مارکیٹ پر چھایا ہوا ہے اور صرف دو سال کے عرصے میں ایٹمی قوت کے حصول کے بعد اپنی ہی قوت کے بل بوتے پر سلامتی کونسل کی ویٹو نشست بھی حاصل کر چکا ہے۔ کیا آپ فرانس، جرمنی، ہالینڈ، روس اور سکنڈے نیوئین ممالک کو غیر ترقی یافتہ قرار دیں گے۔ مادی پیمانے سے تو یہ سب ممالک خود ترقی کا معیار ہیں، کیا ان سب کے ہاں انگریزی ہی ذریعہ تعلیم رہا؟ کوریا مادی ترقی کے معاملے میں جاپان کے بعد دوسرا بڑا نام ہے، کیا انگریزی وہاں بھی تعلیم کا ذریعہ رہی؟ یہ سب وہ ممالک ہیں جہاں سائنس و ٹیکنالوجی پر ماہرانہ دسترس رکھنے والے مبالغہ کے کسی ادنیٰ شائبہ کے بغیر ان گنت ملیں گے، ان سب نے اپنی اپنی قومی زبان میں تعلیم حاصل کر کے مادی میدان میں اپنے اپنے

ملک و قوم کو دنیا کا امام بنا دیا۔

ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ

انگریزی کے بھوت نے، جسے نصف صدی سے ہمارے عقل و خرد کے مقتدر ٹھیکیداروں نے ملت کے سر مسلط کیا ہوا ہے اور جس کی سواری کا دائرہ اب ہر بچے کہ پہلے تعلیمی سانس تک بڑھا دیا گیا ہے اور جسے قائم رکھنے کی کوشش کی جارہی ہے، ہماری مادی اور روحانی، دونوں طرح کی ترقیوں کا راستہ بری طرح روک رکھا ہے اور اگر معروضی سوچ کو راہ دے کر اس سے چھٹکارا حاصل نہ کیا گیا تو ملت کی نیّا، میرے منہ میں خاک، کل ڈوبتی آج ڈوب جائے گی۔

مری تعمیر میں مُضمر ہے اک صورت خرابی کی

ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

اس حقیقت سے کون انکار کرے گا کہ برصغیر پاک و ہند پر آقائیت کے دو سو سال میں انگریز مصنفین نے اسلام اور پیغمبر اسلام کی شخصیت پر کیچڑ اچھالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ انگریز آج بھی برطانیہ اور امریکہ کی صورت میں شیطانی آیات کے سراپا نفرت مصنفین سلمان رشدیوں، اباحیت کی اونچی پکار تسلیمہ نسرینوں اور ملت فروش قادیانیوں کا اصل محافظ ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ملتِ اسلامیہ کے خلاف جہاں اور جیسی سازش کا وجود ثابت ہوتا ہے اس کے پیچھے سارا منصوبہ انگریز یا پھر اس کی معنوی ذرّیت (اولاد) ہی کا سامنے آتا ہے، یہ گروہ تو شاید سارے کا سارا جنرل ڈائروں اور عریبیہ کے لارنسوں ہی سے بھرا ہوا ہے...... پھر یہ بات بھی بالکل درست ہے کہ ادب تمدن کا ترجمان ہوتا ہے اس حوالے سے بھی دیکھیں تو انگریزی ادب کی نمایاں تصویر بے حیائی کے رسیا ہی کی نہیں پرچارک کی بھی دکھائی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ انگریزی زدہ طبقہ خواص ہی کے بیٹے بیٹیاں ہوتی ہیں جو ہر سال نئے عیسوی سال کے استقبال میں صرف جام ہیں نہیں لنڈھاتیں، بے حیائی کی آخری حد بھی کھلے عام پار کرتی اور اس پر فخر بھی کرتی ہیں، سو انگریزی کے لئے قبولِ عام کی فضا کو مغرب کے فرزندانِ ناارجمند نے خود ہی مٹا دیا ہے۔ یہ طبقات پاکستان میں جہاں جہاں مقتدر ہیں (بدقسمتی سے یہی ہر جگہ مقتدر ہیں) عیاری و مکاری کو اصلِ دانائی جان کر ہر سطح پر ظلم و ستم کو شعار بنائے ہوئے ہیں، ان کا وجود سراپا کرپشن، سراپا خیانت ہے، اور یہ وہ آکٹوپس ہے جس نے جسدِ ملی میں اپنے پنجے گاڑ کر اس کا سارے کا سارا لہو چاٹ لیا

ہے۔ انگریزی چونکہ ان کے اقتدار کا اصل وسیلہ ہے اس لئے یہ خواجگانِ خود پرست جہاں نسلی، لسانی اور علاقائی تعصبات کو اپنے لئے حیات بخش بنائے ہوئے ہیں، وہیں انگریزی کے ذریعہ عام لوگوں اور ان کی نئی نسلوں کی ترقی کا ہر راستہ مسدود کئے ہوئے ہیں۔

نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ

خواجگی نے خوب چن چن کے بنائے مسکرات!

ذریعہ تعلیم کے مسلمہ معیار کے اوصاف کے طور پر جو دیگر نکات اوپر کی گفتگو میں پیش کئے گئے ہیں، تعصب اور خود غرضیوں کی عینک اتار کر حقیقی معروضیت کے حوالے سے جانچئے تو انگریزی کسی ایک نکتہ پر بھی پوری نہیں اترتی، کیا ایسے ناقص ذریعہ کو مزید جاری رکھ کر ہم اپنے ملی وجود کو اتنا کھوکھلا کر دینا چاہتے ہیں کہ امریکی پروفیسر ہنٹنگٹن اور ان کے اور اسرائیلی یہودیت کے مغربی ساجھے داروں نے "The Clash Of Civilizations" (تہذیبی جنگ)، "Islamic Terrorism" (اسلامی دہشت گردی)، "Millitance Against Democracy" (جمہوریت دشمنی)، "Islam, An Evil Force" (اسلام، ایک طاقتور بدی)، "The Prospects And Dangers of Political Islam" (مستقبل کا خطرناک سیاسی اسلام) اور ایسی ہی بے شمار اور، اسلام اور مسلمانوں کے خلاف شدت سے نفرت کو ہوا دینے والی تحریروں کی صورت میں، صلیبی جنگوں کی جس نئی بھٹی کو آگ دکھانا شروع کیا ہے، اس کے بھڑکتے ہی ہم میدان ان کے حوالے کر دیں۔

اب گفتگو کے دوسرے حصے "ابتدائے تعلیم سے انگریزی بطور لازمی مضمون" کا بھی تجزیہ کیجئے زندہ قومیں شاہراہِ ترقی پر آگے بڑھنے کے حقیقی تقاضوں کا محض واجبی اور سطحی سا شعور ہی حاصل نہیں کرتیں، شعوری طور پر ان کے حتمی تعین کا اہتمام بھی کرتی ہیں، چونکہ اس حوالہ سے بہت سے اہم نکات ہم اس سے پہلے ہی پیش کر چکے ہیں، اس لئے یہاں صرف ایک بات پر زور دیں گے کہ ترقی کا بنیادی تقاضا جامع منصوبہ بندی ہوتا ہے اور منصوبہ بندی کا پہلا قدم مقاصد اور ضروریات کی معروضی تعیین جب کہ دوسرا قدم ضروری شماریات کا جمع کرنا ہوتا ہے تاکہ اس کی روشنی میں جزئی تفصیلات طے کی جا سکیں، منصوبے کی جامعیت متقاضی ہوتی ہے کہ اس کی حدود ماضی، حال اور مستقبل تینوں ادوار کو محیط ہوں، ماضی کا مطالعہ اس لئے کہ اس موضوع پر اپنی گزشتہ کامیابیوں یا ناکامیوں کا معروضی جائزہ لیا جا سکے، حال کا مطالعہ اس لئے کہ منصوبے کے ثمرات سے موجود نسلیں خود فائدہ اٹھا سکیں اور مستقبل میں بصیرت کا حصول اس لئے کہ آئندہ نسلوں کی

کامیابی کے لئے راستے ہموار کر دیئے جائیں (پہلی جماعت سے انگریزی کے لزوم کے لئے ایسی کوئی تحقیق نہیں کی گئی)، بد قسمتی سے وطن عزیز پر خواجگانِ خود پرست کا جو مغرب زدہ آسیب گزشتہ پچاس سال سے رنگ و آہنگ بدل بدل کر مستقلاً مسلط رہا ہے، اس نے جذباتی نعرہ بازی اور مکارانہ سیاسی پراپیگنڈہ تو خوب کیا لیکن کسی تحقیق اور منصوبہ بندی کا وہ کبھی روادار نہیں رہا۔ انہیں تو اپنی خود غرضانہ سیاسی ضروریات کے پیش نظر یہ بھی پسند نہیں رہا کہ آبادی کے حقیقی شماریات ہی اکٹھے کرنے کا اہتمام کر لیتے سو آیئے انگریزی کے حوالے سے ملکی اور قومی سطح پر اس کے ضرورت ہونے کی حقیقت کا معروضی تعین کر لیں، اس ضمن میں ذیل کے سوالات کو اس موضوع پر آگے بڑھنے کے لئے بطور وسیلہ اختیار کرنا ہو گا یعنی یہ کہ:

(ا) کیا انگریزی ہماری واقعی ضرورت ہے؟

(ب) اور اگر واقعی ضرورت ہے تو اس کا معیار اور مقدار کیا ہو؟

(ج) پھر یہ بھی کہ یہ حقیقتاً کتنے لوگوں کی واقعی ضرورت ہے؟

(د) اور یہ کہ انگریزی کتنے لوگوں کی حقیقی ضرورت نہیں ہے؟

(ھ) پھر یہ بھی کہ ضرورت کی حقیقی سطح کیا ہے؟

(د) یہ جائزہ لینا بھی ناگزیر ہو گا کہ انگریزی کا ہر بچے کے لئے لزوم نفسیاتی نمو کے حوالے سے تعلیم کو نموئی تغذیہ بنانے میں معاون ہو گا یا رکاوٹ؟

پہلے سوال کو لیجئے، ہمارا جواب یہ ہے کہ دنیا کی دیگر ترقی یافتہ زبانوں کے ساتھ ساتھ انگریزی بھی ہماری واقعی ضرورت ہے اور ہمیں اس کا وہ معیار درکار ہے جو خود انگریزی سے بھی بلند تر ہو، کیوں؟ اس لئے کہ دنیا کے سب سے زیادہ دانا انسان جناب محمد الرسول ﷺ کے فرمان کے مطابق دانائی اصلاً تو مومن کی میراث ہے، کبھی کھو جائے تو اس پر سب سے پہلے مسلمان کا حق ہے اور اس کا فرض ہے کہ اسے آگے بڑھ کر حاصل کر لے، دانائی انسان کو حقیقت پسند بناتی ہے، سو اس حقیقت سے انکار کیوں کر پسندیدہ قرار دیا جائے گا کہ مشرق و مغرب کی دیگر ترقی یافتہ زبانوں کے ساتھ ساتھ انگریزی میں جو سائنسی اور تکنیکی سرمایہ موجود ہے اور جو آئندہ موجود ہو گا، اس پر مسلمان کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا خود اہل زبان کا، اس لئے کہ علم نہ انگریز سے خاص ہے، نہ مشرق سے اور نہ کسی مغرب سے یہ تو حقیقتاً انسانی سرمایہ ہے سو اس کے لئے عام بھی ہونا چاہیئے۔

علم کے سلسلہ میں یہ حقیقت بھی کسی لمحہ نظر انداز نہ کیجئے کہ یہ مسلمان ہی تھے جنہوں نے

فرمانِ خدا اور رسول ﷺ کے اتباع میں انسان کے لئے علم کو اسی پیمانے پر عام کر دیا تھا جس پیمانے پر ہوا اور پانی کا حصول اس کے لئے عام ہے، سو مسلمان کیوں کر یہ پابندی اپنے اوپر خود لگائے گا یا کسی کی لگائی ہوئی پابندی قبول کرے گا کہ انگریزی میں منظر عام پر آنے والے سائنسی، عمرانی اور تکنیکی علوم سے خُذ ما صفا ودع ما کدر کے رویے کے تحت، استفادہ نہ کرے۔

زبان انگریزی ہو یا کوئی دوسری، نہ ہم انگریزی کے خلاف کسی تعصب کو راہ دیتے ہیں نہ بلا دلیل کسی دوسری زبان کے اندھے پرچارک ہیں، دیکھنا صرف یہ ہے کہ انگریزی کی حقیقی ضرورت ملت اسلامیہ پاکستان کو ہے کتنی؟ آئیے اس کا بھی معروضی تعین کرتے چلیں:

(الف) دور حاضر میں اس حقیقت کے اثبات کے لئے کسی خارجی دلیل کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ طبعی علوم طاقت کا منبع و مصدر ہیں اور اس حقیقت کے اثبات کے لئے بھی قرآن کے باہر سے کوئی دلیل نہ مانگئے کہ نبی ﷺ کے اتباع میں ہم بحثیت امت مسلمہ مبعوث ہی اس لئے ہوئے ہیں کہ دنیا میں معروف کو اس درجہ قائم اور منکر کو اس درجہ مٹا دیں کہ ادیانِ باطلہ راستے سے کلیتہً ہٹا دیے جائیں اور اقتدار کل کا کل اسلام کے لئے ہو جائے، قرآن کے الفاظ میں اپنے منصب کو خوب اچھی طرح پہچان لیجئے، وہ کہتا ہے:

ہو الذی ارسل رسولہ بالھدی و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ و لو کرہ المشرکون (الصف: 9)

"یعنی اللہ وہی تو ہے جس نے اپنے رسول ﷺ کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اسے پورے کے پورے دین پر غالب کر دے خواہ مشرکین کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔"

اب مسلمان کی حیثیت سے اپنے اس فرض منصبی کی کماحقہ ادائیگی، کیا بغیر قوت کے ممکن ہو گی؟ خوب جان لیجئے کہ عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد، چنانچہ منصب اور وقت کا تقاضا تو یہ ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی پر اجارہ مسلمان اور صرف مسلمان کا ہو کہ باطل اپنی تمام تر قوت اور پراپیگنڈہ کے باوجود حقیقتاً تاریکی، جہالت اور فساد کا سرچشمہ ہونے کی بنا پر مستقلاً غارت گرِ امن ہے۔

دانشِ افرنگیاں تیغے بدوش
در ہلاکِ نوعِ انساں سخت کوش

سو اس مقصد عظیم کے لئے کفایت کرے گا، محمد علی جوہرؒ، محمد علی جناحؒ اور اقبالؒ کی طرح انگریزی پر عبور اور ملک و ملت کا درد رکھنے والا وہ محدود سا گروہ جو انگریزی میں طبعی علوم پر شائع ہونے والی

کتب کو اہل علم اور عام آدمی کے افادہ کے لئے تیزی کے ساتھ، ملت کے دستوری تقاضے، قومی زبان اردو میں منتقل کردے تاکہ قوت وطاقت پر بھی اسی تیزی کے ساتھ قابو حاصل کیا جاسکے۔

ہم یہیں پر اس گھسے پٹے اعتراض کا تجزیہ بھی کرنا چاہیں گے، جس کی جگالی ہر فورم اور ہر پلیٹ فارم پر انگریزیئت زدہ طبقہ، پھیپھڑوں کی پوری قوت کے ساتھ کرتا رہتا ہے اور وہ اعتراض یہ ہے کہ اردو زمانے کا ساتھ دینے کی اہلیت نہیں رکھتی، اس میں سائنسی اور تکنیکی مضامین نہیں پڑھائے جاسکتے۔ اصل بات یہ نہیں بلکہ یوں ہے کہ اردو کا راستہ آئین پاکستان کی اور اپنے حلف کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مقتدر جاگیرداروں نے پوری شدت کے ساتھ روکا ہے۔ کیونکہ اردو اپنے مقام و مرتبہ پر فائز ہونے کے نتیجہ میں علم کے آزاد اور عام ہوجانے کی بنا پر عام آدمی انہیں خوب اچھی طرح پہچان لے گا اور یوں ان کا راج سنگھاسن صرف ڈول ہی نہیں جائے گا، مستقل حسرت بن جائے گا۔ بھلا سوچئے تو کہ جس جنس کو بازار میں آنے ہی نہیں دیا جائے گا اس کا بھاؤ کون پوچھے گا؟ ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ دستوری تقاضے کے مطابق اردو کو آج اپنانے کا اعلان کردیجیئے۔ چھ ماہ سے کم عرصہ میں طبعی علوم پر موجود سب درسی اور بیشتر غیر درسی کتب اردو میں منتقل کردی جائیں گی۔ کیا پھر یہ بات دہرانے کی ضرورت ہے کہ مارکیٹ میں چلن اس کا ہوتا ہے جس کی مانگ ہو۔ آج کمپیوٹر چونکہ ہر جگہ چھاتا چلا جارہا ہے، ذرا دکانوں پر جا کر دیکھ لیجئے اس فن سے متعلق ہر طرح کی کتابیں اردو ہی میں لکھی جارہی ہیں۔

انصاف کا یہ تصور بھی خوب ہے کہ ایک پوری طرح صحت مند شخص کو جس کے ہر انگ سے زندگی پھوٹی پڑرہی ہو اور جو آزادی کی صورت میں خود زندگی کا محافظ بلکہ زندگی بخش ہو، آپ خوب کس کر باندھنے کے بعد اسے زمین پر ڈال دیں، نہ اس کے اٹھنے کی کوئی سبیل باقی رہنے دیں اور نہ پیدا ہی ہونے دیں اور پھر شکوہ ہی نہیں فتویٰ جاری کردیں کہ یہ تو نااہل ہے، ذمہ داری اٹھانے کے لائق ہی نہیں۔ اردو کے ساتھ نصف صدی سے یہی سنگین مذاق جاری ہے۔ (اردو، اس کی ضرورت اور صلاحیت کے متعلق اپنے تفصیلی دلائل ہم اس مضمون کے آخر میں موزوں مقام پر دیں گے)

(ب) اہلِ علم جانتے ہیں کہ عمرانی علوم انسان کے انفرادی اور اجتماعی رویوں کی تشکیل کے ضامن ہوتے ہیں۔ دورِ حاضر کے انسان کی بدقسمتی ہے کہ آج چھا وہ گیا ہے جس کا زندگی اور انسان کا تصور ادھورا ہی نہیں، بری طرح ناپختہ اور غلط بھی ہے۔ دنیا پر اپنے غلبے اور قوت و اقتدار کی بنا پر جو تہذیبی رویے اہل مغرب نے اختیار کئے ہیں اور جو تمدنی معیار انہوں نے قائم کئے ہیں،

ان کا معروضی علمی تجزیہ وقت کی پکار ہے۔ یہی وہ سفاک اور درندہ رویے ہیں جنہوں نے پورے عالمِ ارضی کو اسی بیسویں صدی میں پے بہ پے دو عالمی جنگوں کے جہنم میں جھونکا جن میں مجموعی طور پر پانچ کروڑ انسان لقمہ اجل ہوئے۔ وسائلِ حیات کی تباہی کا خود ہی قیاس کر لیجیئے۔ دوزخ کے ان فرشتوں نے اس کے بعد بھی انسانیت کو کسی لمحہ اور کسی پہلو چین نہیں لینے دیا، کبھی افغانستان میں آ کودے، کبھی بوسنیا میں جنگ کی بھٹی دہکائی، کبھی مشرقِ وسطیٰ کے خرمنِ امن کو بھسم کر ڈالا، کبھی افریقہ میں آگ جلائی اور کبھی کشمیر کو نذرِ آتش کیا۔ اپنی ہی خواہشِ نفس کو الٰہ بنانے والے اب تیسری عالمی جنگ کا ڈول ڈالنے جا رہے ہیں جس میں برسنے والے ایٹم بم، ہائیڈروجن بم اور کیمیائی ہتھیار شاید نسلِ انسانی کی جڑ ہی کاٹ دیں۔

ع..... ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں

فساد کی جڑ کاٹ کر اگر دنیا کو پھر سے امن و سلامتی کی ضرورت ہے تو اہلِ مغرب کے تہذیبی افکار اور تمدنی رویوں کے مسلسل اور مستقل تجزیے اور جائزے کی ضرورت ہو گی۔ یہ ضرورت پوری کرے گا ملت اسلامیہ کا پاکستان کا وہ پختہ مسلمان گروہ جو ایک طرف تو انگریزی پر ماہرانہ دسترس رکھتا ہو گا تو دوسری طرف اسلام کے خالصتہً حق، تہذیبی رویوں اور تمدنی معیارات پر بھی کماحقہ عبور رکھتا ہو گا۔ سو ہمیں اس مقصد کے لئے بھی ماہرین کے ایک چھوٹے سے گروہ کی ضرورت ہو گی جو عمرانی علوم پر اہلِ مغرب کی طرف سے آنے والی انگریزی کتب کا ناقدانہ جائزہ لے کر، امت کو ان کے نقصانات سے بروقت آگاہ کر سکے۔

(ج) ایک اور میدان خارجی تعلقات اور سفارتی سرگرمیوں کا ہے۔ اس کے لئے ہمیں ضرورت ہے ایک اور بہت ہی محدود لیکن دین وطن کی محبت سے سرشار پختہ مسلمان اہلِ علم کی جو انگریزی پر واقعی عبور رکھتا ہو تاکہ برطانیہ، امریکہ اور کوئی دوسرا ملک انگریزی بولنے والا ہو تو وہاں اپنے ملک و قوم کی اس طرح نمائندگی کر سکیں جیسا کہ نمائندگی کرنے کا حق ہے۔ چین، جاپان، روس، جرمنی، ہالینڈ فرانس، سپین اور ایسے دیگر شرقی و غربی اور افریقی ممالک میں سفارتی سطح پر انگریزی بگھانے والے کس کام کے؟ ہم جو بار بار دنیا میں تنہا ہوتے رہے ہیں اور کشمیر کا مسئلہ دنیا کی نظر میں اب تک بار نہیں پا سکا تو اس کی ایک بہت بڑی وجہ انگریزی سے بے جا طور پر چمٹے رہنا اور دیگر زبانوں کے ماہرین کی عدم تیاری ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ انگریزی کو صرف اس کا جائز محدود مقام دیا جائے جس کی نشاندہی ہم کرتے جا رہے ہیں۔ البتہ اس کے ساتھ ساتھ تعلیمی اداروں میں زبانوں کے انتخابی (Elective) دائرے کو وسیع کیا جائے اور اپنی حقیقی

ضرورت کے مطاق مختلف زبانوں کے ماہرین کے گروہ تیار کئے جائیں تاکہ پاکستان کا موقف جسے دستِ قدرت نے اپنے دین کے غلبہ کے اعزاز کے لئے بطور خاص تخلیق کیا ہے دنیا سے کماحقہ منوایا جاسکے۔ اے کاش کہ ہم اس کی رحمت کا حق پہچانتے، اے کاش کہ ہم اب ہی پہچان لیں۔

(د) ہم اس سے پہلے اہلِ علم کی توجہ اس امر کی جانب مبذول کروا چکے ہیں کہ سائنسی اور تکنیکی علوم طاقت کا سرچشمہ ہیں اور یہ طاقت، آج ہر شخص جانتا ہے کہ صنعت و حرفت کے ساتھ ساتھ بالخصوص میدانِ جنگ میں اترنے کے لئے جنگی مشینوں کا قالب اختیار کر لیتی ہے۔ یہ تکنیکی طاقت ہی ہے جس نے کلاشنکوف سے لے کر توپوں، ٹینکوں، ہوائی جہازوں، میزائلوں اور ایٹمی وار ہیڈز کا روپ دھارا ہے۔ ہم نے جنگی مشینوں کے حوالے سے اب تک یہ احمقانہ زاویہ نظر اختیار کئے رکھا ہے کہ دنیا کی سب سے زیادہ بےوفا قوم برطانیہ اور امریکہ (اصل میں دونوں ایک ہیں) پر انحصار کئے رکھا۔ اب تو خیر انہوں نے آئندہ کے لئے کچھ بھی دینے سے انکار کر دیا ہے۔ ہاں جو موجود ہے، اس کی دیکھ بھال اور اس سے کام لینے کے لئے انگریزی پر عبور رکھنے والے ایک اور بہت ہی محدود سے گروہ کی ضرورت مزید کچھ عرصہ تو رہے گی۔

پاکستان کو انگریزی جاننے والے کتنے افراد کی ضرورت ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ ہم نے جامعیت کے ساتھ اس کا احاطہ کر لیا ہے۔ آیئے اب آنکھیں کھول کر یہ بھی دیکھ لیں کہ انگریزی پاکستان میں کتنے لوگوں کی حقیقی ضرورت نہیں ہے۔

معروضی حقائق سے آنکھیں بند نہ کر لی جائیں تو کیا کوئی اس حقیقت کو جھٹلا سکتا ہے کہ عام روزمرہ زندگی میں عوام الناس کی سطح پر انگریزی نہ چھجو کمہار کی ضرورت ہے نہ ڈتو مراثی کی، نہ بخشو چپڑاسی یا پھتو ریڑھی بان یا بشیرے کوچوان کی، نہ کسی مستری اور مکینک کی، نہ عام دکاندار یا کسان کی، نہ کسی سطح کے چھوٹے یا بڑے زمیندار کی۔ حتیٰ کہ نہ یہ ہمارے کسی انتظامی دفتر کی حقیقی ضرورت ہے اور نہ کسی عدالت کی۔ 1960ء کی دہائی میں جبکہ ابھی بھٹو صاحب نے "ادھر ہم، اُدھر تم" کے بچوڑری ایجیکشن کے ساتھ "نئے پاکستان" کو جنم نہیں دیا تھا، اصلی، حقیقی اور پورے پاکستان کے اس وقت کے چیف جسٹس جناب جسٹس اے۔ آر۔ کارنیلئیس نے کھلے عام فرمایا تھا کہ "اگر دستوری تقاضے کے مطابق اردو زبان کو ہر سطح پر اپنانے کا سرکاری اعلان کر دیا جائے تو میں ابھی پاکستان کی تمام عدالتوں کو اردو میں کارروائی کا حکم دے دوں گا۔ فیصلے جو ابھی لکھے جا رہے ہیں ان کا بقیہ حصہ بھی فوری طور پر اردو ہی میں لکھا جائے گا اور اس میں کسی عدالت کو کسی مشکل کا سامنا نہیں ہوگا۔

سچی بات یہ ہے کہ فکر و نظر میں اگر پاکستان رچا بسا ہو اور ذہنی غلامی کے دھوئیں نے دل و دماغ میں اندھیر نہ مچا دیا ہو (ظلم تو یہ ہے کہ آپ تو "پاکستان مردہ باد اور پختون خوا زندہ باد" کا نعرہ لگانے والوں کو نہ صرف پارلیمنٹ کی رکنیت دے دیتے ہیں بلکہ کسی خوف یا کسی بے جا مصلحت کی بنا پر ایسے غداروں کو ساتھ لے کر چلتے رہتے ہیں اور نہیں سوچتے کہ یہ بھی فی الاصل ....) تو بہت آسانی کے ساتھ یہ حقیقت قبول کی جا سکتی ہے کہ انگریزی کی حقیقی ضرورت وفاقی سطح پر تو بہت ہی محدود پیمانے پر بہر طور ہے۔ البتہ اس کے ذریعہ ترقی کے نام پر کروڑوں پاکستانیوں کی ترقی کا راستہ روکنا یقیناً ظلم عظیم ہے۔ فرض کفایہ کو اگر آپ اقتدار کی قوت سے کام لے کر فرض عین بنا دیں گے تو بلاشبہ زیادہ سے زیادہ ایک لاکھ افراد کی خاطر چودہ کروڑ کی پوری کی پوری قوم کو آپ جاہل بنا دیں گے۔

شام کو صبح کہہ رہے ہیں لوگ
زیست ہے شرمسار سچ بولو
اب زمانے میں . چل نہیں سکتا!
ظلم کا کاروبار، سچ بولو

دانستہ یا نادانستہ پاکستان کی تخریب اور ذاتی تعمیر ہی فکر و فن کا نیوکلیئس نہ ہو تو بہت آسانی کے ساتھ شماریات کی روشنی میں انگریزی پر حقیقی عبور رکھنے والے ضروری افراد کی تیاری کا منصوبہ عمل میں لایا جا سکتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ایک فی ہزار کا تناسب بھی شاید زیادہ ہی ہو۔

اب آئیے ہر بچے کے لئے فرضِ عین کی حد تک اس کے لزوم کا بھی سائنٹفک تجزیہ کرتے چلیں:

1۔ امام غزالی امت کے ابتدائی مجددین میں سے ہیں۔ انہوں نے فن تدریس کے حوالہ سے دنیا کو پہلی بار کم و بیش ایک ہزار سال پہلے ہی باضابطہ متوجہ کر لیا تھا کہ تعلیم کا مرکز و محور "بچہ" ہے۔ سو اس کے نفسیاتی مطالعہ یعنی اس کے رجحانات و میلانات اور ذوق و شوق، اس کی قوتوں اور صلاحیتوں، اس کی عضوی اور ذہنی حدود، اس کے خاندانی اور عام معاشرتی ماحول اور اس کی معاشی حیثیت کو پوری پوری اہمیت دی جائے۔ آج آپ کا ممدوح مغرب بھی، جس کی اندھی تقلید ہی کو آپ اپنے لئے ترقی کی روشن راہ سمجھتے ہیں، علم التعلیم میں اسی نکتہ پر زور دے رہا ہے۔ بچے کی نفسیات کو اس تجزیہ کا پہلا نکتہ بنائیے تو کیا آپ نے قومی سطح پر یہ تحقیق کر لی ہے کہ پاکستان کا ہر

بچہ انگریزی کے لئے طبعی ذوق، میلان اور رجحان رکھتا ہے؟ مغرب کے پیمانے تو آپ کے لئے معیار ہیں، وہاں تو انتخابِ مضمون کے لئے رجحانِ طبع کا مطالعہ شرطِ اول ہے کیا آپ نے طے کر رکھا ہے کہ وہاں کی ہر تخریب کو اپنے لئے تعمیر جانیں گے اور وہاں سے آنے والے ہر تعمیری نکتہ کو آپ بلا توقف مسترد کرتے جائیں گے۔

2۔ اگر پاکستان کے ہر بچے میں انگریزی کے لئے ذوق و شوق اور میلان موجود ہوتا تو مڈل کی سطح سے لے کر بی۔ اے کی سطح تک ہر سال انگریزی ہی ان کی ناکامی کی بنیادی وجہ نہ ٹھرتی، چلئے زیادہ نہیں تو گزشتہ ایک عشرے کے تعلیمی بورڈوں اور یونیورسٹیوں کے نتائج کے گزٹ اٹھا کر دیکھ لیجئے، چودہ طبق روشن ہو جائیں گے کہ یہ خوش بخت انگریزی ہی کا پرچہ ہے جس میں ہر سال ساٹھ پینسٹھ فیصد سے لے کر اسی پچاسی فیصد کی حد تک ہر امتحان میں طلبہ اُڑ جاتے ہیں اور یہ وہ سرطان ہے جس کی جڑیں پھیل کر دیگر مضامین کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہیں اور اب تو ہر شخص جانتا ہے کہ کینسر کا تو محض خوف ہی روح و بدن کا سب کچھ لے ڈوبتا ہے۔

3۔ اس نفسیاتی نکتہ کو بھی ہر گز ہر گز نظر انداز نہ کیجیئے کہ چونکہ ہر بچہ اس کے لئے ذوق نہیں رکھتا اور اسے یہ بھی معلوم ہے کہ اس کی عملی زندگی میں انگریزی اس کی کسی ضرورت کو پورا کرنے کا کوئی کردار نہیں رکھتی، اس لئے وہ اس میں دلچسپی لے تو کیوں کر؟ لیکن چونکہ سرکار امریکہ مدار نے اسے اس آکٹوپس کے حوالے کر دیا ہے، سو بے چارا طالب علم خواہ کتنی ہی بے دلی کے ساتھ سہی، باقی ہر مضمون، ہر شعبہ اور ہر سرگرمی کو چھوڑ کر انگ انگ پہ سختی کے ساتھ کسے ہوئے اس کمبل سے جان چھڑانے میں لگ جاتا ہے۔ اس صورتِ حالات میں بے چاری تعلیم، نموئی تغذیہ بنے تو کیسے؟ ہمہ گیر نشو نما ہو تو کیوں کر؟ تعمیر کے نام پر اپنی ہی جڑیں کاٹنا کوئی ہم پاکستانیوں سے سیکھے، بے چارا شیخ چلّی تو یوں ہی بدنام تھا کہ جس شاخ پہ بیٹھا ہے اسی کو کاٹے جا رہا ہے۔

تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو

4۔ ترقی کے اس اندھے تصور نے طلبہ کے لئے صرف انگریزی ہی کو نہیں، بلکہ بیشتر حالات میں خود تعلیم ہی کو ایک ناروا بوجھ بنا دیا ہے۔ اس لئے نہ صرف انگریزی ہی میں ناکامی مقدر ہو گئی ہے بلکہ دوسرے مضامین بھی، جن کا بچے کے نفسیاتی نمو اور عملی زندگی میں حقیقی کردار ہے، بری طرح متاثر ہوتے ہیں، یہاں یہ نفسیاتی نکتہ بے حد اہم ہے کہ آپ جب ایک کام میں ہاتھ ڈالتے ہیں اور اس میں کامیاب رہتے ہیں تو اسی قبیل کے دیگر کاموں کے بارے میں آپ

کے اندر اعتماد پیدا ہوتا ہے اور مشکل تر کاموں کو بھی دلجمعی اور سکونِ خاطر کے ساتھ انجام دینے میں ایک گونہ لطف آنے لگتا ہے۔ اس کے برعکس اگر آپ کو ایسا کام دے دیا جائے جس میں ناکامی قدم قدم پر آپ کا مقدر ہو تو نہ صرف یہ کہ آپ کا دل اس کام سے اُچاٹ ہو جائے گا بلکہ بعض اوقات ایسا شدید ردِ عمل جنم لے گا جو اسی طرح کے دیگر کاموں کو بھی، اگرچہ اس کی نسبت آسان ہی کیوں نہ ہوں خوفناک اور ناقابلِ عبور بنا کر پیش کرے گا، یوں اعتماد کو ٹھیس لگے گی اور یہ باآسانی سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ اعتماد ایک بار مجروح ہو جائے تو مشکل ہی سے بحال ہوتا ہے لہذا عقل مندی کا تقاضا یہی ہے کہ اعتماد کو زخم لگنے سے بچایا جائے۔

5۔ انگریزی کے اس منفی پن کا سنگین ترین پہلو یہ ہے کہ طلبہ ڈنڈے کے خوف سے رٹنے پر اور اساتذہ سالانہ خفیہ رپورٹ (ACR) کے ڈر سے رٹوانے پر لگ جاتے ہیں، ٹائم ٹیبل میں بھی سب سے زیادہ وقت انگریزی ہی کے لئے مختص ہوتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ خوف صلاحیتوں کا قاتل ہے، پھر رٹنا اس پر مستزاد، ایک تو کریلا پھر نیم چڑھا۔ حیرت ہے کہ مسلمان کا سا نام رکھنے والے اور آئین کی پاسداری کا حلف اٹھانے والے یہ مسلمان حکمران دنیا کے سب سے زیادہ فہیم انسان یعنی اپنے ہی نبی ﷺ کے اس فرمان کو مسترد کر دیتے ہیں جس میں وہ فہم ہی کو علم قرار دیتے اور رٹنے کی مذمت کرتے ہیں۔

6۔ سمندر پار سے آنے والے چٹے انگریز کے پروردہ مقتدر کالے انگریز نے تعلیم اور نظام تعلیم کے نام پر جو تماشا اب تک لگائے رکھا ہے اس کا ایک دلچسپ رنگ بھی دیکھتے چلیے۔ تدریس کے شعبہ میں اوپر کی گفتگو میں جس ذہنی اور عملی ماحول کی نشاندہی کی گئی ہے اس کی تخلیق کے طور پر جو استاد تیار ہوا ہے خود اس کا انگریزی کے ساتھ کیا سلوک ہے، نوٹ فرمائیے۔ یہ ایک استاد کے قلم سے نکلا ہے۔ "It is the an admitted law of history that history repeats itself." جب انگریزی ہی کے ایک خوب تجربہ کار استاد سے ایک سرکاری دستاویز میں مندرج لفظ "Perquisites" کا معنیٰ پوچھا گیا تو فرمایا کے غلط چھپ گیا ہے، اصل میں Pre-Requisites ہوگا۔ لطف یہ ہے کہ انہوں نے غلط طباعت کا فتویٰ پوری تحریر پڑھنے کے بعد دیا تھا۔ سیاق و سباق میں Pre-Requisites کی کوئی لم نہیں بنتی تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ نہ عام طالب علم انگریزی کو حقیقی ضرورت سمجھتا ہے اور نہ خود استاد ہی اس کے حق میں کوئی مثبت رائے رکھتا ہے۔ بس ایک، امتحان پاس کرنے کے لئے اس عذاب سے چھٹکارے کی خاطر ہاتھ پاؤں مارتا ہے تو دوسرا محض ACR کے خوف سے اپنے شاگرد کو اس

دلدل سے باہر کھینچنے کی کوشش کرتا ہے۔

7۔ برسرِعام نظر آنے والی اس حقیقت سے بھی آنکھیں بند نہ کر لیجئے کہ سرکاری تعلیمی اداروں کی سطح پر .... جی ہاں! وہاں بھی جہاں انگریزی ذریعہ تعلیم ہے .... عملاً اردو یا اردو اور انگریزی ملی جلی ہی چلتی ہے۔ یونیورسٹی کی سطح پر جہاں نظری طور پر انگریزی ہی ذریعہ تعلیم ہے، عمرانی علوم کی تدریس عملاً اردو میں ہوتی ہے حتیٰ کہ طبعی علوم کی بھی۔ کیونکہ نہ انگریزی کے لئے قبولیت کا ماحول اور فضا موجود ہے اور نہ طالب علم کا ثانوی تعلیم کا پس منظر ہی اس کے لئے کوئی آسانی مہیا کرتا ہے۔ انگریزی پڑھانے والوں کی دیگ سے تو ایک آدھ چاول کا ذائقہ آپ اوپر ابھی چکھ ہی چکے۔

8 ۔ چنگیزی سیاست کا پیمانہ خواہ کتنا ہی برعکس ہو، مسلمان کے نقطہ نظر سے تعلیم کا نصب العین سیرت کی تعمیر و تزئین ہے اور اچھی سیرت کا پیمانہ ہے حسن، خیر اور صداقت کے دائمی اسلامی تصور پر پختہ نظری اور عملی ایمان، جن کے نتیجہ میں آدمی حسنِ اخلاق سے مزین ہوتا اور حقیقی معنی میں مہذب کہلاتا ہے۔ اب یہ بھی اچھی رہی کہ انگریزی پڑھانے والا کہلائے تو استاد اور ہو بھی اکثر و بیشتر مسلمان لیکن (دیانتدار اساتذہ سے معذرت کے ساتھ) انگریزی میں طلبہ کی مجبوری کے پیشِ نظر انہیں کلاس میں تو رُخائے اور گھر میں ٹیوشن کے نام پر انہیں لوٹے اور مزید کمائی کی خاطر نالائقوں کے پرچوں کے پیچھے بھی بھاگے اور انہیں ان کی تمام تر نالائقی کے باوجود، پاس کروائے، معاشرے کے ناسوروں کی تخلیق کا، انگریزی کیا خوب وسیلہ ہے۔

آئینہ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

9۔ اب کیا اس حقیقت کے سمجھانے کے لئے آسمان سے فرشتے اتریں گے کہ جب بڑے پیمانے پر انگریزی کی نہ داخلی محاذ پر ضرورت ہے، نہ خارجی محاذ پر تو اس پر لگایا گیا وقت جو انسان کی قیمتی ترین متاعِ حیات ہے اور پیسہ جو ذریعہ اور وسیلہ ہے اور طالب علم اور استاد کی داخلی توانائی اور ان کے طبعی ماحول میں رچی بسی سب کی سب توانائی، ہر اعتبار سے ضائع ہو جاتی ہے۔

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

پس چہ باید کرد یا اس مشکل سے نکلنے کی راہ سجھانے سے پہلے حرفِ آخر کے طور پر ہم کہیں گے کہ انگریزی ذریعہ تعلیم یا انگریزی لازمی کے حق میں یہ سارا شور و غوغا اور عملاً اسے نافذ کر دینا، ملک و ملت کے خلاف سازش ہے اس دُوں نہاد، مغرب زدہ لادین طبقہ کی جو ایک طرف اگر خود سیاست چنگیز کا رسیا ہے تو دوسری طرف اسی کی صُلبی یا معنوی ذریت ...... بیورو کریسی کی

صورت میں ...... اختیار و اقتدار کے سبھی سرچشموں پر قابض ہے تاکہ وہ عوام الناس کے لئے مسائل پیدا کرتے رہیں اور انہیں مسائل ہی میں الجھائے رکھیں اور اس طرح بے کھٹکے ان کے ملک و دولت کو لوٹتے رہیں اور کسی رد عمل کے لائق بھی نہ چھوڑیں، ان کے ساتھ ہی یہ سازش ہے اس کاروباری طبقے اور عیسائی مشنری گروہوں کی جنھوں نے انگریزی ذریعہ تعلیم اور انگریزی لازمی کے نام پر محلہ محلہ اور گلی گلی سکول نما دکانوں کا جال بچھایا ہوا ہے اور تعلیم کے نام پر نہ صرف یہ کہ بری طرح لوٹ مچائے ہوئے ہیں بلکہ شدت کے ساتھ قوم کو جاہل بھی بنا رہے ہیں اور کوئی ان کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں یا پھر یہ کھلی سازش ہے حکمرانوں کی وساطت سے فریب ترقی کے نام پر نیو ورلڈ آرڈر کے خود ساختہ الٰہ اور اس کی ذریت کی، تاکہ معاملات کو اسی کی آنکھ سے دیکھنے اور اسی کے دل و دماغ سے فیصلے کرنے والے کھیپ در کھیپ اسے مسلسل دستیاب ہیں۔

پس چہ باید کرد:

الف۔ انگریزی کے بین الاقوامی، علمی اور سائنسی زبان ہونے سے انکار نہیں لیکن محض یہ دلیل اس کو ہر طالب علم پر بلا جواز ٹھونس دینے یا اسے ذریعہ تعلیم بنا دینے کے لئے ہرگز ہرگز برہانِ قاطع نہیں۔ ہاں آپ اسے دیگر زبانوں کے مطلعہ کے ساتھ ساتھ اختیاری مضمون قرار دے دیجئے۔ قومی تقاضوں کے مطابق صحیح، اہم اور ہماری نصاب لائیے اور لائق سے لائق اساتذہ کو اس کی تدریس پر مامور کر دیجئے، جوہرِ قابل خود بخود اس کی طرف کھنچا آئے گا اور حاصل کے طور پر آپ واقعتہً ترقی کریں گے کہ اس طرح بہتر سے بہتر سائنس دان، لائق اور ذمہ دار انجینئر، فنی دستگاہ رکھنے والے دردمند معالج، فعال سفیر، ذہین و فطین لیکن مہذب منتظمین اور دنیا بھر کی جنگی سٹریٹیجی کو ہضم کرنے والے محب دین و وطن جرنیل آپ کے ہاتھ آئیں گے۔ آپ کو اپنی صنعت و زراعت، بند گاہوں، موٹرویز اور دیگر ذرائع مواصلات کی تعمیر و ترقی کے لئے ملٹی نیشنل کمپنیوں کی صورت میں آنے والی کسی نئی ایسٹ انڈیا کمپنی کی چاکری کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

ب۔ ترقی کے اس جامع تصور کو عمل میں لانے کے لئے جس کی شافی تشریح ہم گزشتہ سطور میں پیش کر چکے ہیں۔ دوسرا قدم جو آپ کو اٹھانا ہے وہ پبلک سروس کمیشن میں زبانی اور تحریری دونوں طرح کے امتحانات کی انگریزی کے ملت کش تسلط سے نجات ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر بلکہ صحیح تر لفظوں میں برطانیہ اور امریکہ سے کرانک ذہنی مرعوبیت کی بنا پر اور بہت کچھ اپنی ہی خود غرضیوں کی بنا پر مقتدر طبقوں نے اس کے ساتھ یہ غلط

تصور وابستہ کر دیا ہے کہ جو انگریزی بولتا اور انگریزی بود و باش رکھتا ہے، لائق بھی ہے اور اعلیٰ بھی، اس لئے وہاں صلاحیتوں کا امتحان تو محل نظر ہی رہتا ہے۔ البتہ انگریزی میں گو وہ غیر معیاری بلکہ غلط ہی کیوں نہ ہو، گفتگو کی روانی کو عملاً اصل قابلیت تصور کر لیا جاتا ہے اور پھر منتخب لوگوں سے اونچی توقعات بھی وابستہ کر لی جاتی ہیں۔ حالانکہ محض انگریزی میں درک رکھنا نہ تو مطلوب کل ہے اور نہ اسے مطلوب کل ہونا چاہیئے۔ چنانچہ اسی مفروضہ کو حقیقت جان کر CSS کے مرعوب کن نام سے ہر شعبہ زندگی کے اونچے مناصب جس گروہ کے سپرد کئے جاتے ہیں، ان میں سے کم و بیش ہر ایک کے ہاتھ پاؤں، ہم اس وقت پھولے ہوئے دیکھتے ہیں جب ذہانت اور تہور کا اصل امتحان ہوتا ہے۔ اس لئے یہاں جس کے پاس بھی حق کی روشنی ہے اور جسے معاملات کی تہ تک جھانکنے کی توفیق ہوتی ہے، چیخ اٹھتا ہے کہ یہاں کا تو آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ آج وطن عزیز کے اخبارات و جرائد اور ان کے ساتھ ساتھ آپ کا احتساب سیل جب بھی اور جہاں بھی کسی شعبہ کا پردہ اٹھاتا ہے، کرپشن کے متعفن کینسر کو اس کے روح و بدن پر حاوی دیکھتا ہے۔

حق یہ ہے کہ ملکی اور قومی ترقی یا ملی عروج کے ساتھ انگریزی کے ذریعہ تعلیم یا اس کے لازمی ہونے کو اول تو کوئی تعلق ہے نہیں اور اگر ہے بھی تو وہ محض جزوی اور بہت ہی تھوڑا، ترقی کی اصل بنیاد اخلاقی فضائل ہوتے ہیں جو آدمی کو مشکل ترین حالات میں بھی صابر و شاکر، دیانت و جرأت کا پیکر اور محنت کا عادی بناتے ہیں۔ بھلا وہ اسیر ذات جو انگریزی ہی کو اپنے جاہ و منصب کا اصل وسیلہ جانے گا، اسے حسن، خیر اور صداقت کی ابدی اقدار سے پھوٹنے والے مذکورہ فضائلِ اخلاق کی کھکھیڑ میں پڑنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوگی؟ اس موضوع پر زیادہ گہرائی میں یا زیادہ دور تک جانے کی ضرورت نہیں، جسدِ ملی آج جس شدت کے ساتھ لہو لہو ہے، ہر روز یہاں وہاں جو بم دھماکے ہیں، قتلِ عام جو روز کا معمول ہو گیا ہے اور بھتہ خوری کا چلن جو برسرِعام ہے اور ہر سطح پر لوٹ مار کا جو بازار پوری شدت کے ساتھ گرم ہے، کیا یہ آپ کی انگریزی کی پروردہ انتظامیہ کی لیاقت و دیانت کا کچھ کم ثبوت ہے؟

خزاں کا حکم ہوا ہے مجھے بہار کہو
گلِ مرادِ چمن ہوں، مجھے نے خار کہو

کیا ترقی اسی کا نام ہے؟ اور ترقی کا یہی راستہ ہے؟ اگر دانائی یہ ہے تو پھر حماقت کس جنون خیز بلا کا نام ہے؟

سرکاری پالیسیوں کی تشکیل و تدوین اور ان کی عملی تنفیذ کے لئے اپنی ہی ذات کے خول

میں بند جس مغرب زدہ انتظامیہ پر آپ انحصار کرتے ہیں اسے عام آدمی کی نفسیات اور اس کی تمدنی ضروریات سے نہ کوئی علاقہ ہے نہ آگاہی اور اس کے باوجود آپ کو یقین کامل ہے کہ عقلِ کل اگر ہیں تو آپ کے یہ اباحیت کیش سیاسی مہرے اور علم و حکمت کا سر چشمہ ہے تو آپ کی یہ انتظامیہ جس کے بدن کا ہر خلیہ فسونِ مغرب میں جکڑا ہوا ہے۔

خرد کی تنگ دامانی سے فریاد
تجلی کی فراوانی سے فریاد
گوارا ہے اسے نظارۂ غیر!!
نگہ کی نامسلمانی سے فریاد

ج۔ اگر آپ اس متعفن صورتِ حال سے واقعتہً اخلاص اور کامیابی سے نکلنا چاہتے ہیں تو اس دستوری تقاضے کے تحت جس سے وفاداری کا پوری دنیا کے سامنے آپ نے حلف اٹھایا ہے، نظریہ پاکستان کی متابعت میں خالصتہً اپنا تعلیمی نظام لایئے جو ذریعہ تعلیم، نصابیات اور سہولتوں کے حوالے سے یکساں ہو تاکہ ہر پاکستانی بچہ اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق اسے اپنے لئے آسان اور قابلِ عمل پائے۔ اس کا سب سے بڑا تقاضا ...... انگریزی یا اردو؟ ...... کی غیر عادلانہ، احمقانہ اور ملت کے ذہن کو منتشر کرنے والی ظالمانہ بحث کو ہمیشہ کے لئے سختی کے ساتھ ختم کر دینا ہے۔ بے بصروں کی ساری مخالفت کے باوجود، دفتری ہی نہیں، تعلیمی دنیا میں بھی اردو کو ہر سطح پر اسی مخلصانہ سختی کے ساتھ ذریعہ تعلیم کے طور پر اپنا لینے کا زندگی بخش اقدام کر گزریئے۔ اس کے نتیجہ میں نہ صرف پوری قوم ذہنی طور پر یکسو ہو جائے گی بلکہ اس کا ہر ہر طالب علم اپنی اپنی سطح پر فہم کے لولوئے لالا کی غواصی کے لئے اپنے آپ کو آزاد اور قوی پائے گا۔ یاد رکھئے ترقی کا اصل مفہوم ہمہ جہتی ترقی ہے اور اس کے لئے آپ کو دیانت و امانت اور جان توڑ محنت کو شعارِ زندگی بنانے والے مردانِ کار چاہئیں نہ کہ شزوفرینیا کے مریض، وہ بے ہمت اور بے بس کارندے، جو میدانِ عمل میں اترتے ہی زبانِ حال سے پکارنا شروع کر دیں کہ!

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے

عام آدمی بالعموم اور عام طالب علم بالخصوص اردو کے حق میں پوری طرح یکسو ہے۔ اسے تو اس کی ہر صلاحیت کے نہ صرف کافی و شافی ہونے کا پورا یقین ہے بلکہ وہ اس کی راہ میں پورے

اہتمام کے ساتھ ڈالے جانے والے کوہ ہمالہ کو ہٹا دینے کے لئے ہر آن تڑپ رہا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کی ہمہ جہتی ترقی کی تمنا اسی کی عملی تنفیذ کی صورت میں بروئے کار آسکتی ہے۔ سو ہم ذیل میں اردو کی صلاحیت و قوت کے حوالے سے ہر اس آدمی کو دلائل و براہین کی روشنی میں مخاطب کریں گے جو یا تو بوجوہ اس کی طرف توجہ نہیں دے سکا یا اس تک اردو کے حق میں، حقیقی ابلاغ نہیں ہو سکا، ہم چاہتے ہیں کہ اس موضوع پر پاکستان کے لئے سوچنے والے ہر اس مقتدر یا غیر مقتدر کے لئے اتمامِ حجت ہو جائے جو نیت کا فتور نہیں رکھتا۔

1۔ زبان کی حقیقت کا عرفان اس اتمام کا پہلا تقاضا ٹھہرتا ہے۔ ہر پڑھا لکھا حتی کہ ان پڑھ بھی اس حقیقت کو تو بخوبی جانتا ہے کہ زبان کا لفظ دو معنی میں بولا جاتا ہے۔ ایک بتیس دانتوں اور جبڑوں کے قلعہ میں محفوظ وہ عضویہ جسے عرفِ عام میں "جِیبھ" کے نام سے جاد کیا جاتا ہے اور دوسرے روزمرہ کی عام بول چال جو صَوتی علامات .... حروف .... کے مجموعی آہنگ یعنی لفظوں کی ترتیب و تدوین سے معرضِ وجود میں آتی اور اظہار مافی الضمیر کا وسیلہ بنتی ہے۔ دونوں طرح کا مفہوم اگرچہ بظاہر الگ الگ نظر آتا ہے لیکن اپنی روح کے اعتبار سے ایک ہے۔ جوہری طور پر اس کی اہمیت یہ ہے کہ ہر لفظ جو ہم منہ سے نکالتے ہیں وہ اسی عضو کی صحیح اور بامعنی حرکت ہی کا مرہون منت ہوتا ہے۔ اگر یہ عضو متحرک نہ ہو تو مافی الضمیر دل کا دل ہی میں رہ جائے اور مافی الضمیر وہ چیز ہے کہ جس پر انسان کی ہر ضرورت کے پورا ہونے کا انحصار ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ زبان پر بہتر قابو رکھنے والا اظہار میں جس قدر حسن و خوبی کو راہ دیتا ہے میدانِ حیات میں اتنا ہی آگے بڑھ جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ترقی کے تصور نے یہیں سے جنم لیا۔ سو ہم دیکھتے ہیں کہ ترقی خواہ زندگی کے کسی شعبہ میں ہو اس میں تحقیقات کے ذریعہ آگے بڑھنے کا سارا دارومدار زبان پر اور زبان کے زندہ اور زندگی بخش ہونے کی صلاحیت و حیثیت پر ہوتا ہے۔ البتہ اسے یہ حیثیت اس وقت ملتی ہے جب اسے عام بول چال کے علاوہ نہ صرف خوش دلی کے ساتھ بلکہ پورے اخلاص، دل کی چاہت اور دیانت دارانہ محنت کے ساتھ علمی آلے کے طور پر، مسلسل استعمال کیا جاتا رہے۔ شرق و غرب کا ہر ماہر لسانیات گواہ ہے کہ روزمرہ کی عام ضروریات اور زبان کا عوامی استعمال، عام بول چال کے لئے اور تعلیمی و تکنیکی اداروں میں اس کا علمی اور فنی استعمال ہی اس کے لئے اصل ٹکسال ہوتا ہے۔ اردو کے خلاف اندھا تعصب رکھنے والے اپنی ممدوح انگریزی زبان ہی کو لے لیں۔ پانچویں صدی عیسوی سے سولھویں صدی عیسوی کے آغاز تک جسے یورپ کے افکار کی تاریخ مدون کرنے والے خود اپنے قلم سے تاریک دور (Dark Ages) کا نام دیتے ہیں۔ ہمیں

انگریزی زبان کا کہیں کوئی کردار نظر نہیں آتا۔ ہاں اس کے بعد مشرق وسطیٰ، اسپین، سسلی اور اسلامی دنیا کی دیگر جامعات کے مسلم مفکرین اور ماہرین سائنس سے براہ راست یا بالواسطہ کسب فیض کرنے والے یورپ کے اہل علم اور ان کی معنوی ذریت سائنسی اور تکنیکی شعبوں میں انگریزی سے کام لیتی اور مسلسل محنت کرتی رہی تو کہیں آج آ کر اس کو بین الاقوامی اور سائنسی زبان کا درجہ ملا، اس سے پہلے اسلامی عرب کی، اپنی زبان سے محبت و محنت نے عربی کو ہر شعبۂ علم میں معاصر زبانوں کی قائد اور امام کا زندگی بخش منصب عطا کیا ہوا تھا اور وہ عربی ہی میں اپنی تحقیقات کی بدولت نہ صرف آج کی معروف اور مروج سائنس اور ٹیکنالوجی کا آغاز کرنے والے تھے بلکہ اپنے دور کی مادی ترقی کے لئے صنعت و حرفت ہو یا زراعت، سلاح جنگ کی تیاری ہو یا بحری جہازوں کی تعمیر، قوت کے ہر چشمہ کے خالق ہونے کی حیثیت سے اس کے واحد اجارہ دار تھے۔ کیمیا، ریاضی اور طبیعات جو آج کی تمام تر ٹیکنالوجی کی ماں ہیں اور طبی علوم جن پر عربوں کی تصنیفات انیسویں صدی کے وسط تک یورپ کی جامعات میں درسی کتب کی حیثیت سے رائج رہیں اور عمرانی علوم جن سے یورپ آگاہ ہی مقدمہ ابن خلدون کے یورپی ایڈیشن کے بعد ہوا، مسلم عرب نہ صرف ان کے نظری محرک تھے بلکہ وہ ان علوم کی بنیاد پر بہت سی صنعتی اشیا اور اپنے دور کی ٹیکنالوجیز کے موجد تھے۔ علمی اور تاریخی صداقت یہ ہے کہ مسلمان بارود، قطب نما، الکحل، عینک اور گھڑی اور بیسیوں دیگر اشیا کے اولین خالق تھے (تشکیل انسانیت از رابرٹ بریفالٹ ص 262)۔ ہماری بات کو مغرب سے ذہنی مرعوبیت کے زیر اثر دیوانے کی بڑ سمجھنے والے "معرکۂ مذہب و سائنس" کے مصنف ڈاکٹر ولیم ڈریپر سے شہادت مانگ لیں یا "تمدن عرب" کے مرتب موسیو لیبان سے گواہی حاصل کر لیں۔ "تاریخ عرب" کے مصنف فلپ کے ہٹی سے پوچھ لیں یا "مقدمۂ تاریخ سائنس" کے مرتب جارج سارٹن سے رائے لے لیں۔ علوم و فنون اور تاریخ تمدن کے یہ سب مغربی مدونین علم و فن پر دسترس ہی کے حوالے سے دنیا کی اُس وقت کی صنعت و تجارت پر عربوں کو اجارہ دار قرار دیتے ہیں۔ عربوں اور عربی کو یہ مقام و مرتبہ محض عرب یا عربی ہونے کی حیثیت سے نہ ملا تھا بلکہ یہ عربوں کا اپنی زبان کے ساتھ محبت کا شغف تھا جس نے ترقی و خوشحالی کے ہر دروازے کا رُخ انہیں کی طرف پھیر دیا تھا اور وہ اس وقت کی معلوم دنیا کے ہر براعظم کے بڑے حصے کے واحد حکمران تھے۔

غرض یہ کہ تعمیر و ارتقا کے وسیلے کی حیثیت سے نہ اس زبان کی کوئی تخصیص ہے نہ اُس زبان کی۔ کھری اور سچی حقیقت یہ ہے کہ جو فرد یا قوم آگے بڑھنا چاہتی ہے، اسے اپنی زبان کو،

جس کے ساتھ اس کے شب و روز وابستہ ہیں اور جس کا ان کی ہر سانس کے ساتھ تعلق ہے، پورے اخلاص، محبت اور دیانت و محنت کے ساتھ اسے خود آگے بڑھانا ہو گا۔

اگر یہ اصل اصول سچ نہ ہوتا تو سوچیے کہ اپنے حروف تہجی کی تعداد اور تحریر کی ترتیب کے حوالے سے دنیا کی مشکل ترین زبانیں .... چینی اور جاپانی .... اب تک ڈوب چکی ہوتیں اور ان کے بولنے والوں کا آج کی دنیا میں کوئی رول نہ ہوتا۔ کیا ان دونوں قوموں کے حوالے سے حقیقت اس کے قطعی برعکس نہیں؟ ان زبانوں کی صوتی علامات یعنی ان کے حروف تہجی تین تین ہزار سے بھی زیادہ ہیں۔ وہ تو انگریزی سے مرعوب نہیں ہوئے۔ انہوں نے تو اسے تعلیم کا ذریعہ نہیں بنایا۔ جاپان سے امریکہ کے صنعتی خوف کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں اور چین وہ ہے کہ جس نے اپنی ہی زبان میں تحقیق و محنت کے بل بوتے پر دو ڈھائی سال کی قلیل ترین مدت میں اس وقت کی نمبر ایک سپر پاور اور آج کے نیو ورلڈ آرڈر کے اجارہ دار امریکہ کو ایٹمی دھماکے کی وساطت سے خبردار کر دیا تھا کہ چین کی طرف میلی آنکھ سے دیکھنے والے کی بصیرت کو بھی عبرت بنا دیا جائے گا۔

2۔ یاد رکھیے زبان صرف ذریعۂ اظہار یا تحقیق و تدقیق کا آلہ ہی نہیں ہوتی بلکہ ملی تشخص کی خالق اور محافظ بھی ہوتی ہے۔ اسی لئے کوئی جرمن یا فرنچ یا ملی غیرت کا حامل اور اپنی ہستی سے آگاہ کوئی دوسرا ملک کبھی انگریزی یا کسی دوسری زبان کو بلاضرورت گلے نہیں لگاتا۔ دیکھیے فرانس والوں کو اپنی قومی انا کا کس قدر پاس ہے کہ برگر، کوکا کولا اور فاسٹ فوڈ جیسے عام استعمال ہونے والے انگریزی الفاظ کو بھی اپنی روزمرہ کی بول چال میں لے آنا پسند نہیں۔ انہوں نے اپنی قومی اسمبلی سے ان کے متبادل فرانسیسی الفاظ کا استعمال نہ کرنے والے افراد کو ساڑھے تین ہزار ڈالر جرمانے کا قانون پاس کروا لیا ہے۔ (بحوالہ تکبیر جلد 19، شمارہ:44، برائے 30 اکتوبر 1997ء)

ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے
ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ

3۔ اردو نہ صرف یہ کہ ہمارے ملی تشخص کی آئینہ دار ہے بلکہ بلاخوفِ تردید اسلام کے بعد پاکستان کی خالق ہے۔ سو اس سے دوری بلاشبہ اپنے اجتماعی تشخص کا انکار ہے اور یہ کوئی پاگل ہی کر سکتا ہے۔ ڈاکٹر غوث محمد خٹک جو ستر کے عشرے میں پشاور یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے، ہماری علمی دنیا کا قابل احترام نام ہے۔ چلئے انہیں کی بصیرت کو قبول کر لیجئے۔ اپریل 1976ء میں پشاور یونیورسٹی میں قومی زبان کانفرنس کے اختتامی اجلاس میں ان کے الفاظ تھے،

"مسلمانوں میں اجتماعی روح پیدا کرنے، ان کے ملی شعور کو بیدار کرنے، 1857ء کی تباہی و بربادی کے بعد ان کے مردہ دلوں میں حیات نو کی لگن پیدا کرنے میں اردو کا بہت بڑا حصہ ہے۔ یہ زبان مسلمانان جنوبی ایشیا کی حیات اجتماعی کا مظہر ہے اور ایسا مجلّٰی و مصفّٰی آئینہ ہے جس میں ان کی قومی زندگی کے خدوخال اور نازک سے نازک نقوش پوری آب و تاب سے جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ یہی وہ زبان ہے جس نے مسلمانان برعظیم کی ساری قومی تحریکوں اور اجتماعی کوششوں کو پروان چڑھایا۔ ہر مسلم تحریک کی مدد کی مثلاً سید احمد شہیدؒ کی تحریک جہاد، سرسید کی اصلاحی تحریک، یہی زبان ہے جس کے وسیلے سے پاکستان کے حق میں سارے غیر منقسم ہندوستان کے مسلمانوں کو متحد و ہم آواز کیا گیا۔ غرض یہ زبان نہ صرف جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کا مخزن، ان کے علوم و فنون کا سرچشمہ اور ان کی مادی و روحانی ترقیوں کا وسیلہ ہے بلکہ یہ ان کی قومی اور اجتماعی زندگی کے لئے شہ رگ کی مانند ہے جس کے بغیر ان کے بقا و استحکام کا تصور مشکل ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ یہی وہ زبان ہے جس نے وہ کام انجام دیا جو مسلمان بادشاہ اپنے ہزار سالہ دور حکومت میں نہ کر سکے تھے یعنی ان میں وحدت خیال و عمل پیدا کی اور مشترک مقصد کے لئے مل کر کام کرنے کا گر سکھایا۔ انہیں اسلام کی اجتماعی روح سے آشنا کیا اور ہزار سال کے خوابیدہ ملی شعور کو بیدار کیا۔ یہ اردو ہی کا احسان ہے کہ اس نے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کو علاقائی اور خطہ جاتی تعصب کی دلدل میں پھنسنے نہ دیا اور ان کے احساسات کو ملی اور قومی مفادات کے زیر اثر رکھا۔ غرض اردو ہمارے مذہبی و روحانی، تہذیبی و ثقافتی، علمی و ادبی سرمائے کی سب سے بڑی امین ہے۔ یہ ملک کے ایک گوشے سے لے کر دوسرے گوشے تک سمجھی جاتی ہے۔ اپنے رسم الخط اور ذخیرہ الفاظ کے لحاظ سے ایران اور دوسرے ہمسایہ اسلامی ممالک کی زبانوں سے بہت قریب ہے اور اسی لئے اتحادِ عالمِ اسلامی میں بھی ممد و معاون ہو سکتی ہے۔ یہی سب باتیں تھیں جن کے پیش نظر قائداعظمؒ نے متعدد بار اعلان کیا تھا کہ پاکستان کی قومی اور سرکاری زبان اردو ہو گی۔" (نوائے وقت۔ راولپنڈی مورخہ 19 اپریل 1976ء)۔ اسی خطبہ میں انہوں نے سائنس کے حوالے سے کہا کہ "آج اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ موجودہ دور سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے اور آج کے اس سائنسی زمانے میں کوئی قوم، کوئی معاشرہ سائنس کے دھارے سے الگ رہ کر تیزی سے ترقی کرنے کا تصور تک نہیں کر سکتا۔ سائنس کی رفتار کا ساتھ دینے کے لئے صرف سائنس کے گریجویٹ یا محقق تیار کر لینا اور صنعتیں قائم کر لینا کافی نہیں ہے۔ ضروری ہے کہ معاشرے کے سب لوگ دیہی اور شہری، مرد اور عورت، بوڑھے اور بچے، محنت کش اور کسان، غرض ہر

شخص سائنس سے کام لینے لگے۔ جب تک ایسا نہ ہو، یہ نہیں کہا جا سکے گا کہ قوم فی الحقیقت سائنس سے مستفید ہوئی ہے اور سائنسی دور میں داخل ہو گئی ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ سائنس کے حقائق و قوانین، سائنسی معلومات اور سائنسی طریق فکر عامۃ الناس تک پہنچے۔ سائنس کو جلد از جلد عوام تک پہنچانے کے لئے اردو زبان جس قدر ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہے اور کوئی زبان نہیں ہو سکتی۔ ضرورت ہے کہ اردو میں زیادہ سے زیادہ سائنسی ادب شائع کیا جائے۔ ایسا سائنسی ادب جو عوام میں سائنس کے مطالعہ کا شوق اور سائنس پر یقین و عمل کرنے کا جذبہ پیدا کر سکے۔ عوام کے رجحانات اور ذہنی رویوں کو تبدیل کر کے ایک سائنسی فضا پیدا کرنے کا دشوار کام اگر آسان ہو سکتا ہے تو اردو ہی کی مدد سے آسان ہو سکتا ہے۔ وقت کا بڑی شدت سے تقاضا یہ ہے کہ سائنس کے دروازے عوام الناس پر کھول دیئے جائیں تاکہ وہ صحیح سائنسی بصیرت سے بہرہ اندوز ہو سکیں۔ ان دروازوں کی شاہ کلید اردو کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے؟" (بحوالہ ایضاً)

4 - ہفت روزہ تکبیر کے شہید مدیر محمد صلاح الدین جیسی گہری اور پختہ سوچ اللہ تعالیٰ ہر شخص کو دے۔ جانے سیاسی "دانا" عقل و دانش سے کیوں کد رکھتے اور ان کے ان الفاظ کو کیوں نظر انداز کر دیتے ہیں کہ "یہ دعویٰ کہ انگریزی ذریعہ ترقی ہے ہزار بار باطل ٹھہرایا جا چکا ہے اور ہمعصر دنیا کے ترقی یافتہ ممالک اس کی نفی کرتے ہیں۔ جرمنی، فرانس، ہالینڈ، ڈنمارک، سویڈن، ناروے، بلجیئم، اٹلی، جاپان، چین اور کوریا سب اس دعوے کا بطلان کرتے ہیں۔ مگر ہماری سیاست، فوج اور بیورو کریسی پر قابض وہ طبقہ جو گرامر، پبلک، امریکن اور انٹرنیشنل اور ایچی سن کالج جیسے اداروں کے سہارے اپنی نسل کے تسلط کو برقرار رکھنا اور پورے معاشرے پر اپنی بالادستی کا تسلسل جاری رکھنا چاہتا ہے کسی دلیل کو سننے کے لئے تیار نہیں۔ صرف سائنس کا شعبہ لیجئے جس کا بطور خاص حوالہ دیا جاتا ہے، پاکستان کے تمام نامور سائنسدان ڈاکٹر عبدالقدیر، ڈاکٹر عبدالسلام، ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی سب کے سب اردو میڈیم سکولوں سے برآمد ہوئے ہیں۔ انگلش میڈیم نے کوئی بڑا سائنسدان، کوئی نامور ادیب، کوئی قابلِ ذکر مؤرخ یا کسی اور شعبۂ علم کا ماہر ہمیں فراہم نہیں کیا۔ اس نے صرف بیورو کریٹ اور فوجی افسران یعنی حاکم مہیا کئے ہیں۔ غیر ملکی زبان امتیازی حیثیت اور اعلیٰ مناصب تو عطا کر سکتی ہے لیکن تخلیقی صلاحیتوں اور فکر و نظر کی گہرائی اور گیرائی کے لئے وہ سم قاتل ثابت ہوتی ہے۔ ہمارے اس مخصوص اور محدود طبقہ کی بڑی اکثریت مغربی تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے۔ طرز زندگی،

ثقافت، افکار و نظریات، مقاصد و اقدارِ حیات اور اپنے تصورِ دنیا (World View) میں یہ مغرب سے بہت قریب اور اپنی قوم سے بہت دور ہے۔ اس نے بڑی عیاری سے اپنے مفادات کی تکمیل کے لئے یکساں نظام تعلیم کے ابھرتے ہوئے مطالبے کا زور توڑنے کے لئے یہ حربہ استعمال کیا ہے کہ انگریزی سب کے لئے اور وہ بھی پہلی جماعت سے لازم کر دو تاکہ انگریزی اور اردو میڈیم کا فرق ختم کر دینے کا تاثر دیا جا سکے۔" (ہفت روزہ تکبیر، جلد 19، شمارہ: 45، ص 9)

5۔ پنجابی کہاوت "چوروی کہندے چور او چور" کے رنگ و آہنگ میں آپ سائنس سائنس اور ترقی ترقی کا شور مچا کر خود سائنسی علوم اور ترقی ہی کا راستہ کیوں روک رہے ہیں؟ اگر آپ واقعتہً ترقی بمعنی ملی ترقی ہی کے خواہاں ہیں اور مظلوم پاکستانی قوم کے ساتھ نصف صدی سے ہونے والے مذاق کا تسلسل توڑنا چاہتے ہیں تو صلاح الدین شہیدؒ کے ان الفاظ کو بھی دل و دماغ میں جگہ دیجئے۔ وہ آپ کو خود آپ ہی کی تاریخ یاد دلاتے ہیں کہ "بنو امیہ اور بنو عباس کے دور میں چند افراد نے یونانی اور رومی علوم کو عربی میں منتقل کیا اور عرب اطبا، فلاسفہ، ماہرین فلکیات اور دیگر علوم کے اساتذہ نے اپنی زبان میں ان علوم کو وسعت دی۔ بعد میں قرطبہ اور غرناطہ یونیورسٹیوں کے ذریعہ عربی کا ترقی یافتہ سرمایہ علم یورپی زبانوں میں منتقل ہوا اور اس نے وہاں جدید فکر و فلسفہ اور صنعتی عہد کی بنیاد رکھی۔ انگریز برصغیر آئے تو حیدر آباد دکن، اعظم گڑھ، دہلی، لاہور اور دوسرے علمی مراکز میں دارالتراجم قائم ہوئے اور اردو زبان جدید علوم سے مالامال ہوئی۔ آج روس، جرمنی، فرانس، جاپان، چین، ہالینڈ اور دیگر ترقی یافتہ ممالک میں بھی مختلف زبانوں سے تازہ علوم اپنی زبان میں منتقل کرنے کے لئے دارالتراجم موجود ہیں جہاں ایک سے دو ماہ یا زیادہ ضخامت کی صورت میں چند ماہ کے اندر اندر مختلف مضامین کی کتابیں ترجمہ کر کے اپنی زبان کے دامن میں ڈال دی جاتی ہیں۔ مجھے ٹوکیو میں یونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے بتایا کہ امریکہ میں چھپنے والی کوئی معروف اور اہم کتاب ہم زیادہ سے زیادہ چھ ماہ میں جاپانی زبان میں منتقل کر دیتے ہیں اور ہر جاپانی اس سے استفادہ کی سہولت حاصل کر لیتا ہے۔ یہی صورت دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے لٹریچر کی ہے۔ ماسکو اور ٹوکیو کے دارالتراجم تو دنیا بھر میں خصوصی شہرت رکھتے ہیں، بالکل یہی انتظام جرمنی، فرانس، ہالینڈ اور دیگر ممالک میں بھی ہے۔ پاکستان میں ایک انوکھا اور دنیا بھر سے مختلف تجربہ کیا جا رہا ہے اور وہ یہ کہ انگریزی علوم سے استفادہ کے لئے پوری قوم کی زبان بدل ڈالو، اس کے ایک ایک بچے کو جبراً انگریزی پڑھاؤ اور دماغ میں یہ بات بٹھاؤ کہ اردو تو بس ایک بولی ہے علوم سے، دفاتر کے انتظامات سے، عدلیہ سے، فوج کی تنظیم سے اور تعلیم و تربیت سے نہ اس کا کوئی واسطہ

ہے اور نہ اس میں اس کی اہلیت" (حوالہ ایضاً) آپ کے مقتدا مغرب کا کھڑا کیا ہوا ادارہ یونیسکو تو اپنی باقاعدہ تحقیق کے مطابق پاکستان کی زبان اردو کو چینی اور انگریزی کے بعد دنیا کی تیسری بڑی زبان قرار دے رہا ہے اور آپ اس میں نا اہلی اور بے صلاحیتی کے کیڑے ڈال رہے ہیں۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

6۔ اصل بات انگریزی کی صلاحیت و اہلیت یا اردو کی نا اہلی اور بے صلاحیتی کی نہیں بلکہ حاکم طبقہ کا یہ خوف ہے کہ انگریزی کے جانے اور اردو کے نفاذ کے نتیجہ میں اس کا آرام طلب، سہل کوش اور محنت سے فرار کا عادی "بادشاہ" بچہ ایک عام محب وطن، دیانتدار پاکستانی بچے کا ذہنی اور عملی میدان میں مقابلہ نہیں کر پائے گا اور یوں "مضبوط کرسی" اس طبقہ کے نیچے سے کھسک جائے گی اور اس کی حاکمیت کا شیش محل جس میں بیٹھ کر وہ نصف صدی سے عام آدمی پر پتھر پھینک رہا ہے چکنا چور ہو جائے گا۔

7۔ کراچی یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشیؒ جو ہماری علمی تاریخ ہی نہیں تحریک پاکستان کا بھی ایک مخلص نام ہے، ہم عصر علوم اور مسائل کی بحث و تفہیم میں اردو کے ذخیرہ اسلامی ادب کو عربی ذخیرہ کے مقابلے میں کہیں زیادہ ضخیم اور معنوی اعتبار سے زیادہ وزنی قرار دیتے ہیں۔ اس حقیقت کا ادراک ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی یا کچھ دیگر علماء و حکما ہی سے خاص نہیں، ان سے بہت پہلے علامہ اقبالؒ کے اسی شعور نے تصور پاکستان کو جنم دیا اور حضرت قائدؒ نے اپنے اسی مجلیٰ احساس کے پیش نظر ہی اس تصور کو خطۂ ارض پر پاکستان کی صورت میں ایک زندہ حقیقت بنایا اور اسی ادراک نے لیاقت علی خاں کے ہاتھوں قرارداد مقاصد نے آئین پاکستان کے نیو کلئیس کی صورت اختیار کی۔ مقتدر دشمن کو تو ہمیشہ سے اس حقیقت کا خوب خوب ادراک رہا ہے۔ اسی لئے اس کی تمام کوششوں کا رخ طرح طرح کے علاقائی اور لسانی تعصبات اٹھا کر اردو اور اسلام دونوں کی بیخ کنی کی طرف رہا ہے۔ یہ مقتدر دشمن مغربیت کی رسیا، اباحیت شعار اور تظلم کیش سیاہ ست دانوں (ست بمعنی روح) اور "خوش فکر" بیورو کریسی کی صورت میں اندر موجود ہے اور ذہنی غسل (Brain Washing) کے بہت ہی قوی آلوں سی۔این۔این، بی۔بی۔سی جیسے ابلاغی نشریاتی اداروں اور صحافتی ادب کے ساتھ ساتھ، ہماری بجٹ رکھنے والی عالم اسلام کے خلاف ہر آن فعال، اپنی جاسوس خفیہ ایجنسیوں کی معیت میں برطانیہ اور امریکہ کے روپ میں باہر بھی۔

8- یہ دونوں گروہ خوب جانتے ہیں کہ "تبدیلیٔ تہذیب و ثقافت اور ذہنی غسل کا سب سے مؤثر اور تیز رفتار ذریعہ بھی زبان ہے اور جب یہ تبدیلی آتی ہے تو اس کے جلو میں ہزاروں معاشی مفادات بھی سمٹ آتے ہیں۔ جاپانی زبان جاننے والا غیر ملکی فرد جاپان جانے، جاپان کی اشیا خریدنے، جاپان سے روابط بڑھانے کا فطری رجحان اپنے اندر پائے گا۔ یہی حال عربی، فارسی، جرمنی، فرانسیسی، ہسپانوی اور ولندیزی زبان جاننے والے کا ہوگا۔ یہ ذہنی رشتہ متعلقہ فرد کو اپنے پسندیدہ ملک کا سیاح اور اس کی مصنوعات کا خریدار بنا دیتا ہے اور یہ چیز اس ملک کے معاشی مفادات کے فروغ کا بہترین ذریعہ بنتی ہے۔

پاکستان میں فروغ انگریزی کا مطلب ہے امریکی، برطانوی تہذیب کا فروغ، اس کی اقدار اور اس کے افکار و نظریات کا فروغ، اس کی مصنوعات کا اور معاشی مفادات کا فروغ، صرف ایک مثال لیجیے۔ اگر جاپان یا روس اور جرمنی کی طرح ہم امریکہ سے شائع ہونے والی کسی کتاب کا ترجمہ اردو میں چھاپ دیں تو دارالترجمہ کو صرف ایک یا دو جلدیں مطلوب ہوں گی۔ لیکن ہر پاکستانی کو انگریزی دان بنا دیا جائے تو ان میں سے ہر صاحب استطاعت یہ کتاب خریدے گا۔ دفتر میں الگ اور گھر میں الگ اس کو الماری میں سجائے گا۔ اس طرح لاکھوں کی کتابیں یہاں کھپ جائیں گی اور ذوق مطالعہ کا سارا فائدہ امریکہ کو ہوگا۔ اسی پر کوکا کولا، پیپسی کولا اور دیگر اشیا کو قیاس کر لیجیے۔"

محمد صلاح الدین شہید نے اپنے ہفت روزہ تکبیر جلد 19 شمارہ 46 میں اپنی اوپر کی تحریر کے تسلسل میں بالکل ٹھیک نشاندہی کی ہے کہ "انگریزی مندرجہ بالا تینوں مقاصد کے لئے امریکہ اور برطانیہ کو پاکستان میں مطلوب ہے۔ محدود مفاد یافتہ طبقے کی بالادستی، اس کے ذریعے سیاسی اور معاشی پالیسیوں کی تشکیل، تہذیب و تمدن کا تسلط اور اردو جیسی دینی زبان سے کاٹ کر سیکولرزم کی علمبردار اور خود اپنی مخصوص ثقافت کے فروغ کی ضامن زبان کا غلبہ یعنی اس کی حکمرانی۔" وہ لکھتے ہیں کہ "پہلی جماعت سے انگریزی کو لازمی قرار دے کر پوری قوم کی زبان تبدیل کرنے، قومی زبان اردو کو دفتروں سے باہر رکھنے اور بتدریج پیچھے دھکیلنے کا جو عمل ہمارے ہاں شروع ہوا ہے وہ قوم کی یکجہتی اور وحدت کو پارہ پارہ کرنے اور ہمیں ماضی سے کاٹ دینے کی گہری سازش ہے۔ ذرا دو دن ٹیلی ویژن پر اردو کو کلیتہً ترک کر کے انگریزی یا کسی علاقائی زبان سے کام چلانے کا تجربہ کر کے دیکھ لیجیے پتہ چل جائے گا کہ اردو کی خود وجود پاکستان کے لئے کیا قدر و قیمت ہے۔"

9 - اسلام سے ناروا طور پر خوفزدہ مغرب اور اس کے سر خیل امریکہ کے ممتاز اخبارات و جرائد جن میں کم و بیش سو فیصد پر اسلام کے دشمن صیہونی یہود کا قبضہ ہے اور اس کے دانشور جو

بیشتر وہاں کی یونیورسٹیوں کے پروفیسر ہیں جن کی طرف اشارہ ہم گزشتہ سطور میں کر چکے ہیں، کمیونزم کے بعد اسلام کو واحد خطرے کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔ اسرائیل اور بھارت کا خطرہ ہر وقت سر پر فعال ہے۔ اس پیش منظر میں تو ہمیں دشمن اور اس کی مکاریوں سے کسی لمحہ غافل نہیں ہونا چاہیے۔ اور ان کی چالوں کو خوب سمجھنا چاہیے۔ کیا ان کے لئے یہ بہت آسان اور سستا سودا نہ ہوگا کہ براہِ راست حملہ کے جواب کی سختی انگیز کئے بغیر انگریزی تسلط کے ذریعے ہمیں اپنے نصب العین اور دنیا کی حقیقی نجات کے صراط مستقیم اسلام سے ہٹا دیں۔ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ دشمن کو اور کیا چاہیے ...... انگریزی کا تسلط تو وہ عفریت ہے کہ جس کی موجودگی مغرب کے آلہ کار اداروں ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن، آئی۔ایم۔ایف اور ورلڈ بینک کے کام کو بہت آسان کئے دے رہی ہے۔ اگر ہم نے خودکشی کا حتمی ارادہ نہیں کر لیا اور دشمن کے لئے خود ہی تر نوالہ بننے کی نہیں ٹھان لی تو ہمیں انگریز اور انگریز کے پروردہ مقامی خانوادوں کے پھیلائے ہوئے اس دام ہمرنگ زمین سے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر نکل آنا چاہیے۔

10 ۔ علم قیادت کا خاصہ ہے اور قیادت ہمیشہ علم کی طالب لیکن علم وہ جو حقیقی ہو اور حقیقی ہونے کا معنیٰ صرف قابل فہم ہونا ہی نہیں بلکہ علم کا ہضم ہونا ہے۔ علم کا یہ رنگ صرف اس وقت نکھرتا ہے جب اسے آسان، بے تکلف اور سہل رکھا جائے۔ طالب علم اسے اپنے لئے بوجھل نہ پائے اور جو نہ علم کی کسی دوسری شاخ کے حصول میں رکاوٹ پیدا کرے۔ راقم الحروف جس نے گزشتہ پینتیس سال تک پہلی جماعت سے لے کر یونیورسٹی کی سطح کی پوسٹ گریجویٹ کلاسوں تک پڑھایا ہے اور اس مدت میں سے کم و بیش ربع صدی تربیت اساتذہ میں گزری ہے۔ دنیا بھر کے ماہرین تعلیم کی اس رائے کو قطعی برحق پاتا ہے کہ بچے کو کم از کم پانچ سال تک اس کی اپنی زبان کے سوا کوئی دوسری زبان نہ پڑھائی جائے اور نہ اسے ذریعہ تعلیم بنایا جائے کیونکہ وہ بچے کے لئے ناروا بوجھ، فہم کے لئے قاتل اور نفسیاتی نمو میں رکاوٹ ثابت ہوتی ہے۔ لیکن ہمارے ہاں کا باوا آدم نرالا ہے کہ ہمارے وہ ماہرین جن کی کاشت و برداشت یا تو انہیں قوتوں کی مکار آغوش میں ہوئی جو اسلام کو اپنے لئے سب سے بڑا خطرہ قرار دے رہی ہیں یا جو فرزند زمین ہو کر بھی معنوی ذریت انہیں کی ہیں، ہر بچے کو ابتدائے تعلیم ہی سے، طوطے کی طرح اکیسویں صدی میں داخلہ کی بے ہنگم رٹ کے ساتھ چار چار زبانوں کے بے جا بوجھ تلے دبائے جا رہے ہیں۔ چنانچہ اردو جو مطلوب حقیقی ہے اور دیگر مضامین جو نموئی تغذیہ مہیا کرتے ہیں کہ ساتھ مقامی زبان اور عربی کے علاوہ ان کی نگاہ میں "ناگزیر" لیکن ان دیکھے قطعی موہوم فوائد کے لئے انگریزی کو

بھی ابتدا ہی سے بچے کے سر پر مسلط کر دیا جاتا ہے۔ یہ تعلیم نہیں قتل عام ہے اور اس قتل عام کے باوجود اب تک کی حکومتیں یقین دلاتی رہی ہیں کہ ترقی کا محل آسمان کے کنگرے کو بس چھوا ہی چاہتا ہے۔

ع.... آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں

امریکہ جس کے در کہ جبہ سائی اب تک کی حکومتوں نے اللہ واحد سمجھ کر کی ہے، وہاں تو بچے کی تعلیم کی ابتدا چار چار زبانوں سے نہیں ہوتی۔ یہ اپنے امام ہی کی اس معاملہ میں اقتدا کر لیں۔ اسے تو سرد و گرم زمانہ نے بہت پہلے ہی سجھا دیا تھا کہ امریکہ اپنی اصل کے اعتبار سے بھان متی کا کنبہ ہے، کوئی جرمنی سے نکلا، کوئی برطانیہ سے بھاگا، کسی نے سپین، اٹلی، ڈنمارک یا فرانس سے رخت سفر باندھا، ہر ایک دوسرے کی زبان سے نا آشنا، انہوں نے تو مل کر اچھا فیصلہ کیا کہ آئندہ نسلوں کو.... خالص امریکی.... یعنی ایک ہی قوم بنانے کے لئے اپنی اپنی گھریلو یا علاقائی زبان کا لحاظ کئے بغیر، ابتدائی چھ ماہ بچوں کو صرف انگریزی پڑھائی جائے تا کہ اسے سرکاری کے ساتھ ذریعہ تعلیم بھی بنا دیا جائے اور یوں دنیا کی قیادت کے مشکل کام کو آسان کیا جائے۔ اگر آپ امریکہ کی تقلید ہی کو اپنے لئے حسنِ فلاح جانتے ہیں تو اس معاملہ میں اُس کے اختیار کردہ اصول کو کیوں اپنے لئے روا نہیں رکھتے اور کراچی سے خیبر تک ہر پاکستانی گھر کی اپنی زبان اردو کو جو صدیوں سے اپنی اہلیت ہی کی بنا پر ملی سطح پر رابطہ کی زبان ہے، خود اپنے ہی آئینی تقاضے کے مطابق سرکاری اور تعلیمی ذریعہ کے طور پر اختیار نہیں کرتے۔

آیئے حرفِ آخر کے طور پر ہم آپ کو بتائیں کہ ذریعہ تعلیم بننے والی زبان کے ہر معیار کے مطابق اردو نہ صرف اس کی ہر پہلو سے کامل اہلیت رکھتی ہے بلکہ ذریعہ تعلیم کے طور پر اختیار کر لینے کے بعد دنیا میں آپ کی امامت اور سیادت کی ضمانت بھی ہے۔

1۔ دیکھئے معیار کے حوالے سے سب سے پہلا نکتہ اس کا ہر طالب علم کے لئے اپنائیت کے احساس کے ساتھ ساتھ آسان، بے تکلف اور ماحول میں رچا بسا ہونا ہے۔ اس حقیقت کا آپ کیوں انکار کریں گے کہ صدیوں پہلے آپ کے اپنے گھر، بازار، ادارات غرضیکہ آپ کے اپنے اجتماعی، تمدنی اور تہذیبی ماحول نے اسے خود جنم دیا تھا اور یہ تب سے اب تک آپ کے تہذیبی ماحول میں رچی بسی ہی نہیں، ہر آن اس کے تسلسل اور تخلیقی رنگ کو زیادہ سے زیادہ اجلا کئے جا رہی ہے۔ آپ کے ادب کا، اس کا تعلق طبعی علوم سے ہو یا عمرانی سے، حیاتیاتی سے ہو یا ذہنی و نفسیاتی سے، عربی، فارسی اور انگریزی کے مقابلے میں سب سے زیادہ ذخیرہ اسی اردو میں ہے۔ اسے

آپ آج نافذ کر دیجئے، اس کے خلاف ہونے والے پراپیگنڈے کی دھول کل بیٹھ جائے گی اور نتیجتاً اس میں علم حاصل کرنے والے کی نہ صرف سیکھنے کی رفتار ہی تیز ہو جائے گی بلکہ علم کا، فہم کا حصہ بننے کی بنا پر، معیار بھی از خود بلند ہو جائے گا۔ یہ شراب ناب ہے، کوئی پی کر تو دیکھے۔ آپ نے تو اسے چکھے بغیر ہی اپنی نصف صدی ضائع کر دی۔ قوموں کی زندگی میں تو ایک ایک لمحہ قیمتی ہوتا ہے اور آپ نے ہر لمحہ اپنی ہلاکت کا سامان خود کیا ہے۔ آپ تو 1971ء میں سقوطِ ڈھاکہ ایسا بڑا طمانچہ کھا کر بھی عبرت کو راہ نہیں دے رہے۔

احساس مر نہ جائے تو انسان کے لئے

کافی ہے ایک راہ کی ٹھوکر لگی ہوئی

2۔ عربی، اسلامی علوم کے ماخذ کی حیثیت سے اور اردو، اسلامی علوم کے عربی سے بھی کہیں بڑے ذخیرہ کی امین کی حیثیت سے، ہر مسلمان کے طبعی میلان کا از خود حصہ ہے، آپ اردو کے حروف تہجی کی شناخت بچے کو دے دیں، عربی اور فارسی کے صوتی علائم یعنی حروف ابجد اسے از خود یاد ہو جائیں گے، سو اردو کے ساتھ اپنائیت کا احساس تو برصغیر کے ہر مسلم بچے کی فطرت میں شامل ہے اور پھر چونکہ "تحریک پاکستان کی زبان" ہی اردو تھی اس لئے اپنے اس بنیادی رول کی بنا پر آپ کے پاکستانی تشخص کی خالق ہی نہیں، اس کی محافظ بھی ہے۔ سو بچے کا طبعی میلان، اگر اس کی طرف نہیں ہوگا تو کیا آپ کی محبوب قتالہ عالم انگریزی کی جانب ہوگا؟

3۔ نظریہ پاکستان، اقبال و قائد اور اردو کا مخالف پروپیگنڈے باز اس کے جس وصف کو اس کی کمزوری باور کراتا ہے، وہ حقیقتاً جامعیت کی حامل اس کی بہت ہی بڑی خوبی ہے، اردو کے لفظ "تہذیب" اور اس کے انگریزی مترادف "Civilianization" کو نوٹ کیجئے، اردو کے لفظ کا صرف آخری حرف آپ سے تھوڑی سی زیادہ جگہ اور لکھنے میں زیادہ وقت کا طالب ہوگا کہ وہ پورا لکھا جائے گا جبکہ باقی تمام حروف کے محض سرے ہی کفایت کر کے آپ کے وقت، توانائی اور جگہ کی بچت کے ضامن ہوں گے۔ کیا آپ کی ممدوح انگریزی بھی آپ کو یہ سب سہولیات مہیا کرتی ہے۔ اسی طرح بظاہر ایک لیکن مخارج کی نسبت سے ایک ہی آواز کے حامل اردو کے حروف تہجی مثلاً "ذ، ز، ض، اور ظ" یا "ت" اور "ط" وغیرہ جو اس کی وسعت، گہرائی اور نئے الفاظ کی ڈھلائی کی صورت میں اس کے حسنِ ارتقا کا وسیلہ ہیں، اندھا پروپیگنڈے باز انہیں بھی اس کی کمزوری باور کرواتا ہے۔

فکر محبوس، زبان "بند"، نظر پر پہرے

4۔ امتحان میں بیٹھے طالب علم کو شعور میں لائیے۔ نکتہ نمبر 3 میں بیان کردہ اردو کی فطری اختصار نویسی یقیناً اس کے لکھنے کی رفتار کو زیادہ ہی نہیں کرے گی، کم توانائی کی بھی طالب ہوگی، یوں وہ تھکے بغیر زیادہ بہتر حل پیش کرے گا۔ پھر یہ آسانیاں اس کی سوچ کو زیادہ پرسکون، زیادہ وسیع اور زیادہ گہرا کرنے میں بھی معاون ہوں گی۔ اردو سے دوری کے جبر نے ہمارے بچوں کو کن کن فوائد سے دور پھینک دیا ہے۔ یا اللہ ہمارے حاکم کو اس کی پاکستانیت کا عرفان عطا فرما۔

5۔ سوائے ایک مغرب زدہ اباحیت پسند اور معاملات کو امریکہ اور برطانیہ کی آنکھ سے دیکھنے والے مختصر مگر مقتدر گروہ کے، معاشرے کے اندر اردو کے خلاف کہیں کوئی تحفظ، تعصب، نفرت اور کدورت عوامی سطح پر موجود نہیں۔ سندھ کا حوالہ اس لئے قبول نہیں کہ بھٹو رجیم (یہ رجیم انگریزی سے زیادہ عربی کا ہے) کے دوران دو لسانی چکر محض اپنی بد عمل حاکمیت کو تحفظ دینے کا سراسر منفی حربہ تھا۔ عوامی سطح پر آج بھی سندھ میں اردو کے خلاف کوئی جذبہ نہیں۔ سندھ کا صوفیانہ لٹریچر دین سے اپنے شغف کی بنا پر اردو کے لئے اہلِ سندھ کی آغوش کو ہمیشہ گرم جوش پاتا رہا ہے۔

7۔ بھلا وہ زبان جو ملت اسلامیہ ہند کے ماضی و حال پر مشتمل ہر طرح کے افکار و علوم کی امین ہو، جس کی قوت تاثیر نے برصغیر کی ملت اسلامیہ کے ہر بچے کو حصول پاکستان کے لئے سر تا پا متحرک کر دیا ہو، اسلامی پاکستان کی تہذیب و ثقافت سے ہم آہنگی کے لئے اس کے اپنے وجود سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہوگی۔ بلاشبہ یہ ہمارے ماضی کی روایات مجتمع کی امین ہے۔ خود غرضانہ ضد چھوڑ کر اگر آج اسے عملاً اپنا لیا جائے تو نہ صرف ہمارا حال تیزی سے ترقی کی جانب خوش قدم ہو جائے گا بلکہ مستقبل ہمارا اور صرف ہمارا ہوگا۔

اٹھ کہ خورشید کا سامانِ سفر تازہ کریں
نفسِ سوختۂ شام و سحر تازہ کریں

7۔ اردو اپنی طبعی لچک کی بنا پر دنیا کی سب سے زیادہ خوش مزاج ہی نہیں، سب سے زیادہ رواداری کی حامل بھی ہے کہ کائناتِ ارضی کی ہر زبان کا لفظ بہت آسانی کے ساتھ اسے ضرورت کے وقت "اپنے لفظ" کے طور پر قبول ہوتا ہے۔ اپنی وسعتِ نظری اور وسعتِ قلبی کی بنا پر اکثر تو دوسری زبانوں کے الفاظ من و عن قبول کر کے اپنا لیتی ہے، بعض اوقات تارید (اردو بنانے) کے تقاضے کے تحت ذرا سی غیر محسوس تبدیلی کے بعد، کہ اس طرح تلفظ کی خوش ادائی میں مزید سہولت حاصل ہوتی ہے مثالیں بے جا طوالت کے مترادف نہ ہوتیں تو ہم بتاتے کہ یورپ،

افریقہ اور ایشیا اور معلوم دنیا کی وہ کونسی معروف زبان ہے جس سے اردو نے اپنی مزاجی لچک کی بنا پر فائدہ اٹھا کر اپنے ذخیرہ الفاظ میں ہر آن نیا اضافہ نہیں کیا۔ اگر انگریزی کو یہ حق ہے کہ عربی کے "معیار" کو "Measure" اور "انزال الانف" کو "Influenza" اور "قطن" کو "Cotton" کی صورت میں اپنا لے تو اردو پر کب یہ پابندی ہے کہ وہ انگریزی، چینی، جاپانی، عربی، فارسی، جرمن، ڈچ، فرنچ، سپینش یا لاطینی و یونانی اور روسی وغیرہ سے فائدہ نہ اٹھائے۔ ہر زبان کے لئے اپنائیت اس کی اٹھان ہی سے اس کا مزاج رہا ہے۔ چنانچہ اب تو اس کے ذخیرہ الفاظ کو کسی ایک یا گنتی کی محض چند جلدوں پر مشتمل لغات میں سمیٹنا مشکل ہو رہا ہے۔ ھل من مزید اس کے ہر لحہ کی صدا ہے۔ "مقتدرہ قومی زبان" اور "مجلس ترقی ادب" جیسے ادارے سائنسی اصطلاحات کے حوالے سے بھی اتمام حجت کر چکے ہیں۔ پھر اس کی مختصر ترین صوتی علامات یعنی حروف تہجی کا خصوصی وصف یہ ہے کہ اس میں دنیا کی ہر زبان کا تلفظ با آسانی اور بخوبی ادا کیا جاسکتا ہے۔ اگر ہم ذہنی غلامی کے چنگل سے رہائی پاسکیں تو ہم دیکھیں گے کہ اردو ہمیں سپٹنک اور اپالو کی چال سے بھی زیادہ تیز رفتار کے ساتھ دنیا کی قیادت کی طرف اونچا اڑا لے جائے گی۔ یاد رکھئے کہ دنیا کی امامت بحثیت مسلمان نہ صرف ہمارا دینی فریضہ ہے بلکہ دستوری تقاضا بھی۔

او غافل "دہقان"

اپنی خودی پہچان

8۔ پاکستان کی آزادی میں اپنے تخلیقی رول اور ماحول میں اپنے فطری رچاؤ کی وجہ سے طالب علم کی نگاہ میں اسے بہترین ذریعہ تعلیم باور کروانے کے لئے کسی پراپیگنڈے پر وقت، وسائل اور توانائی کی ذراسی مقدار بھی ضائع کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ فہم کے قاتل انگریزی کے مصنوعی ذریعہ سے نکلنے کے لئے یونیورسٹی سطح کا طالب علم بھی اپنی درسی کتب کو ترجمہ یا ترجمانی کی ذاتی کوشش کی حد تک عملاً اب بھی اردو ہی کو وسیلہ بناتا ہے اور بلاشبہ پوسٹ گریجویٹ سطح کا استاد بھی طالب علم تک اپنے اسباق کے ابلاغ کے لئے اردو انگریزی کی کھچڑی پکانے پر مجبور ہے۔ مقتدر طبقہ کے محض چند ہزار افراد کے لئے چودہ کروڑ انسانوں کی زبان کا ناس نہ ماریئے۔ ان کی ترقی کی راہ کھوٹی نہ کیجئے۔ کرسی کے چھن جانے اور مغرب کے خوف سے نجات پائیے۔ اردو کو پوری دلجمعی کے ساتھ ہر سطح پر ذریعہ تعلیم کے طور پر اپنانے کا فرمان جاری کر دیجئے۔ معلم اور متعلم دونوں ہی فہم کے لئے آزاد ہو جائیں گے اور ترقی اپنی بیڑیاں کاٹ کر پورے ہوش کے ساتھ آپ کے آگے آگے دوڑے گی۔ آپ کو یہی تو چاہئیے ناں!

9- سائنسی، فنی اور تکنیکی علوم کے حوالے سے ذریعہ تعلیم کے طور پر اردو اپنی کامیابی اور افادیت ڈیڑھ صدی سے بھی زیادہ پہلے، ثابت کر چکی ہے۔ "ایسٹ انڈیا کمپنی کے قائم کردہ دہلی کالج برائے سائنس و فنون (1824ء)، میڈیکل کالج آگرہ (1824ء)، انجینئرنگ کالج رڑکی (1848ء)، وٹرینری کالج پُونا (1854ء) میں اور عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن اور کشمیر میں 1947ء تک سائنس، انجینئرنگ، میڈیسن اور قانون میں ڈاکٹریٹ کی سطح تک اردو ہی ذریعہ تعلیم تھی۔"[1] ہندی مسلمانوں کی جانب سے 1857ء کا جہادِ آزادی وہ موڑ ہے کہ جس کے بعد ہندو اور انگریز کی سازش کے تحت اردو ذریعہ تعلیم کو ہندی مسلمانوں کے حفظ و بقا کا ضامن ہونے کی بنا پر بتدریج انتقاماً ختم کر دیا گیا۔ نہ صرف ختم کر دیا گیا بلکہ اس کے خلاف پروپیگنڈہ کا محاذ بھی کھول دیا گیا۔ یہ محاذ آج بھی پوری شدت کے ساتھ گرم ہے لیکن آج اردو کے خلاف "غدر" برپا کرنے والے گورے نہیں کالے انگریز ہیں، ہندو بنیے نہیں، اپنے آپ کو مسلمان کہلانے والے ہیں۔ ملتِ اسلامیہ پاکستان کی بدقسمتی کہ اس کے مقدر سے معاندانہ کھیلنے والے یہی کالے انگریز اس کے اقتدار پر بھی قابض ہیں۔

ڈاکٹر منور علی جنھوں نے جامعہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن سے اردو ذریعہ تعلیم کے تحت ایم۔بی۔بی۔ایس کیا اور پھر 1947ء تک وہاں اردو ہی میں ایم۔بی۔بی۔ایس کے طلبہ کو تعلیم دیتے رہے، لاکھ گواہی دیں کہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن سے اردو ہی میں ایم۔بی۔بی۔ایس کرنے والا طبی گریجویٹ، اردو ہی کی بناء پر اپنے بہتر طبی اور فنی فہم کے حوالے سے دوسری جنگ عظیم کے دوران برٹش ملٹری ہسپتال کا کمانڈنگ آفیسر بنایا گیا۔[2] لیکن پاکستان کا خود پرست کالا انگریز "میں نہ مانوں" کی رٹ بھلا کیوں چھوڑے گا۔ داناؤں کی بات بالکل درست ہے، کہ لاتوں کے بھوت، باتوں سے نہیں مانا کرتے۔ شاید یہ بھی اپنے خلاف کسی 1857ء ہی کو آواز دے رہا ہے۔ فیض نے غالباً انہیں لوگوں اور ان کے اندھے رویوں ہی کے پیش نظر کہا تھا

بے داد گروں کی بستی ہے، یاں داد کہاں، فریاد کہاں
سر پھوڑتی پھرتی ہے ناداں، فریاد جو گھر گھر جاتی ہے

10- اہل نظر کے لئے اوپر ہم نے جو شافی دلائل اردو کی بطور ذریعہ تعلیم، ترویج کے لئے

---

1 - پروفیسر سید محمد سلیم مضمون بعنوان "ذریعہ تعلیم اردو" مطبوعہ ماہنامہ "اخبارِ اردو" اسلام آباد (مقتدرہ قومی زبان) شمارہ اپریل 1987ء

2- ڈاکٹر منور علی مضمون بعنوان "جامعہ عثمانیہ میں اردو میں طبی علوم کی تعلیم" حوالہ ایضاً

پیش کئے ہیں وہ ہمیں سیدھے اس مُلخص تک لاتے ہیں کہ اردو اور تنہا اردو ہی وہ شاہراہ ہے جو مقاصد حیات اور تعلیم کے اہداف کے حصول کے لئے طالب علم کو سب سے زیادہ آسانی، کم وقت، کم وسائل اور تھوڑی لیکن باروَر محنت کی ضمانت دیتی ہے۔

اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کی برکات:

ہر صاحب نظر جانتا ہے کہ انسانی زندگی میں اصل قوت فکری اور نظری ہوتی ہے۔ تعلیم اسی قوت کی تربیت کرتی ہے۔ یہ بھی مسلّم ہے کہ پورا انسانی وجود دماغ کے کنٹرول میں ہوتا ہے، سو دماغ کو، انگریزی کی صورت میں، غیر کے قبضہ میں نہ دیجئے۔ اردو کو لائیے اور نتیجہ میں بھرپور برکات سمیٹئے۔ اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے تعمیری اثرات تو بلاشبہ ان گنت ہیں لیکن ذیل کے چند ایک اتنے نمایاں ہیں کہ گویا خود منبعِ نور ہیں:

1۔ اس کے نتیجہ میں ہر طالب علم انفس و آفاق پر، محض رٹنے کے بجائے، اس کی روح میں اترنے والی نگاہ ڈالے گا۔

2۔ نہ صرف طالب علم کو اپنی ذات ہی کا صحیح عرفان حاصل ہوگا بلکہ اس کا نفسیاتی نمو تسخیر کائنات کے لئے اس کا رہبر و رہنما بھی ہوگا اور اس کا محرک اولین بھی۔ یہ اس لئے ہوگا کہ تعلیم حقیقی معنی میں نموئی تغذیہ مہیا کر کے اُس کے عُلو شخصیت کا باعث ہوگی۔ داناؤں کی یہ بات کسی دلیل کی محتاج نہیں کہ ٹینک خود نہیں لڑتا وہ سپاہی لڑتا ہے جس کے ہاتھ میں اس کا کنٹرول ہوتا ہے۔ سو اردو لائیے اور ترقی کے اصل اور سب سے بڑے عامل انسان کی حقیقی تعمیر کیجئے۔ ڈراپ آؤٹ کا ازالہ بھی یہی ہے۔

3۔ نفاذِ اردو کے نتیجہ میں علم قابل ہضم ہوگا۔ مثبت رویوں کی تشکیل کا ضامن ہوگا، نتیجتہً مقاصد حیات سے ہم آہنگ پاکستانی تیار ہوگا۔ معیارِ تعلیم کی بلندی کا حقیقی معنیٰ یہی ہے۔

4 ۔ علم و فن کے کیف و کم کا معیار بھی بلند ہوگا کہ شعوری منصوبہ بندی کے نتیجہ میں بیرونی زبانوں کے تیار کردہ ماہرین ملکی دارالتراجم میں ہر طرح کی معلومات کے ڈھیر لگا دیں گے۔

5۔ بربنائے فہم تعلیمی نمو کے نتیجہ میں علاقائی، لسانی اور مصنوعی تہذیبی امتیازات فرد کے دل و دماغ میں کوئی جگہ نہ پاسکیں گے۔ تعلیم اسے کھرا مسلمان اور پاکستانی بنائے گی۔ منکرات، معروف کے لئے جگہ چھوڑ کر راہ ترقی کی ہر ناہمواری کو صراطِ مستقیم میں بدل دیں گے۔

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

کالج ایجوکیشن کے بارے میں تین باتیں

ڈاکٹر شمیم حیدر ترمذی

پروفیسر حمید احمد خان اپنے مقالے "قیام پاکستان کے بعد تعلیم و تعلم کا زوال" میں لکھتے ہیں:

"کسی کالج کی سیر کیجئے آپ کو گمان ہو گا کہ آپ کسی ایسی دنیا میں ہیں جہاں دو متحارب فریق، استاد اور شاگرد بستے ہیں۔ دو ایسے متحارب فریق جو کسی عارضی صلح کے تحت کچھ عرصے کے لئے ایک دوسرے کا وجود برداشت کر رہے ہیں۔ استاد اپنے شاگردوں کے درمیان سے یوں گزر جاتا ہے جیسے اس کی نظریں انسانوں سے دوچار ہی نہیں بلکہ سامنے ایک سپاٹ دیوار ہے۔ دوسری طرف شاگرد اپنے استاد کو دیکھتے ہی یوں نظریں چرانے لگتا ہے جیسے کوئی مفلس اور مقروض آدمی قرض خواہ کی صورت دیکھ کر گلی کے نکڑ پر مڑ جانے کی فکر کر رہا ہو۔" (تعلیم و تہذیب۔ ص 69)

کالج کے ایک کامیاب استاد اور ماہر تعلیم کے ان الفاظ میں مجھے آج کی کالج ایجوکیشن کی سب سے بڑی خامی کا نشان ملتا ہے۔ ہمارے کالجوں میں معلم اور متعلم کے درمیان رابطہ مفقود ہے۔ شاگرد، استاد کی ذاتی توجہ کو ترستا ہے اور استاد، شاگرد کو انسان اور مستقل شخصیت نہیں بلکہ صرف اور صرف کسی ہجوم کا فرد سمجھتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ ذہن اور دل، علم اور اقدار، تعلیم اور تربیت کے درمیان ایسی دیوار کھڑی ہو گئی ہے جس کو پھلانگنا متعلم کے بس کی بات نہیں رہی۔ میں سمجھتا ہوں کہ پر ہجوم جماعتوں کے باوصف آج بھی اس مسئلے کا حل ٹیوٹوریل میٹنگز کا احیاء ہے۔ ہمارے ہاں ٹیوٹوریل اجلاس کا ذکر شائد کالج کے ٹائم ٹیبل میں تو موجود ہے لیکن یہ سسٹم اب بے روح جسم بن چکا ہے اور ایک مدت سے اس لاش کو ٹھکانے لگانے کا جتن بھی کر رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ Tutorial Meetings میں باقاعدگی، تواتر، تسلسل اور افادیت پیدا کر کے ہم کالج کے نوجوانوں کی صحیح تربیت اور رہنمائی کا فریضہ انجام دے سکتے ہیں اور انہیں فکری انتشار اور معاشرتی بے راہ روی سے محفوظ رکھ سکتے ہیں جو آج کا سنگین مسئلہ ہے۔

مارگریٹ اپنی تصنیف "From the South Seas" میں لکھتی ہیں "ٹیوٹوریل سسٹم سے وحشی سوسائٹی کو متمدن بنانے کا کام لیا جاسکتا ہے۔" میں اس بات سے مکمل اتفاق کرتا ہوں کہ ٹیوٹوریل سسٹم کے ذریعے کالج کے نوجوانوں کو اچھی اور مطمئن زندگی گزارنے کے لئے نئی اور صحیح راہ دکھائی جاسکتی ہے۔ تاہم ہمارے کالجوں میں اس سسٹم کو موثر اور مفید بنانے کی شرط یہ ہے کہ

کالج کے پرنسپل صاحبان ٹیوٹوریل سسٹم کی کڑی نگرانی کریں

ٹیوٹر صاحبان اس سسٹم کو باقاعدہ اور مفید بنانے کے لئے مخلصانہ کوشش کریں

طلبہ و طالبات کی حاضری کو یقینی بنایا جائے۔ باقاعدہ حاضری اور عملی شرکت کے لئے تحریص، ترغیب، تحریک، جزا و سزا کا ایک قابل عمل نظام وضع کیا جاوے۔

ہفتہ وار ٹیوٹوریل اجلاس کے بے تکلف، غیر رسمی اور اجازت دہ ماحول میں طلبہ و طالبات کو Brain Storming کے مواقع میسر ہوں اور اساتذہ اپنی شخصیت کے اثر سے ان کے خیالات اور کردار کو مثبت اور ایجابی اقدار سے ہم آہنگ کرنے کی بھرپور کوشش کریں۔

شیلڈن (Sheldon) نے اپنی تصنیف "Criminal Careers" میں ایک اہم سروے کے حاصلات درج کئے ہیں۔ اس تحقیق میں 509 مجرموں کا مطالعہ شامل تھا۔ اعداد و شمار سے پتہ چلا کہ 12 سال اور 18 سال کی عمر کے درمیان جرائم اپنی انتہا کو پہنچ جاتے ہیں۔ سروے کے مطابق 139 افراد 12 اور 14 سال کے درمیان مجرم بنے۔ 117 افراد 14 سال اور 16 سال کے درمیان اور 253 افراد 16 سال اور 18 سال کے درمیان جرائم میں ملوث ہوئے۔ گویا کالج پیریڈ (14 تا 18 سال) کے دوران میں 370 یعنی 73 فیصد لوگ جرائم کے مرتکب ہوئے۔ ہمارے ہاں بھی اس موضوع پر اگر تحقیق ہو تو نتائج اس سے زیادہ مختلف نہیں ہوں گے۔ سوال یہ کہ ہمارے کالجوں میں پڑھنے والوں میں معاشرتی بے راہ روی اور جرائم کی طرف رغبت کے Chances کیوں زیادہ ہوتے ہیں؟ آپ غور کریں تو اسباب کی ایک طویل فہرست مرتب کرسکتے ہیں لیکن میرے نزدیک سب سے بڑا Factor یا شاید اس خرابی کا واحد سبب یہ ہے کہ ہماری کالج ایجوکیشن نوجوانوں کو مستقبل میں کامیاب زندگی کی ضمانت دینے سے قاصر ہے۔ سوائے چند Top Class طلبہ و طالبات کے، کالج ایجوکیشن سینکڑوں ہزاروں نوجوانوں کو ان راستوں کا پتہ دیتی ہے جن کی کوئی منزل نہیں۔ ان جنگلوں میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیتی ہے جن میں پگڈنڈیاں تک نہیں۔ تعلیم مکمل کرلینے کے بعد معاش کی گارنٹی نہیں۔ معاشرتی مطابقت

کا امکان نہیں۔ نوجوانوں کی توانائیوں کی Sublimation کا کوئی وسیلہ نہیں۔ ان کے لئے اظہارِ ذات کا کوئی موقع نہیں۔ اس صورت حال میں پڑھے لکھے نوجوان بھٹک جائیں تو
کس کو مجرم سمجھے کوئی، کس کو دوش لگائے؟

آئیے ایک دوسرے پر الزام دھرنے کی مرغوب مہم کو ترک کر کے اس سنگین مسئلے کا قابل عمل حل تلاش کریں۔ میرے نزدیک اس مصیبت سے نجات پانے کا طریقہ یہ ہے کہ کالجوں کی عمارت کو اصول کفایت کے تحت Fully utilize کیا جائے۔ آپ سوچئے، کروڑوں اربوں کی لاگت سے تعمیر ہونے والی عمارت سے ہم کتنا فائدہ اٹھاتے ہیں؟ جن اداروں کے کمروں کو دن کے بارہ بجے بھاری تالے لگ جائیں۔ جن عمارتوں کی لائبریریوں اور لیبارٹریوں کے دروازے طلبہ و طالبات پر لنچ ٹائم سے پہلے بند ہو جائیں، ان سے کس قدر فیض حاصل کیا جا سکتا ہے؟ میری تجویز یہ ہے کہ کالج بند ہوتے ہی اس عمارت میں ایک نئی نوعیت کا ادارہ کھل جائے جس میں تدریس Activity Centred ہو۔ یہ ادارہ کالج ہی کے سربراہ کے زیر انصرام یا کم از کم زیر نگرانی رہے۔ اس کی سرگرمیوں کی تکمیل میں کالج میں موجود سہولتوں سے موقع اور ضرورت کے مطابق استفادہ ضرور کیا جائے لیکن کالج کی Setting کو درہم برہم نہ ہونے دیا جائے۔ اس ادارے میں انسانی اور مادی وسائل کے مطابق کمپیوٹر ایجوکیشن، آرٹ اینڈ کرافٹ ایسے تکنیکی اور پیشہ ورانہ مضامین پڑھائے جائیں۔ اس میں زندہ مشرقی اور مغربی زبانیں سکھانے کا اہتمام ہو۔ حکومت اس سلسلے میں مختلف اداروں کے موزوں اساتذہ سے علمی اور عملی اعانت طلب کرے۔ N.G.Os کو تحریک اور ترغیب دے یا Contract پر کسی مستند اور معتبر ادارے کو یہ کام سونپ دے۔ اس کی عملی صورت کچھ یوں نکلے، طلبہ و طالبات کو مفید علمی سرگرمیوں میں مصروف رکھنا اور انہیں سرٹیفکیٹ یا ڈپلومہ دلوانا مقصد اولیٰ ہونا چاہیے تاکہ نوجوانوں کی آنکھوں کے سامنے سے مستقبل کے بارے میں بے یقینی کی دھند ہٹ جائے۔ آنے والے کل کی تاریکی چھٹ جائے۔ وہ جس عملی تعلیم اور تربیت کے لئے کل ہزاروں روپے خرچ کرنے پر مجبور ہوں گے، اسے آج ہی حاصل کر لیں تاکہ فرد اور قوم دونوں کا مستقبل کم از کم گوارا حد تک ضرور محفوظ ہو جائے۔

"تعلیم و تہذیب" کے مصنف نے کالج ایجوکیشن کی اس کمزوری کو محسوس کرتے ہوئے بہت پہلے کہا تھا:

"تعلیم اور کاروباری دنیا کے درمیان جو لاتعلقی اس وقت پیدا ہو گئی ہے اس کا علاج کئے

بغیر تعلیم کا کوئی قومی منصوبہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ طالب علم دراصل علم اور معاش دونوں کا طلبگار ہوتا ہے۔ اس لئے ایسی تعلیم جو حصول معاش کا ذریعہ نہ بن سکے، طالب علم کو لامحالہ ناآسودہ اور غیر مطمئن چھوڑ جائے گی۔" (ص84)

اب تیسری اور آخری بات "College Educators" کے بارے میں۔

ایڈہاک ازم اگر دوسرے شعبوں کے لئے صرف مضر ہے تو تعلیم کے شعبے کے لئے مہلک ہے۔ لیکچررز کو عارضی بنیادوں پر رکھنا تعلیم و تعلم کے لئے غیر مفید ہے ہی، خود لیکچرر کے لئے بھی زیادہ منفعت بخش نہیں۔ وہ دل جمعی سے کام نہیں کر پاتا کہ ملازمت کے خاتمے کی تلوار، ہر دم اس کے رزق کے سر پر لٹکتی رہتی ہے۔ تجویز یہ ہے کہ حکومت آئندہ کسی طور بھی ایڈہاک لیکچررز کی بھرتی نہ کرے لیکن دوسری طرف پبلک سروس کمیشن کے کچھوے کو بھی ہمیشہ کہانی والا کچھوا نہ سمجھا جائے۔ پانچ سات سال بعد کئی کئی ہزار پوسٹوں کو یک دم Advertise کرنے کی بجائے ہر سال مطلوبہ پوسٹوں کو باقاعدگی سے مشتہر کیا جائے تاکہ پڑھے لکھے اہل لوگ طویل عرصے تک آس اور یاس کے درمیان معلق نہ رہیں۔ حقدار کو پورے وقت پر اس کا حق ملتا رہے۔ Meritorious لوگوں کو رزق کے حصول میں اعانت سے انصاف کے تقاضے بروقت پورے ہوتے رہیں اور لوگوں کو یہ کہنے کی ضرورت نہ پڑے

"Justice delayed, Justice denied"

اگلی بات ذرا تلخ ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں یہ روایت جڑ پکڑ چکی ہے کہ پبلک سروس کمیشن سے سرخرو لوٹنے والا انسان، پکی ملازمت کی فصیل کے اندر آجانے کے بعد، خود کو ہمیشہ کے لئے محفوظ و مامون سمجھنے لگتا ہے وہ علمی کام سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ صاحبِ کتاب بننا تو کجا، کتاب خواں بھی نہیں رہتا۔

اس سلسلے میں تجویز یہ ہے کہ پروموشن کے لئے تحقیقی کام، معیاری تصنیف و تالیف، ریفریشر کورسز میں شرکت، Further education کے حصول اور اچھے نتائج دکھانے کی شرائط لگا دی جائیں۔ ان شرائط کو واضح طور پر Define کیا جائے۔ پھر انہیں کالج اساتذہ کو Communicate کیا جائے اور وہاں انہیں Legal Cover بھی ضرور دیا جائے۔ اس طرح کالج اساتذہ اپنی Professional Growth کے لئے ہر دم کوشاں رہیں گے۔ سٹاف روم میں علمی مکالمہ سنائی دے گا اور کالج میں ایک تعلیمی کلچر نظر آئے گا۔

یوں اساتذہ کی شخصیت کا زنگ اترے گا اور اس کا اثر معلم کی تدریس، طلبہ و طالبات کی

آموزش اور تعلیمی ادارے کے وقار پر انتہائی مثبت پڑے گا۔ کمیشن سے Approved "بزعم خویش ہمہ دان" کالج اساتذہ کو نہج البلاغہ کا یہ قیمتی جملہ کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ
"جو شخص لاادری (میں نہیں جانتا) کہنا چھوڑ دے اس کی قتل گاہ اس تک پہنچتی ہے۔"

(یہ مضمون گورنمنٹ کالج ساہیوال میں 26 اگست 1998ء کو منعقد ہونے والے تعلیمی سیمینار کے لئے لکھا گیا)

منطق کے ایک پروفیسر سے کسی حلوائی نے پوچھا "یہ منطق کیسا علم ہے جو آپ پڑھاتے ہیں؟" پروفیسر نے کہا: "کسی روز بتائیں گے۔" ایک دن انہوں نے اس حلوائی سے آدھ سیر لڈو خریدے اور چند لمحوں بعد کہا "ان لڈوؤں کی جگہ برفی دے دیں۔" حلوائی نے آدھ سیر برفی دینے کے بعد پیسے مانگے۔ پروفیسر نے کہا: "پیسے کاہے کے؟" حلوائی نے جواب دیا: "برفی کے" ...... "برفی تو میں نے لڈوؤں کے عوض لی ہے۔" ...... "تو پھر لڈوؤں کے ہی پیسے دے دیں۔" ...... "واہ حضرت! لڈو تو میں نے واپس کر دیئے ہیں، پیسے کس بات کے؟" حلوائی ہکا بکا رہ گیا ...... "اور یہی منطق ہے" پروفیسر نے بڑی رازداری سے کہا۔

FUTURISM IN CURRICULUM

استقبالیت اور نصاب

پروفیسر حافظ صباحت حسن
استاد اللغتہ العربی والاسلامیہ

جب اکیسویں صدی کے بارے میں لوگوں کے خیالات سنتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کائنات کا رنگ یکسر بدل جائے گا۔ انسان فی الفور مشین بن جائے گا۔ زمین دفینے اگلنے لگے گی اور آسمان سے پلک جھپکنے میں حیرتیں اور بشارتیں اترنے لگیں گی۔ بیسویں صدی کی انتہا پر کھڑا ہر شخص یہ کہتا سنائی دے رہا ہے۔

دیکھئے اس بحر کی تہہ سے اچھلتا ہے کیا
گنبد نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

حالانکہ نئی صدیاں اس سے پہلے بھی آئی ہیں اور اس کے بعد بھی آئیں گی۔ استقبالیت ہمیشہ موجود رہی ہے۔ صورتحال ارتقاء کی ہوگی انقلاب کی نہیں یہ درست ہے کہ سائنسی ترقی کی رفتار قدرے تیز ہوگی یا شاید بہت تیز ہوگی لیکن کوئی بڑا دھماکہ اچانک نہیں ہوگا۔ تعلیم، ذرائع ابلاغ، ثقافتی ہئیت، طرز معاشرت میں تبدیلیاں ضرور آئیں گی لیکن کایا کلپ والی بات کبھی نہیں ہوگی۔ اکیسویں صدی بوتل سے نکلا ہوا "جن" نہیں ہوگا جو چند لمحوں میں سب کچھ بدل دے گا۔ اس صدی کو اپنے وجود کی معنویت ثابت کرنے کے لئے ماضی سے روشنی لینا ہوگی اور یہ بات تعلیم اور نصاب تعلیم کے لئے تو اور بھی ضروری ہوگی۔

اکیسویں صدی کا نصاب بیس صدیوں کے علمی سرمایہ سے ضرور خوشہ چینی کرے گا۔ امید ہے وہ فرد کے فطری تقاضوں اور صلاحیتوں کے مطابق مرتب کیا جائے گا۔ نصاب میں حقیقت کا پر تو ہوگا۔ اور وہ سیرت سازی و تشکیل کردار کا راستہ دکھائے گا۔ نصاب تعلیم کے جسد میں مذہبی روح ہوگی اور نصابی مواد فرد اور سماج، دنیا اور آخرت میں توازن پیدا کرنے والا ہوگا۔ وہ ایسا نصاب ہوگا جو اسلامی نظریہ حیات کی تفہیم اور ہر قسم کے تعصب سے بالاتر ہو کر عالم گیر اخلاق اور

معاشرت کا درس دے گا۔ اور مذہب و سائنس کے حسین امتزاج سے بہتر تعلیم اور بہترین علم کی تخلیق کرے گا۔

اکیسویں صدی کے تصور نے چھوٹی بڑی قوموں کو غیر معمولی طور پر کچھ زیادہ ہی متاثر کیا ہے۔ ایک مدت سے اس کے استقبال کی تیاریاں کی جارہی ہیں۔ کم از کم امریکہ میں 70-1960 کے عشرے سے منظم اور مربوط انداز میں مستقبل کی ہمہ جہت منصوبہ بندی تحقیقی بنیادوں پر کی جارہی ہے۔ محققین 30، 50 بلکہ سو سال سے بھی آگے جھانکنے میں لگے ہوئے ہیں کیا صورت پیش آنے والی ہے؟ اس کے لئے کن ضروری اقدامات کی ضرورت ہے۔ آنے والے خطرے سے کیسے عہدہ برا ہو سکتے ہیں۔ دراصل ترقی یافتہ قومیں اپنی موجودہ پوزیشن نہ صرف قائم رکھنا چاہتی ہیں بلکہ اسے زیادہ مستحکم کرنے اور اس کی توسیع کی شدید آرزومند دکھائی دیتی ہیں۔ بہرحال قوموں کی آنکھیں اب زیادہ تر مستقبل پر لگی رہتی ہیں۔

مستقبل محض Time Dimension نہیں اور نہ ہی حال کی مزید توسیع کا دوسرا نام اور نہ ہی ایسا منہ زور گھوڑا ہے جسے لگام نہ دی جاسکے یہ کہنا غلط ہے کہ مستقبل کا ماضی اور حال سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ اپنی ذات میں خود مکمل اور مکتفی نہیں ہے بلکہ ماضی، حال اور مستقبل باہم مربوط ہیں۔

گذشتہ بیس تیس برس سے تعلیمی مستقبل پر زور شور سے تحقیقات جاری ہیں Toffler (1974ء)، Shan (1973ء)، Weiner (1967ء)، Kahn (1976ء) اور دیگر کئی ممتاز محققین تعلیمی منصوبہ بندی میں لگے ہوئے ہیں۔ Toffler کا کہنا ہے "مستقبل پہلے سے طے شدہ نہیں کہ ہمارے گلے میں زبردستی ڈال دیا جائے، اس کے انتخاب میں ہم آزاد اور خود مختار ہیں" دراصل زندگی اس قدر تیز ہو چکی ہے، علوم و فنون میں اتنی تیزی سے تبدیلیاں آرہی ہیں۔ علم کے اہرام اس قدر بلند ہو گئے ہیں کہ صدیوں کا فاصلہ اب دہائیوں میں طے ہونے لگا ہے۔ ہمارا پاکستانی معاشرہ بھی عظیم تغیرات کی زد میں ہے۔ کئی قسم کے معاشی، معاشرتی، سیاسی اور تعلیمی بحرانوں سے دوچار ہے (جس کی تفصیل آگے آرہی ہے)۔

مستقبل نواز حضرات (Futurists) بار بار یقین دلاتے ہیں کہ مستقبل کو نظم و ضبط میں لایا جاسکتا ہے۔ اور اس کی ترمیم و تنسیخ بھی ممکن ہے بلکہ وہ تو امید دلاتے ہیں کہ ہم ضروری اقدامات کر کے اپنی پسند کا مستقبل Develop کر کے اس کی فیوض و برکات سے اپنی جھولیاں بھر سکتے ہیں۔ دراصل مستقبل ایک کھلا امکان (Open Possibility) بلکہ کئی امکانات کا

تصوراتی گچھا ہے۔ یہ کوئی بند گلی نہیں بلکہ ایک ایسی پر نور شاہراہ ہے جس سے کئی راستے دائیں بائیں پھوٹتے ہیں۔ پھر ایک ہی قسم کا مستقبل ہم پر مسلط نہیں کیا گیا۔ اس کی کئی اقسام ہیں۔ امکانی مستقبل، اغلبی مستقبل، متبادل مستقبل اور ترجیحی مستقبل۔ اسی طرح مستقبل کے کئی میدان ہیں مثلاً بائیو فیوچر، سوشیو فیوچر، ٹیکنو فیوچر اور ایجوکیشنل فیوچر اور ان سب ایریاز (Areas) میں مستقبل بینی کا عمل جاری ہے۔

اکیسویں صدی میں نصاب تعلیم کیسا ہوگا اور کیسا ہونا چاہیے یہ آج کے فیوچرسٹ (Futurist) کا مسئلہ ہے۔ اگر مستقبل بینی کا عمل درست ہوا تو نظام تعلیم اور نظام حیات دونوں کو فائدہ ہوگا۔ اور اگر ضرورت سے زیادہ کوتاہ بینی یا تصور پرستی سے کام لیا گیا تو فرد اور سماج دونوں بے سمت ہو جائیں گے۔ یہیں ایک ایسے نظریہ حیات کی ضرورت کا احساس ہوتا ہے جو Futurists کو ادھر اُدھر بھٹکنے سے بچا لے۔ ہمارا ایمان ہے اسلامی نظریہ حیات اس سلسلے میں بہترین معاون اور رہبر ثابت ہو سکتا ہے۔ اگر حرکت اور ترقی کے اسلامی اصول یعنی اجتہاد کے ذریعے فکر کی تعمیر نو کا سلسلہ جاری رہا تو پاکستانی تعلیم ثبات اور تغیر دونوں خصوصیات کی مالک ہوگی اور پاکستانی نصاب مستقبل کا ساتھ دینے کے قابل ہو جائے گا۔ حضرت علیؓ کا قول ہے "اپنی اولاد کو اپنے عہد کی تعلیم دو کیونکہ انہوں نے تمہارے عہد میں نہیں رہنا" یہ قول اس بات کی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ تعلیم کو آنے والے دور کے تقاضوں کے مطابق ہونا چاہیے۔

نصاب سازی میں پاکستان کی امکانی صورتحال

پاکستان میں نصاب کے ارتقاء اور ترقی کے لئے ہر تعلیمی پالیسی میں بلند بانگ دعوے کئے گئے۔ بے شمار سیمینارز، کانفرنسز اور کمیٹیوں کے اجلاس میں نصاب سازی کے عمل کو جدید بنانے کے لئے نت نئی سفارشات پیش کی جاتی رہیں۔ لیکن عملی طور پر اس کے کوئی خاطر خواہ نتائج برآمد نہ ہوئے۔ ہم آج کل پاکستان کی گولڈن جوبلی منا رہے ہیں لیکن ابھی تک یہ طے نہیں ہو سکا کہ ہمارا ذریعہ تعلیم کیا ہونا چاہیے۔ ہمارے ہاں بیک وقت تین Mediums of Instructions چل رہے ہیں۔ انگلش میڈیم، سیمی اردو میڈیم اور اردو میڈیم۔ اس طرح ملک میں طبقاتی تقسیم کو فروغ ہوا۔ انگریزی سکولوں میں پڑھنے والے طلباء اپنے آپ کو سرکاری سکولوں کے ٹاٹ پر بیٹھنے والے طلباء سے نہایت اعلیٰ اور ارفع سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ تسلیم شدہ امر ہے کہ کوئی ملک اپنی مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنائے بغیر ترقی نہیں کر سکتا۔ چنانچہ ضروری ہے

کہ تمام ملک میں ایک جیسا نظام تعلیم ہو اور تعلیم کے حصول کے مواقع سب کے لئے یکساں ہوں۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ مستقبل میں نصاب سازی کے ہمارے مقاصد اور دائرہ کار کیا ہونا چاہیے۔

مقاصد نصاب

تعلیم کے مقاصد کا تعین کئے بغیر اس کے ثمرات کا حصول ناممکن ہے۔ تعلیم و تدریس ایک سنجیدہ عمل ہے جس کا تعلق افراد اور قوم کی بقاء سے ہے اگر تعلیم کے مقاصد کا تعین ہی نہ کیاجائے تو انفرادی اور اجتماعی زندگی کی عمارت زمین بوس ہو جائے گی۔ ڈاکٹر وقار رضوی لکھتے ہیں "مقصد کا تعین نہ ہونے کی صورت میں ایک بے یقینی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور منتشر راستے جس جانب بھی لے جائیں طلباء، اساتذہ اور والدین اسی جانب چلتے رہتے ہیں۔ اس سے وقت، دولت اور عمر سب کا زیاں ہوتا ہے"۔

جان ڈیوی اور اس کے ہم نوا سارا زور اس بات پر صرف کرتے رہے کہ تعلیم کا کوئی مقصد متعین نہیں ہونا چاہیے۔ اور کسی مقررہ نصاب کی ضرورت نہیں۔ معاشرتی حالات تعلیمی مقاصد کو خود بخود طے کر دیتے ہیں اور نصاب ضرورت کے مطابق بنتا بگڑتا رہتا ہے۔ اس آزاد اور بے سہارا نظریے نے امریکہ میں تعلیم کو بے سمت اور بے مقصد بنا دیا۔ اس پر خود امریکیوں نے بھی تنقید کی۔ راک فیلر کا کہنا ہے "طلباء اپنی زندگی کا کوئی مقصد و مفہوم چاہتے ہیں اگر ان کا زمانہ ان کی ثقافت اور ان کے رہنما انہیں کوئی عظیم مفہوم، مقاصد اور تصورات نہ دیں تو پھر وہ اپنے لئے حقیر اور فرومایہ مقاصد متعین کر لیتے ہیں۔" ڈاکٹر فرینک کہتے ہیں "مقاصد کی بجائے تکنیک اور ذرائع سے وابستگی ادب، فلسفہ، تاریخ اور مذہب کے مطالعے کو حقیقی آزادی سے محروم کر رہی ہے"۔

اسلام تعلیم کو روحانی ورثے اور مذہبی اور قومی روایات سے ہم آہنگ دیکھنا چاہتا ہے۔ اسلام بے عقیدہ تعلیم کا سختی سے مخالف ہے کیونکہ ایسی تعلیم کے نتائج فرد اور معاشرہ دونوں کے لئے نقصان دہ ہیں۔ بے عقیدہ تعلیم طلباء کے اندر اجتماعی تصورات اور اخلاقی اقدار کا صحیح عرفان کبھی بھی پیدا نہیں کر سکتی۔ اسلام نے بطور نصاب زندگی وہ عظیم کتاب عطا کی جو سرچشمہ رشد و ہدایات ہے۔ جس کے بارے میں خود قرآن میں کہا گیا۔

"ہم نے آپ پر کتاب نازل کی جو ہر شے کا تفصیلی بیان کرنے والی ہے جو مسلمانوں کے لئے ہدایت، رحمت اور خوشخبری ہے۔"

یہ نصاب ایسا ہے جو انسان کی پیدائش سے لے کر اس کی موت تک رہنمائی کرتا ہے۔

اس لئے نبی کریم ﷺ نے فرمایا "اطلبو العلم من المهد الی اللحد" اس نصاب کی تعلیم کے لئے حضور اکرم ﷺ نے اپنے بارے میں فرمایا "انما بعثت معلماً"۔ حضرت علیؓ کا مقولہ ہے "ہر برتن بھر جاتا ہے ماسوائے علم کے"

قرآن پاک وہ نصاب تعلیم ہے جو کسی خاص زبان، کسی خاص علاقے یا کسی خاص نسل کی راہنمائی کے لئے نہیں آیا بلکہ قرآن پاک کی تعلیم عالمگیر، ہمہ جہت اور آنے والے ہر دور یعنی غیر محدود مستقبل کے لئے مشعل راہ ہے۔ اس کی بنیادی تعلیمات اور بنیادی مسائل نئے آنے والے مسائل کے لئے رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔

مستقبل کے نصاب میں تبدیلی کرتے وقت ایک پہلو اور بھی مد نظر رکھنا ہوگا کہ ٹیکنالوجی اور سائنس میں ترقی کے ساتھ ساتھ مادیت، بد اخلاقی اور لادینیت کو بھی فروغ حاصل ہوا ہے۔ مشین نے انسان سے مروت اور کردار کی بلندی کو نہ صرف چھین لیا ہے بلکہ خود انسان کو بھی مشین بنا دیا ہے۔

بقول علامہ اقبال:

احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

اس سائنسی ترقی کو جو اخلاق سوزی اور بے مروتی کا مغلوبہ ہے آج مغربی دانشور بھی ناپسند کرنے لگے ہیں۔ وہ اس بات کے حق میں ہیں کہ ہم اس ترقی کو جس نے انسانیت کو پلوشن، ایٹمی جنگ، کیمیاوی مہلک ہتھیار، منشیات کی نت نئی اقسام، کلوننگ، بے کار خلائی دوڑ اور اس ترقی کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی مہلک بیماریاں مثلاً کینسر اور ایڈز وغیرہ تحفتاً دی ہیں، یہیں پر روک دیں اور پھر قدرتی زندگی کی طرف لوٹ جائیں جہاں یہ قباحتیں نہ تھیں۔ لیکن یہ نظریہ اتنا آسان نہیں کہ اس کو اپنا لیا جائے۔

البتہ ہمیں انتخاب کرنا ہوگا کہ کونسی سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی ہمارے لئے مفید اور کون سی سائنسی ترقی ہمارے اخلاق و کردار، مذہبی تعلیمات اور قومی مزاج کے خلاف ہے ہمیں اس مقصد کے حصول کے لئے عقلی و نقلی علوم کو ہم آہنگ کرنے کے بعد ایک وحدانی نظام تعلیم بنانا ہوگا۔ جسے ہم فخر سے "پاکستانی نظام تعلیم" کہہ سکیں۔

مستقبل اور نصاب کا تعلق

وہ ملک ہرگز ترقی نہیں کرسکتا جو مستقبل میں تعلیم کے بارے میں اقدامات نہ کرے۔

صنعتی ترقی ہو، زرعی ترقی ہو، تجارتی بازار ہو تمام دائروں میں ترقی محض تعلیم کی مناسب اور ضروری منصوبہ بندی کے ذریعہ ہوتی ہے۔ اگر ہم مستقبل کی تعلیم میں جھانک کر نہیں دیکھیں گے تو پھر ہم دنیا میں پسماندگی، جہالت اور ناخواندگی کی گود میں گر جائیں گے۔
جیسا کہ "The Future of Education" میں تحریر ہے۔

"Education perhaps more than most human activities, has a close and necessary relationship with the future, through education, the individual prepares, or is prepared for the future and society uses education as a principal, means to maintain or to transform essential values, sturctures and relationships, in fact to prepare itself for the future. P(5)"

جب تعلیم کی منصوبہ بندی کی جائے گی تو لازماً اس کا نصاب بنانا ہوگا اور اس طرح نصاب اور مستقبل کا بھی ایک دوسرے پر دارومدار ہوگا کیونکہ نصاب تو عموماً بنایا ہی جاتا ہے مستقبل کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے چنانچہ ہمیں اس مقالہ میں یہی دیکھنا ہے کہ وہ کیا تقاضے یا عوامل ہیں جن کو پیش نظر رکھ کر مستقبل کا نصاب بنایا جانا چاہیے۔

مستقبل کے نصاب میں تبدیلیوں کے عوامل

درج ذیل عوامل عام طور پر تبدیلی کی وجہ بن سکتے ہیں۔ ان عوامل کے پیش نظر نصاب ساز ادارے مستقبل میں اپنے نصاب میں تبدیلیاں کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

1۔ ثقافتی تبدیلیاں

انسان نے جب سے اس دنیا میں آنکھ کھولی ہے اس نے کائنات کو ہمیشہ تغیر پذیر دیکھا ہے۔ وقت کے ساتھ رونما ہونے والی ثقافتی تبدیلیاں انسان کو اس بات پر آمادہ کرتی ہیں کہ وہ بھی وقت اور ماحول کے ساتھ بدل جائے۔ اگر وہ وقت کے تقاضوں کی صدا پر لبیک نہیں کہتا تو اس پر جمود کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ وہ ترقی نہیں کر سکتا۔ جیسے قرآن مجید میں ارشاد ہے۔
"بے شک اللہ تعالیٰ اس قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ اپنے آپ کو نہ بدل لے"
چنانچہ وہی قومیں ترقی کی منازل طے کرتی ہیں جو ان ثقافتی تبدیلیوں کو خوش آمدید کہتے ہوئے اپنے نصابات کو بھی ان تبدیلیوں سے ہم آہنگ کر سکیں۔

2۔ معاشرتی مسائل میں اضافہ

دنیا کی تیز رفتاری، عدم ہم آہنگی اور انفرادیت کی چاہت سے بے شمار معاشرتی مسائل جنم لے رہے ہیں۔ قدیم معاشرہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے اور ایک نیا جدید معاشرہ جنم لے رہا ہے۔ جس کی وجہ سے آئے دن معاشرتی اقدار میں تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ الجھنیں پیدا ہو رہی ہیں۔ اور اس معاشرتی بگاڑ کی وجہ سے جرائم میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ان تبدیلیوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہمیں مستقبل کے نصاب میں ان کے حل اور طریقہ کار کو ملحوظ رکھنا ہو گا۔

3۔ ٹیکنالوجی کی ترقی

آج کی دنیا ٹیکنالوجی کی دنیا ہے۔ وہی قوم کامیاب ہے جو ٹیکنالوجی میں جدت اختیار کرتی ہے اور جدید ٹیکنالوجی کو کام میں لاتی ہے۔ یہ ایک بدیہی امر ہے کہ ایک ایجاد دوسری ایجاد کو لانے کا باعث بنتی ہے۔ علم کی دنیا میں بھی بے شمار نئی ایجادات وجود میں آ رہی ہیں جن کو نصاب میں شامل کرنا ضروری ہے۔ مثلاً اوور ہیڈ پروجیکٹر، اوپیک پراجیکٹر، سلائیڈ اینڈ ساؤنڈ پراجیکٹر، ٹی وی، وی سی آر، ڈش، اور خاص طور پر کمپیوٹر کا استعمال نصاب کے اعتبار سے نہایت اہم ایجاد ہے اور مستقبل کی تعلیم کا دارومدار اب کمپیوٹر اور انٹر نیٹ کا مرہون منت ہو گا۔

4۔ سیاسی دباؤ

ملک میں سیاسی عدم استحکام کی وجہ سے آئے دن نت نئے مسائل جنم لے رہے ہیں اور زندگی کے باقی شعبہ جات کے ساتھ تعلیم و تربیت کا شعبہ بھی اسی کے باعث انحطاط پذیر ہے۔ سیاسی حکومتوں کی تبدیلی سے تعلیمی پالیسیاں بدلتی رہتی ہیں۔ چنانچہ ان تبدیلیوں کو بھی نصاب کا حصہ بنانا ہوتا ہے۔ مثلاً دسمبر 1971ء کی جنگ میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی نصاب میں ایک بڑی تبدیلی کا باعث بنی۔ اس کے علاوہ سیاسی اکھاڑ پچھاڑ یا گروہی، لسانی اور دیگر فرقہ وارانہ فسادات وغیرہ بھی نصاب میں مطلوبہ تبدیلی کی وجہ بنتے ہیں۔

5۔ شرح خواندگی میں کمی

پاکستان آبادی کے لحاظ سے اس وقت دنیا کا نواں بڑا ملک ہے۔ سنٹرل بیورو آف ایجوکیشن اسلام آباد کے ایک سروے کے مطابق 1996ء میں اس کی آبادی چودہ کروڑ کے قریب پہنچ چکی ہے اور کہا جاتا ہے کہ 2000ء تک آبادی کی تعداد 15 کروڑ تک پہنچ جائے گی۔ جبکہ شرح خواندگی کی رفتار اس وقت 26.21 ہے اور پاکستان خواندگی کی شرح کے لحاظ سے دنیا

میں 139 ویں نمبر پر ہے۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ کوئی ملک تعلیم کے بغیر ترقی کی منازل طے نہیں کر سکتا۔ لہذا ہمیں پرائمری تعلیم کو مفت، لازمی اور ہمہ گیر بنانا ہوگا اور اس کے طریقہ کار کو نصاب میں طے کرنا ہوگا۔

6۔ معاشی عوامل

معاش زندگی کا اہم جزو ہے وہ معاشرے جو معاشی طور پر خود کفیل ہیں امن اور آشتی کا گھوارہ ہیں۔ اگر پاکستان کی تاریخ کو دیکھیں تو سیاسی اکھاڑپچھاڑ، غیر ملکی مداخلت، کشمیر کا مسئلہ ان سب چیزوں نے اس کی معیشت کو آج تک سنبھلنے کا موقع نہیں دیا نتیجتاً آج ہمارا ملک معاشی طور پر شدید بحرانی کیفیت سے دوچار ہے۔ بے روزگاری، بھوک، غربت و افلاس نے بے شمار مسائل کو جنم دیا۔ ناخواندہ اور غریب والدین تعلیم کو بے کار شغل سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے بچوں کو سکول بھیجنے کی بجائے ورکشاپوں، درزیوں اور دیگر کاموں میں ڈال دیتے ہیں تاکہ وہ روزی کمائیں اور خاندان کے لئے معاشی آسودگی کا باعث بنیں۔ ان مسائل کو حل کرنے کے لئے ہمیں نصاب میں انقلابی تبدیلیاں لانی ہوں گی۔ نصاب میں ایسے مضامین اور سرگرمیوں کا اہتمام کیا جائے جو طالب علم کو علم کے ساتھ ساتھ روزگار کے حصول میں معاون ہو۔

7۔ علوم کی شاخ در شاخ تقسیم

اب علوم کی تعداد محدود نہیں۔ علم بے شمار شاخوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ اور مزید اس کی تقسیم کا قوی امکان ہے۔ سمتھ سٹینلے اور شورز کے مطابق 1930ء میں مضامین کی تعداد تقریباً 300 تھی جو بڑھ کر 1500 سے بھی زائد ہو چکی ہے اور یہ عمل مسلسل جاری ہے۔ چنانچہ نصاب میں اس تقسیم کو بھی مدنظر رکھنا پڑتا ہے۔

8۔ بین الاقوامی تضاد

بین الاقوامی ایجنسیوں کے رویوں کا تضاد بھی نصاب میں تبدیلی کا بہت بڑا سبب بنتا ہے۔ مثلاً پریسلر ترمیم کے تحت پاکستان کو ایف 16 طیارے قیمت ادا کرنے کے باوجود نہ دیئے گئے جبکہ بھارت کی فوجی طاقت کو مزید مستحکم کیا جارہا ہے۔ یورپ میں معمولی انسانی حقوق کی خلاف ورزی پر پورا ماس میڈیا حرکت میں آجاتا ہے جبکہ کشمیر، فلسطین، بوسنیا اور کوسووو میں انسانی حقوق کی بڑی خلاف ورزی ماس میڈیا اور بڑی طاقتوں کو نظر نہیں آتی۔ ہمیں نصاب میں ان باتوں کا بھی تجزیہ کرنا ہوگا۔

9۔ تعلیم میں بیرونی مداخلت

آئی ایم ایف، ورلڈ بینک اور ایشین ڈویلپمنٹ بینک جیسے مالیاتی ادارے قوم کو قرضوں کے پھندے میں پھنسانے کے ساتھ ساتھ وطن عزیز میں نظریاتی محاذ پر بھی برسرپیکار ہیں۔ یہ ادارے ملک میں انگریزی زبان کے فروغ کے لئے بہت چھوٹے پیمانے پر قرض فراہم کرتے ہیں جن کا بڑا حصہ ان کے مشیران واپس لے جانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور اس کے بدلے میں یہ ماہرین ہمارے نصابات اور نظام تعلیم میں مداخلت کر رہے ہیں۔ خاص طور پر درج ذیل مضامین کی تعلیم ختم کرانا یا ان میں اپنی مرضی کی تبدیلیاں لانا ان کا مطمح نظر ہے۔

1۔ اردو زبان و ادب

2۔ اسلامیات

3۔ مطالعہ پاکستان

4۔ تاریخ اسلام

ان اداروں نے اپنے گماشتوں کے ذریعے یہ تجویز دی ہے کہ ان مضامین کو پہلی سے لے کر اعلیٰ جماعتوں تک پڑھانے کا کوئی فائدہ نہیں اس سے وقت ضائع ہوتا ہے جیسا کہ لورٹوپہ میں حال ہی میں منعقد ہونے والی انٹر بورڈ چیئرمین کمیٹی نے Testing System کی آڑ میں ان تعلیمی نصابات کی مخالفت کی ہے۔ ان کا پہلا اعتراض یہ ہے کہ نصابات کی تیاری اور امتحان کا انعقاد تعلیمی بورڈ کی ذمہ داری ہے یہ کام مکمل طور پر ان کے حوالے کیا جائے اور ان کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ نصابات کی تیاری میں ہر قسم کی تبدیلی وقت کی ضرورت کے مطابق کی جائے اور اس کے لئے غیر ملکی ماہرین سے آراء لی جائیں۔

10۔ ابلاغ عامہ

ذرائع ابلاغ عامہ نے جس تیزی سے ترقی کی ہے وہ اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ہمارے نصاب میں ان ذرائع کو مناسب مقام دیا جائے۔ ایجوکیشن ٹی وی پروگرامز کو نصاب سے ہم آہنگ کیا جائے اور اگر ممکن ہو تو علیحدہ تعلیمی چینل کا اہتمام کیا جائے۔

11۔ مروجہ نصاب کی خامیوں کا علم

مروجہ نصاب میں جو خامیاں منظر عام پر آتی ہیں ان کو بھی جدید نصاب میں دور کرنا ہوگا۔

12۔ مقامی ضروریات سے عدم مطابقت

نصاب کی تدوین بعض اوقات قومی معیار پر تو پورا اترتی ہے لیکن اس میں مقامی سطح کو قطعاً نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ جس سے بے شمار الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ مقامی ضروریات کے پس منظر کو نصاب میں شامل کیا جانا ضروری ہے مثلاً نصاب میں دیہاتی علاقے کے لئے زراعت کو اہمیت دی جائے اور شہری علاقوں میں فنی تعلیم پر زور دیا جائے۔

13۔ نفسیاتی عوامل

اگر کوئی تعلیمی گروہ، کوئی نصاب ساز ادارہ بچے کی نفسیات سے آنکھیں چرا کر کسی بڑے تعلیمی مقصد اور کسی اونچے سماجی آدرش کی تکمیل کا سوچتا ہے تو وہ اکیسویں صدی میں نہیں بلکہ پتھر کے زمانے میں رہے گا۔ نصاب سازی میں تعلیم کے چار نفسیاتی معیارات کو شامل کرنا ضرور ہے جو کہ درج ذیل ہیں۔

1۔ سیکھنے کی صلاحیت کا معیار
2۔ دلچسپی کا معیار
3۔ معنی خیزی کا معیار
4۔ جواز و استثنا کا معیار

14۔ تحقیق پر مبنی علمی اضافہ

علم کی دنیا میں جدید تحقیقات کے مطابق نت نئی تبدیلیاں وجود میں آتی رہتی ہیں۔ مستقبل کے نصاب میں یہ گنجائش رکھنا ضروری ہے کہ آئندہ تحقیقات کے مطابق جو نتائج مرتب ہوں وہ نصاب کا خود بخود حصہ بن سکیں مثلاً خلائی سائنس نے جو ترقی کی ہے اور کر رہی ہے اس کو نصاب میں اہم مقام دینا چاہیے۔

15۔ والدین

والدین بھی نصاب کو متاثر کرنے والے عوامل میں سے ایک ہیں۔ سکول کے اندر سکول سے باہر تعلیمی سرگرمیاں جاری رکھنے کے لئے استاد کو والدین کی معاونت ضروری ہے۔ والدین کو اس بات کی نگرانی بھی کرنا ہے کہ ان کے بچوں کو جو تعلیم دی جا رہی ہے وہ ان کے عقائد، رسم و رواج سے متصادم تو نہیں۔ اگر وہ اس بات پر احتجاج کرتے ہیں تو ان کا احتجاج بھی نصاب میں تبدیلی کا باعث بنتا ہے۔

نصاب میں تبدیلیاں لانے کی مشکلات

1۔ سرمایہ: ترقی پذیر ممالک میں سرمایہ کی کمی ہمیشہ نصاب پر عملدر آمد کرنے میں اکثر آڑے آتی ہے اور اس طرح ایک بے حد عمدہ نصاب بھی ناکام ہو جاتا ہے۔

2۔ ذہین افراد: نصاب میں تبدیلی کے لئے نصاب ساز اداروں کے ارا کین کا ذہین، تجربہ کار اور قابل ہونا شرط ہے مگر بعض اشاعتی کاروباری ادارے جو سیاسی طور پر مضبوط ہوتے ہیں اول تو نصاب میں تبدیلی نہیں ہونے دیتے تاکہ ان کی کتابیں بکتی رہیں۔ دوسرے اگر تبدیلی ضروری بھی ہو جائے تو پھر وہ کوشش کرتے ہیں کہ ان اداروں میں ان کے نمائندے پہنچ جائیں تاکہ ان کا مطلوبہ مواد بھی نصاب میں شامل کیا جائے۔

3۔ اساتذہ کی عدم شرکت: نصاب میں تبدیلی کے لئے طریقے تدریس میں تبدیلی لازمی ہے۔ ہمارے اکثر اساتذہ روایتی طریقہ سے پڑھانے کے عادی ہیں وہ نئے تدریسی طریقوں سے نابلد ہوتے ہیں چنانچہ وہ نصاب کی تبدیلی کو قبول نہیں کرتے۔

4۔ جدید ساز و سامان کی قلت: جدید طریقہ ہائے تدریس کے لئے جدید ساز و سامان کی ضرورت ہوتی ہے جو کہ ہمارے اکثر سکولوں کو میسر نہیں۔ بچوں کے بیٹھنے کے لئے ٹاٹ تک نہیں تو یہ سامان کہاں سے آئے گا۔ چنانچہ ساز و سامان کی قلت اور نایابی نصاب کی ترقی میں رکاوٹ ہے۔

5۔ حاوی یا پریشر گروپ: نصاب ساز ادارے عام طور پر تدوین نصاب کے سلسلہ میں آزاد نہیں ہوتے ان پر کوئی حاوی یا پریشر گروپ اثر انداز ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ ان کی مرضی کے خلاف کوئی مثبت تبدیلی نہیں کر سکتے۔

6۔ اساتذہ کی قابلیت: اساتذہ کی ذاتی قابلیت بھی نصاب کی ترقی میں رکاوٹ ہے۔ پرائمری سکول میں میٹرک پاس اساتذہ طلباء کو تعلیم دیتے ہیں اور ان میں سے اکثر .P.T.C نہیں ہوتے۔

7۔ جائزہ کا روایتی طریقہ: ہمارا امتحانی انتظام انتہائی ناقص ہے اگر نصاب جدید ہو تو اس روایتی طریقہ امتحان سے نصاب کی کامیابی یا ناکامی کا صحیح جائزہ نہیں لیا جا سکتا۔

8۔ احتساب: ترقی یافتہ ممالک میں نصاب میں جو بھی تبدیلی کی جاتی ہے وہ ایک مقررہ عرصہ کے لئے ہوتی ہے۔

اس میں اس عرصہ کے دوران قطعاً کوئی تبدیلی نہیں کی جاتی۔ عرصہ مکمل ہونے کے بعد

اساتذہ، طلبہ، والدین اور صاحب دانش حضرات سے اس کے بارے میں رائے طلب کی جاتی ہے اور پھر اجتماعی رائے پر عمل کیا جاتا ہے۔ جبکہ ہمارے یہاں کوئی نہیں پوچھتا۔ کوئی تبدیلی ہوتی ہے تو چند دنوں بعد اس کے خاتمہ کی اطلاع مل جاتی ہے۔ کیوں ختم ہوئی؟ کیا وجوہات تھیں؟ کوئی نہیں جانتا۔

مستقبل کے نصاب کا خاکہ

1۔ نصابی اداروں اور نصاب کی تنظیم نو:

ہمارے قومی اور صوبائی نصابی اداروں کے رول اور فنکشن آپس میں گڈمڈ ہیں اس ابہام کو اب ختم ہونا چاہیے۔ پرائمری اور ثانوی سکولوں کے مضامین کا باہمی تعلق قائم کر کے مربوط کوششوں کے ذریعے ان کی تعداد اور حجم کم کیا جائے تاکہ تدریس بامعنی ہو۔ بعض جدید مضامین کو شامل نصاب کیا جائے۔ اعادہ اور تکرار کی بجائے جدت، تازگی اور معنویت کو بطور اصول اپنایا جائے۔ لڑنے کی بجائے تفہیم اور عملی استعمال Application پر زور دیا جائے۔ زندگی کے مختلف شعبوں زراعت، انڈسٹری، بزنس اور کامرس وغیرہ سے نصاب کو ہم آہنگ کیا جائے۔ زبانوں کی تعلیم کے سلسلہ میں Language Laboratories قائم کی جائیں۔

2۔ یکساں نصاب کا نفاذ:

پرائمری اور ثانوی سطح پر یکساں نصاب قوم کی دیرینہ آرزو اور وقت کی پکار ہے۔ مساوات، معاشرتی انصاف اور قومی ہم آہنگی کی باتیں یکساں نظام تعلیم اور جدید نصاب تعلیم کے بغیر بالکل بے معنی ہیں بلکہ یہ قومی مقاصد اور قومی فلسفہ حیات سے متصادم ہیں۔

3۔ اقتصادی پہلو:

مفید پیداواری مہارتوں (Marketable Productive Skills) کا شمول نصاب میں لازمی ہونا چاہیے حتیٰ کہ ایلیمنٹری کی منزل پر بھی بچوں کو ایسے مفید ہنر سکھا دیئے جائیں جو ان کی مالی ضروریات پوری کرنے میں معاون ثابت ہوں۔ ثانوی منزل پر بقول ہربیسن اور مائرز (Harbison & Myers) طلباء وطالبات کے لئے درمیانے درجے کی مہارتیں نصاب کا اہم حصہ ہونی چاہئیں تاکہ ملکی معیشت کو بنیاد فراہم ہو۔ اس سلسلہ میں جاپان اور کوریا ہمارے لئے ورکنگ ماڈل کا کام دے سکتے ہیں۔

5۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کا فروغ:

ترقی یافتہ دنیا سائنسی خواندگی (Scientific Literacy) میں مصروف عمل ہے اور ہم ابھی عام خواندگی کے اضافے کے مسئلے میں الجھے ہوئے ہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی ہماری اولین ترجیحات میں شامل ہونی چاہئیں۔ ان علوم و فنون کو زیادہ بامقصد اور عملی بنایا جائے۔ تھیوری اور پریکٹیکل کا تناسب بدلنے کی بھی ضرورت ہے۔ سائنس لیبارٹریز کو جدید خطوط پر استوار اور جدید سازو سامان سے آراستہ کیا جائے۔

5۔ زرعی اور ووکیشنل تعلیم کی تنظیم نو:

ہمارے نصاب میں اس تعلیم کو بہت کم اہمیت دی گئی ہے حالانکہ زرعی ملک ہونے کی وجہ سے زراعت کی تعلیم کم از کم دیہات کی سطح پر لازمی ہونی چاہیے۔ اسی طرح شہروں میں ووکیشنل تعلیم پر زیادہ زور دیا جائے۔ زیادہ سے زیادہ زرعی سکولز، کالجز اور ووکیشنل انسٹی ٹیوٹ قائم کئے جائیں۔

6۔ تعلیم نسواں کی توسیع:

لڑکیوں کی تعلیم خصوصی توجہ کی مستحق ہے اس کی توسیع بے حد ضروری ہے۔ آٹھویں پنج سالہ منصوبہ میں پرائمری اور ثانوی سطح پر لڑکیوں کا مطلوبہ Participations Rate بالترتیب 81.6 اور 30.2 فیصد مقرر کیا گیا ہے۔ اگر یہ اہداف بھی حاصل ہو جائیں تو غنیمت ہے کیونکہ ایک بچی کی تعلیم پورے خاندان کی تعلیم ہے۔

7۔ تشکیل کردار:

ہمارے نصاب کا سب سے بڑا اور اہم مقصد طلباء کو سچا مسلمان بنانا ہے۔ چنانچہ نصاب کی بنیاد عظیم کتاب قرآن اور اس کی تشریح سنت رسول ﷺ پر ہونی چاہیے۔ طلباء کے اخلاق و کردار کی تعمیر نصاب کے ذریعے اس طرح کی جائے کہ طلباء میں عمدہ اخلاق مثلاً ہمدردی، اتحاد، صبر و تحمل، عفو و درگذر اور ایثار و قربانی مکمل طور پر راسخ ہو جائیں۔ نصاب میں اسلامی تعلیمات کے ذریعے ایسے ذرائع کی نشاندہی کی جائے جن سے کسب حلال، حرام و حلال میں تمیز، جائز تلاش معاش اور اپنے ہاتھ سے کام کرنے کی فضیلت بتائی گئی ہو۔

8۔ سپیشل ایجوکیشن:

پاکستان میں سپیشل ایجوکیشن تاحال نووارد کی حیثیت رکھتی ہے۔ چند گنے چنے ادارے ہیں اور وہ بھی کمزور حالت میں۔ مستقبل کے نصاب میں اس Stream کو عام تعلیمی اداروں میں

بھی متعارف کروایا جائے اور اسے جنرل نظام تعلیم سے مربوط کیا جائے۔

9۔ جدید اور قدیم علوم کا امتزاج:

نصاب تعلیم چونکہ نظریہ حیات کے تابع ہوتا ہے۔ اس لئے اسلامی نصاب تعلیم نے زندگی کے تمام عناصر کو اپنے دامن میں سمیٹا۔ اسلام کی دور بینی نے نصاب میں مذہب اور سائنس دونوں کو شامل کیا۔ غرض اسلام نے نصاب سازی کے لئے جو سدا بہار اور ابدی اصول فراہم کئے اور ان اصولوں کے تحت جن علوم کی تحصیل کی تاکید کی ان میں روح و مادہ، دین و دنیا، انفرادیت اور اجتماعیت، ماضی، حال اور مستقبل کا فطری توازن اور اعتدال موجود تھا۔ اسلام نے ایسا نصاب دیا جو کہ ایک فرد کو صحیح معنوں میں مسلمان بنا دے۔ لیکن ہم مغرب کی اندھی تقلید میں اپنی اس میراث کو گم کر بیٹھے ہیں۔ اسلامی نصاب تعلیم کی وسیع دامنی، ہمہ گیری اور ابدیت کا سبب بیان کرتے ہوئے خرم جاہ مراد لکھتے ہیں "اسلامی نظام تعلیم میں زندگی کبھی دو یا زیادہ حصوں میں بٹی نہیں رہی بلکہ ہمیشہ ایک وحدت رہی۔ روح، فکر، اخلاق، عمل، ٹیکنالوجی سب تفرقے اور انتشار کی بجائے ایک مرکز کے گرد ایک رشتہ وحدت میں منسلک رہے" چنانچہ وقت آگیا ہے کہ ہم پاکستانی مسلمان ایک ایسا نصاب تعلیم اور نظام تعلیم وضع کریں کہ ہم ہی نہیں بلکہ آنے والا زمانہ ہمارے ساتھ چلے۔ تدوین نصاب پر عالمی کانفرنس 1980ء اسلام آباد نے تمام موجود نصابی علم کو ابدی علم سے ہم آہنگ کرنے پر زور دیا۔

سفارشات

1۔ ہر سطح کے نصاب تعلیم میں اسلامی روح اور پاکستانیت کو قائم رکھا جائے۔

2۔ قومی اور صوبائی نصابی اداروں کے رول اور فنکشن کے درمیان ربط کی نوعیت کو واضح کیا جائے۔

3۔ نصاب کو جدید خطوط پر چلانے کے لئے خاص مالی گرانٹ فراہم کی جائے۔

4۔ سائنٹیفک اور ٹیکنالوجیکل لٹریسی کو فروغ دینے کے لئے سائنسی تعلیم کو عالمی پراجیکٹ 2000ء سے منسلک کیا جائے۔

5۔ سماجی برائیوں کے خاتمہ کے لئے ڈرگ ایجوکیشن، ہیلتھ ایجوکیشن، پاپولیشن ایجوکیشن اور ماحولیاتی تعلیم کو نصاب میں موزوں جگہ دی جائے۔

6۔ پرائمری اور ثانوی سطح پر یکساں نصاب نافذ کیا جائے تاکہ طبقاتی تفاوت ختم ہو۔

7۔ فنی اور پیشہ ورانہ علوم کو نظری علوم کے ہم پلہ قرار دیا جائے تاکہ ملک سے بیروزگاری کا خاتمہ ہو۔
8۔ کوالٹی ایجوکیشن کے لئے ٹیچر ایجوکیشن کے معیار کو بہتر بنایا جائے۔
9۔ قومی زبان اردو کو ہر سطح پر ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔
10۔ شرح خواندگی میں تیزی سے اضافہ کے لئے ایجوکیشن ایمرجنسی نافذ کی جائے۔

کتابیات

1۔ ڈاکٹر خواجہ نذیر احمد، ڈاکٹر اکبر علی۔ تدوین نصاب، خالد بک ڈپو، 40۔ اردو بازار لاہور 1986ء
2۔ ڈاکٹر خالد، محمد ابراہیم تعلیمی زاویے، شمارہ نمبر 1 جلد نمبر 8 آصف بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور۔ 1997ء
3۔ ظفر حجازی (مدیر اعلیٰ) ماہنامہ افکار معلم (ستمبر 1997ء)
4۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی، ڈاکٹر شمیم حیدر ترمذی۔ نصاب تعلیم اور اکیسویں صدی، نظامت تعلیمات ملتان ڈویژن و گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن ملتان۔ 1996ء

5. Unesco IBE Bulletin No 229 (1981) The Future of Education. Newyork U.S.A.
6. Muhammad Munir Kanwar (1996) Notes on Curriculum Development, Unpublished material, for the class of M.Ed. at Govt. College of Education Multan.

ایک ناشر نے کتابوں کے نئے گاہک سے شوکت تھانوی مرحوم کا تعارف کراتے ہوئے کہا:

"آپ جس شخص کا ناول خرید رہے ہیں، وہ یہی ذات شریف ہیں، لیکن یہ چہرے سے جتنے بےوقوف نظر آتے ہیں، اُتنے ہیں نہیں۔"

شوکت صاحب نے فوراً کہا:

"جناب مجھ میں اور ناشر میں یہی فرق ہے، یہ جتنے بےوقوف ہیں، چہرے سے معلوم نہیں ہوتے۔"

تعلیمی عمل میں طلبہ کی شرح شرکت مستقبل کے تقاضے اور عملی اقدامات

پروفیسر محمد سعید احمد

موجودہ صورتحال

پنجاب بیورو آف سٹیٹکس لاہور، 1995ء کے شماریاتی اعداد و شمار کے مطابق پاکستان کی آبادی 31 دسمبر 1995ء تک تیرہ کروڑ چونتیس ہزار (13,00,34,000) ظاہر کی گئی ہے۔ اس آبادی کا عموماً پینتالیس فیصد (45%) وہ بچے ہیں جو سکول جانے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ اکنامک سروے کے مطابق چھٹے اقتصادی منصوبے (88-1983ء) میں طلباء کی تعلیمی عمل میں شرح شرکت اڑتالیس فیصد رہی ہے۔ اب تک ملک پاکستان کے تمام پانچ سالہ اقتصادی منصوبوں میں طلبہ کے تعلیمی عمل کی شرکت کا پھیلاؤ عموماً چالیس فیصد (40%) سے پچپن فیصد (55%) کے درمیا اتار چڑھاؤ کا شکار رہا ہے۔ تعلیمی عمل میں یہ شرح شرکت دیگر مشرق اور مشرق بعید کے ایشیائی ممالک کے مقابلے میں ہمیشہ سے کم تر ہے۔ اسی بنا پر ماہرین کے نزدیک تعلیمی عمل میں طلباء کی شرکت میں یہ انتہائی کمی موجب فکر رہی ہے اور ان وجوہات کی طرف تفتیشی طرز عمل کے ذریعے نشاندھی کی کوشش جاری ہے۔ جس سے سکول کے بچوں کی تعداد کی گرفت مضبوط کرنے اور مؤثر سکولوں کے نظریے کو یقینی بنانے کی طرف توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ گزشتہ تمام پانچ سالہ اقتصادی منصوبوں میں ابتدائی درجات پر تعلیمی عمل میں شرح شرکت کے اہداف پچپن فیصد (55%) سے پچہتر فیصد (75%) تک مقرر کئے گئے۔ لیکن 1955ء سے ان اہداف کو کبھی بھی پورا نہ کیا جا سکا۔ پہلے اقتصادی منصوبے 60-1955ء، اور پانچویں اقتصادی منصوبے 83-1978ء میں تعلیمی عمل میں طلباء کی شرح شرکت نصاب کے اختتام تک اصل فیصد سے سولہ اور چھ فیصد کم رہی اور باقی اقتصادی منصوبوں میں تعلیمی عمل میں طلباء کی شرح شرکت تکمیل نصاب تک بہت ہی معمولی انداز میں ایک تا 10 فیصد اضافہ کا موجب ہوئی۔ اسی موجودہ

صورتحال کے تحت بقول ماہر تعلیم حکیم محمد سعید پاکستان کی ابتداء 1950ء میں شرح خواندگی 48 فیصد تھی اور اب جب کہ دنیا اکیسویں صدی میں داخل ہو رہی ہے یہ خواندگی پاکستان میں نہایت محتاط اندازے کے مطابق کم ہو کر دس یا زیادہ سولہ فیصد رہ گئی ہے۔

مستقبل کے تقاضے

پاکستان کی موجودہ آبادی تیرہ کروڑ پینسٹھ لاکھ کے لگ بھگ پہنچ چکی ہے۔ پاکستان میں آبادی کی بڑھوتی کی شرح دنیا میں سب سے زیادہ 3.5% ہے اور یہ آبادی اکیسویں صدی کے آغاز تک چودہ کروڑ تک پہنچ جائے گی۔ اور سن 2020ء تک پاکستان کی آبادی تقریباً دوگنی ہو چکی ہو گی۔ اس بڑھتی ہوئی آبادی میں پینتالیس فیصد سکولوں کے لئے تیار یا سکول پہنچنے والے بچوں کے شماریاتی اندازے لگانا کوئی مشکل بات نہیں۔ مطلوبہ سکولوں کی تعداد، ان سکولوں میں کمرہ جماعت کی تعداد، ابتدائی جماعتوں میں تدریسی مضامین کے لحاظ سے اساتذہ کی مطلوبہ تعداد، جدید دور کے تقاضوں کے پیش نظر نصاب کی بدلی ہوئی اشکال، نصابی کتب کی تشکیل و تدوین کے انداز، مستقبل میں مطلوبہ طبعی سہولیات، مثالی عمارات، لیبارٹریز، لائبریریز، رہائشی سہولیات اور سب سے بڑھ کر مستقبل میں مطلوبہ بجٹ اور بجٹ کی فراہمی کے مواقع۔ الغرض دنیا کے اس ابتدائی شعبے کے مستقبل کے تقاضے ان گنت ہیں۔ تعلیمی تحقیق میں تحقیقی سروے کے ذرائع سے ان تقاضوں کے معیاری گراف کا حصول ممکن ہے۔ لیکن اگر ان تحقیقی سروے کا کہیں وجود ہی موجود نہ ہو اور یا ان تحقیقی سرویز کی لڑی کہیں سے بھی ٹوٹ جائے تو تعلیم کے کسی بھی درجے پر ماہرین کے لئے اس شعبے میں تعلیمی منصوبہ بندی کبھی ممکن نہیں ہوتی۔ یہی وہ بڑی وجہ ہے جس کی بنا پر ابتدائی درجات پر تعلیمی عمل میں طلبہ کی شرح شرکت ہر قسم کی اقتصادی منصوبہ بندی میں یکسانیت کا شکار رہی ہے۔ اور ملک کی شرح خواندگی میں یکسانیت کا جمود کبھی نہ ٹوٹ سکا ہے۔ مستقبل کی تعلیم (فیوچر ایجوکیشن) کا سو فیصد دارومدار اس بات پر ہے کہ ہمیں سب سے پہلے اس بات کا علم ہو کہ ہم کہاں کھڑے ہیں؟ اور دوسرے اس بات پر کہ ہماری منزل کیا ہے اور ہمیں کہاں پہنچنا ہے؟ ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے ادوار کا باہمی موازنہ مقصود ہو تو اس کمپیوٹر کے دور میں بھی صرف اور صرف ایک ابتدائی تعلیم کا شعبہ آپ کو دے گا۔ جس میں صحیح اور درست کوائف اور شماریات کسی بھی بڑے اور جاندار تعلیم یا گورنمنٹ کے دفتر میں دستیاب نہ ہو سکیں گے۔ ابتدائی تعلیم کی شکل و شباہت جس قدر تیزی سے لحہ بہ لحہ تبدیل ہوتی ہے اس

کے لئے تو بہت حساس اور جاندار اداروں کی ضرورت ہے جو موجودہ صورتحال کی ٹیلیویژن تصویر پیش کر سکیں۔ جس کو بنیاد بنا کر مستقبل کی کسی بھی درجے پر تعلیمی منصوبہ بندی کا ایک ٹھوس ڈھانچہ پیش نظر ہو اور پوری قوم کو معلوم ہو کہ آج سے پانچ، دس یا بیس سال بعد ہماری ضروریات تعلیم کیا ہیں؟

عملی اقدامات

دینی تعلیم کا ایک مستقبل ڈھانچہ ہمیشہ ہی سے ہمارے معاشرے، کلچر اور تہذیب کا حصہ رہا ہے۔ پاکستان اس تعلیمی تحریک کی بنا پر وجود میں آیا جو سرسید احمد خاں نے پوری قوم کے لئے اٹھائی تھی۔ سرسید احمد خاں نے گھر بیٹھے از خود کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ آپ نے عظیم برطانوی تعلیمی اداروں کا خود معائنہ کیا اور ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے اسلامیہ سکول اور کالجز قائم کئے۔ دینی بنیاد کے ساتھ جدید تعلیم سے آراستہ ان طلبہ نے بیسویں صدی کی چند ابتدائی دہائیوں میں برصغیر کے لئے ایک الگ قوم اور ملک کی بنیاد ڈالی جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ اس انقلاب نے آہستہ آہستہ پورے مشرق وسطیٰ کے نقشہ کو نہ صرف بدل ڈالا بلکہ آج وسطی ایشیا کا نقشہ بھی بدل چکا ہے۔ سرسید احمد خاں مرحوم کی طرح اب کسی نقشے کو پڑھنے کے لئے انگلستان سفر کی ضرورت نہیں بہت قریب ایسی مثالیں ہیں جن کے سطحی مطالعے سے ہم اپنے ابتدائی تعلیم کے ڈھانچے کو بدل کر تعلیمی عمل میں شرح شرکت کو محفوظ و مامون کر سکتے ہیں۔ اور اسی پر تمام شرح خواندگی کے اہداف کو قریب لا سکتے ہیں۔ ہمسایہ دوست ملک چین میں تعلیمی عمل میں شرح شرکت ترانوے فیصد ہے۔ اور اس میں باقی رہنے کی شرح بھی ستر فیصد ہے۔ اس سے بھی بہتر مثالی صورتیں مشرق بعید کے دو اسلامی ممالک ملائیشیا اور انڈونیشیا میں پائی جاتی ہیں۔ ملائیشیا میں تعلیمی عمل میں شرح شرکت چورانوے فیصد اور باقی رہنے کی شرح نوے فیصد ہے۔ اسی طرح سب سے معیاری صورت انڈونیشیا کی ہے جہاں تعلیمی عمل میں باقی رہنے کی شرح بچانوے فیصد ہے۔ الغرض بہت سادہ انداز میں مذکورہ ممالک میں ابتدائی درجات پر تعلیمی عمل میں شرح شرکت تک پہنچنے کے لئے اٹھائے گئے اقدامات کا مطالعہ اور پاکستان میں بھرپور انداز میں ان کا اطلاق تعلیمی عمل میں طلباء کی شرح شرکت کو بہت تھوڑے وقت میں تعلیمی اہداف تک پہنچا سکتا ہے۔ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے تصورات نے تمام دنیا کو ایک فیملی بنا دیا ہے۔ اب معلومات کی ایکسچینج کے لئے صرف بٹن دبانے کی ضرورت ہے۔ آج کی دنیا میں اگر آپ من حیث القوم

کوئی کام کرنا چاہیں تو کوئی رکاوٹ درپیش نہیں۔ ابتدائی مدارس میں تعلیمی عمل میں طلباء کی شرح شرکت کی گرفت کو مضبوط یا مضبوط تر بنانے کا مسئلہ نہیں۔ اب تو گرفت سو فیصد تک مضبوط بنائی جاسکتی ہے۔ بشرطیکہ کسی قوم میں کوئی کام کرنے کا ارادہ ہوں۔ جناب حکیم محمد سعید مرحوم کے مطابق اگر پاکستان کی چارلاکھ مساجد میں نماز فجر کے بعد ظہر تک ابتدائی تعلیم کے کام کو فوری طور رائج کردیا جائے تو پاکستان کی شرح خواندگی میں ایک انقلابی تبدیلی رونما ہوسکتی ہے۔

تعلیم و تحقیق

دوسرے علوم میں تحقیقات کی طرح تعلیمی تحقیق میں بھی درج بالا تینوں اقدامات کسی بھی تعلیمی مسئلہ کے حل کے لئے بین الاقوامی معیار کا درجہ رکھتے ہیں۔ تعلیمی عمل میں طلبہ کی شرح شرکت کو سوفیصد تک پہنچانا یا دوسرے الفاظ میں پاکستان میں شرح خواندگی کو سوفیصد کرنا ایسے مترادف مسائل کے حل کے لئے موجودہ صورت حال کا ملک میں دیانت دارانہ جائزہ اور اس جائزے کو بنیاد بنا کر مستقبل کی منزل کا تعین اور اس منزل کے حصول کے لئے ٹھوس عملی اقدامات ایسے جادوئی اقدامات ہیں کہ ایک محدود وقت میں ملک میں انقلاب آسکتا ہے۔ ان اقدامات پر سب سے بڑی قدغن یہ ہے کہ تعلیم میں تحقیق کے کسی قدم کے دوران کرپشن کا شائبہ تک نہ ہو جو ہماری قوم کا ایک طرہ امتیاز بن چکا ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے اداروں اور یونیورسٹیوں میں چلے جائیے ابتدائی اور ثانوی تعلیم سے متعلق مسائل کے حل کے لئے ایم۔ایڈ، ایم۔اے ایجوکیشن، پی۔ایچ۔ڈی ان ایجوکیشن کی سطحوں پر ایسے ٹھوس مقالات تہ در تہ میسر آئیں گے کہ آپ کو کوئی بھی مسئلہ لاینحل نظر نہ آئے گا۔ صرف ایک دیانت دارانہ اطلاق کی ضرورت ہے۔ کوئی اور اس کا اس طرح اطلاق نہیں کرسکتا۔ خدائے عزوجل کا بھی اصول ہے وہ بھی کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ قوم خود اپنی حالت نہ بدلے۔

> "انسان کا اصل جوہر صداقت ہے۔ صداقت مصلحت اندیش نہیں ہوسکتی، جہاں اظہار صداقت کا ہو وہاں خاموش رہنا صداقت سے محروم کردیتا ہے۔ اس انسان کو صادق نہیں کہا جاسکتا جو اظہارِ صداقت میں ابہام کا سہارا لیتا ہو۔"
>
> (کرن کرن سورج، ص15)

دورِ جدید میں
سیرت النبی ﷺ
کے
عملی پہلو کی فلسفیانہ افادیت

محمد عامر اقبال
رول نمبر 355 بی-ایڈ
سیکرٹری مجلس علوم اسلامیہ

جتنے بھی لوگ دنیا میں آئے جانے کے لئے آئے لیکن ان میں ایک ایسی ہستی بھی آئی جو صرف آنے کے لئے آئی۔ اس کے احکام و فرامین اور سیرت بھی بعینہٖ انہی لفظی معنوں میں موجود ہے جس طرح کہ اس کے زمانے میں عملی صورت میں موجود تھی۔ اس شخصیت کو سب پیغمبر آخر الزماں، خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ جو کہ بعثت سے پہلے صادق اور امین کے لقب سے یاد کئے گئے اور بعثت کے بعد کانہ خلقہ القرآن کے عنوان سے معنون ہوئے۔

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ صرف انہیں شخصیتوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جن کے قول اور عمل میں یکسانی ہو۔ انہوں نے جو کچھ کہا اس پر عمل بھی کیا چاہے حالات کچھ بھی رخ اختیار کریں۔ انسان کی فطرت بھی اس بات کی متقاضی ہوتی ہے کہ وہ جس فلسفۂ حیات پر عمل کرنا چاہتا ہے یا وہ مادیت اور روحانیت میں حسین امتزاج پیدا کرنے کے لئے جس شخصیت کی پیروی کرنا چاہتا ہے آیا وہ اس کا عملی نمونہ بھی ہے یا نہیں؟ اس نے جو فسلفۂ حیات پیش کیا ہے، خود اس پر کہاں تک عمل کیا ہے؟ اور اس پر عمل کرنے سے کامیابی ہوئی یا ناکامی؟ ان تمام اشکالات کا حل اس بات پر ہے کہ متعلقہ شخصیت عملی پہلو سے کس معیار کی حامل ہے۔

ان تمام پہلوؤں کا تاریخی طور پر جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت محمد ﷺ کی سیرت ہی وہ سیرت ہے جو تاریخ کی اس کسوٹی پر پرکھا جانا برداشت کر سکتی ہے۔ مورخین،

محدثین اور فقہاء کے بنائے ہوئے روایت و درایت کے اصول ایسے سخت ہیں کہ کونسی ایسی ذات ہے جو ان اصولوں پر پورا اتر سکتی ہے؟ وہ یقیناً حضرت محمد ﷺ کی ذات گرامی ہی ہے۔ اس بات کا اعتراف غیر مسلموں نے بھی کیا ہے۔ اسلام کی کامیابی کا انحصار ایک لحاظ سے اس بات پر بھی ہے کہ اس کے پیچھے اسوۂ حسنہ کی صورت میں ایک عملی نمونہ موجود تھا۔ ہندوستان میں اسلام کے اثرات سے پیدا ہونے والی برہما سماج پارٹی جو کہ بعض اچھے عقائد کی حامل تھی صرف اس وجہ سے ناکام ہو گئی کہ اس کے پیچھے کوئی شخصیت بحیثیت عملی نمونہ موجود نہ تھی۔ ہندوازم بھی اوہام و خرافات کا مجموعہ اور خلاف فطرت صرف اس وجہ سے ہے کہ اس کے ماننے والوں کے لئے کوئی شخصیت بطور عملی نمونہ موجود نہیں۔ ہندوازم وہی ہے جو ایک ہندو کرتا ہے۔ ہندوازم صرف ایک مسئلے پر متحد ہو سکتا ہے اور وہ ہے گائے کا تقدس۔

عیسائیت میں عملی شخصیت کو اس کے ماننے والوں نے اس قدر الجھا دیا ہے کہ حقیقت کی پہچان مشکل ہو گئی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام علم کی جس روشنی کو پھیلانے کے لئے تشریف لائے، مذہب کے ناخداؤں نے مذہب ہی کا سہارا لے کر اسے گل کرنا چاہا، جس سے یورپ ایک عرصے تک تاریکی میں ڈوبا رہا۔ اسلامی اثرات کے زیر اثر جب یورپ میں عملی تحریک اٹھی تو پادریوں کی مذہبی پیشوائیت انسانی تہذیب کے ارتقاء کے آڑے آئی۔ نتیجے کے طور پر یورپ میں مذہب کے خلاف بغاوت کی تحریک اٹھی جس نے اخلاقیات کی تمام کرنوں کو بجھا دیا اور ترقی کی منزل کو چھونے کے احساس سے ان میں انسانیت کی تکریم کا احساس بھی ختم ہو گیا۔ یورپ کی یہ معکوس ترقی صرف اس وجہ سے تھی کہ ان کے سامنے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت کا عملی پہلو لفظی معنوں میں موجود نہ تھا جو دور جدید میں ان کی فکری و عملی رہنمائی زندگی کے ہر میدان میں کرتا۔

ایسی صورت میں ہم اسلام کی عملی شخصیت کا جائزہ لیتے ہیں، جس کے نزدیک اگر محمد ﷺ کی بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کرے گی تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ غزوۂ خندق میں پیٹ پر دو دو پتھر باندھے ہوئے ہیں۔ سخاوت کا یہ حال ہے کہ خود بھوکے رہتے ہیں اور سائل کو کھانا کھلاتے ہیں۔ عفو و درگزر کا حکم دیتے ہوئے مکہ میں خود عام معافی کا اعلان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ لا تثریب علیکم الیوم (القرآن) اس طرح کی اور بھی بے شمار مثالیں دی جا سکتی ہیں۔

تاریخ حادثات زمانہ کو پار کرتی ہوئی لمحۂ موجود سے گزر رہی ہے تو میں آنحضور صلعم کی عملی شخصیت اور آج کے مسلمان کے کردار کا جب تقابلی جائزہ لیتا ہوں تو میری روح اس تصور سے کانپ اٹھتی ہے کہ آیا ہم مسلمان بھی ہیں؟ دعویٰ تو ہے مسلمانی کا لیکن عمل اس کے برعکس

ہے۔ سود حرام ہے لیکن ہماری معیشت کا جزو ہے۔ ملک کو اسلام کی تجربہ گاہ بنانا چاہتے تھے مگر اسے تجربات کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ ابلیس نے اس بے عملی کو ہماری نگاہ میں اپنی جمالیاتی فریب کاری کی صورت میں پیش کیا ہے۔

ہمارے موجودہ تعلیمی نظام میں علم سے زیادہ ڈگری کے حصول پر زور دیا جاتا ہے۔ علم کو برہمنوں کے ذات پات کے نظام کی طرح اے، بی، سی اور ڈی گریڈز میں تقسیم کر دیا گیا اور مزید ستم ظریفی یہ کہ عمل اور کردار کو ثانوی حیثیت دی گئی۔ جبکہ علم بذات خود عمل کے بغیر نامکمل ہے۔ ہم جو کچھ کہتے ہیں اس پر عمل نہیں کرتے۔ قول اور عمل کے اس تضاد میں بحیثیت مجموعی جو چیز سب سے زیادہ متاثر ہو رہی ہے وہ "اسلام" ہے۔ جب ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے اور دوسری طرف خود ہی اس کے فطری و عالمگیر اصولوں سے انحراف کرتے ہیں تو ہمارا یہ رویہ غیر مسلموں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ آج اسلام صرف نظری اور خیالاتی مذہب ہے، عمل سے اس کا کوئی تعلق نہیں گویا یہ دور جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتا۔ یہ رویہ جو ایک غیر مسلم میں پیدا ہوتا ہے اس کا ذمہ دار کون ہے؟ میں بغیر کسی مصلحت کے یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ ہم خود ہی اس کے ذمہ دار ہیں۔

لارڈ میکالے کے تعلیمی نظام کی روشنی میں سر سید احمد خان نے جو تعلیمی پالیسی بنائی اس میں اسلام کے بارے میں معذرت خواہانہ رویہ اختیار کیا گیا اور اس روش کی پیروی آج بھی ہمارے ماہرین تعلیم کر رہے ہیں۔ جس سے مسلمانوں کے اندر اسلام بحیثیت نظام حیات کے تصور کا احساس بھی ختم ہو رہا ہے۔ یہ بات یاد رکھیں کہ احساس کا ختم ہو جانا عمل نہ کرنے کے تصور سے بھی زیادہ سنگین نتائج کا حامل ہوتا ہے۔ حالانکہ

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

اسلام کا تصور اخلاق
(قرآن و سنت کی روشنی میں)

ذوالفقار علی۔ بی ایڈ (164 B)

اخلاق کا مفہوم:

اخلاق "خلق" کی جمع ہے۔ جس کے لغوی معنی ہیں عادت، خصلت، خو، طبعی خصلت، مروت۔ لہذا "اخلاق" کے معنی ہیں: عادات، خصلتیں، خوش خوئی، ملنساری، کشادہ پیشانی۔

خلق کیا ہے؟

علماء نے خلق کی بے شمار تعریفیں کی ہیں۔ سب سے عمدہ تعریف یہ ہے کہ اخلاق فاضلہ وہ اعمال ہیں جو خدا کی صفات مختلفہ کی مقتضیات ہوں لیکن جو افعال صفات الٰہیہ کی مقتضیات کے برعکس ہوں گے ان کو اخلاق رذیلہ یا سیئات کہا جائے گا۔ جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے۔

صبغۃ اللّٰہ و من احسن من اللّٰہ صبغۃً

"یعنی اللہ تعالیٰ کا رنگ اختیار کرو اس کے رنگ سے اچھا اور کس کا رنگ ہو سکتا ہے۔"

اللہ تعالیٰ کا رنگ اس کی صفات حسنیٰ ہیں اس آیت کریمہ میں یہ تعلیم دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات مختلفہ کی مقتضیات کے مطابق زندگی بسر کرنی چاہیے۔

اصطلاحاً خلق سے مراد وہ اوصاف ہیں جو کسی کی فطرت و طبیعت کا اس طرح لازمی جزو بن جائیں کہ زیادہ غور و فکر کے بغیر روزمرہ کی زندگی میں ان کا ظہور ہو۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے نزدیک خلق انسان کی اس کیفیت کا نام ہے جو اس کی طبیعت کے مختلف اوصاف و کمالات کو جدوجہد کر کے اپنی طرف راجع کرے۔

ملا جلال الدین دوانی فرماتے ہیں جب افعال کسی فکر و تردد کے بغیر نفس سے سرزد ہونے لگیں تو اس کیفیت کو خلق سے تعبیر کرتے ہیں۔ نفس میں خلق پیدا ہونے کے دو باعث ہیں۔

1۔ طبیعت 2۔ عادت

اخلاق کی اقسام:

اخلاق اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی۔ اچھے اخلاق کو "اخلاق محمودہ" یا فضائل کہتے ہیں اور برے اخلاق کو "اخلاق ذمیمہ" یا رذائل کہتے ہیں۔

اسلام میں فضائل اخلاق:

وہ صفات پاکیزہ جن کا تذکرہ قرآن و سنت میں موجود ہے یا وہ صفات جن سے متصف ہونے کا اسلام میں حکم دیا گیا ہے، اسلام کی نظر میں اخلاق کی فضلیتیں ہیں۔ اسلام میں مندرجہ ذیل پاکیزہ صفات فضائل اخلاق میں شامل ہیں۔

1۔ صدق | 2۔ سخاوت | 3۔ عفت و پاکبازی
4۔ دیانتداری و امانت | 5۔ شرم و حیاء | 6۔ رحم
7۔ عدل و انصاف | 8۔ ایفائے عہد | 9۔ عفوودرگزر
10۔ حلم و بردباری | 11۔ رحم و لطف | 12۔ تواضع و خاکساری
13۔ خوش کلامی | 14۔ اعتدال و میانہ روی | 15۔ ایثار
16۔ عزت نفس یا خودداری | 17۔ شجاعت (بہادری) | 18۔ استقامت
19۔ حق گوئی | 20۔ استغناء

علاوہ ازیں بعض علمائے کرام نے مندرجہ ذیل صفات حسنہ کو بھی فضائل اخلاق میں شامل کیا ہے۔

1۔ رضائے الہی | 2۔ اخلاص | 3۔ استغفار
4۔ خشیت | 5۔ امید | 6۔ شکر
7۔ صبر | 8۔ توکل | 9۔ تقوی
10۔ شوق | 11۔ خلوت | 12۔ جلوت

اسلام میں رذائل اخلاق:

اسلام میں ہر وہ بات جو قرآن و سنت کے خلاف ہے "رذالت" قرار دی گئی ہے رذائل اخلاق کے نام یوں ہیں۔

1۔ جھوٹ (کذب) | 2۔ جھوٹی قسمیں کھانا | 3۔ خیانت و بددیانتی
4۔ دغابازی، فریب | 5۔ بہتان | 6۔ چغل خوری

7- بد گوئی	8- غیبت	9- بدگمانی
10- حسد	11- بغض و کینہ	12- خوشامد
13- بخل	14- ریا	15- فخر و غرور
16- حرص و طمع	17- ظلم	18- خود نمائی (خود پسندی)
19- فضول خرچی	20- فحاشی و زنا	21- فحش گوئی
22- چوری	23- رشوت	24- سود خوری
25- شراب خواری	26- حب جاہ	27- حب مال

اخلاق کی اہمیت:

"اخلاق" تعلیمات اسلام کا ایک اہم عنصر ہے انسان جب اس دنیا میں قدم رکھتا ہے تو اس کی ہر شے سے اس کا تھوڑا بہت تعلق پیدا ہو جاتا ہے اس تعلق کے فرض کو بحسن و خوبی انجام دینا اخلاق ہے۔ اخلاق سے مقصود بندوں کے حقوق و فرائض کے وہ تعلقات ہیں جن کو ادا کرنا ہر انسان کے لئے ضروری ہے اسلام کی بنیاد اخلاق حسنہ پر ہے چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی بعثت کا مقصد بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

1.. بعثت لا تمم حسن الاخلاق (امام مالک)

(میں حسن اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہوں)

2. انما بعثت لا تمم مکارم الاخلاق (مسند احمد، بہیقی)

(میں تو اسی لئے بھیجا گیا کہ اخلاق حسنہ کی تکمیل کروں)

چنانچہ حضور اکرم ﷺ نے بعثت کے ساتھ ہی اس فرض کو انجام دینا شروع کر دیا ابھی آپ مکہ میں تھے کہ ابوذرؓ نے اپنے بھائی کو رسول اللہ ﷺ کے حالات و تعلیمات کی تحقیقات کے لئے مکہ بھیجا انہوں نے واپس جا کر یوں اطلاع دی۔

"میں نے اس کو دیکھا کہ وہ لوگوں کو اخلاق حسنہ کی تعلیم دیتا ہے"

دین اسلام کی تعلیم میں خدا کے نیک اور مقبول بندے وہی قرار دیے گئے ہیں جن کے اخلاق بھی اچھے ہوں چنانچہ سورۃ فرقان میں فرمایا گیا ہے۔

وعباد الرحمٰن اللذین تمشون علی الارض ہو ناواذا . خاطبھم الجاھلون قالوا سلاما.

"اور رحم والے خدا کے بندے وہ ہیں جو زمین پر دبے پاؤں چلتے ہیں اور

جب نا سمجھ لوگ ان سے بات کریں تو وہ سلام کہیں"

اہل ایمان کے اخلاقی اوصاف بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔

ترجمہ: "اور وہ لوگ اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں اور جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں اور جو غصہ کی حالت میں معاف کرتے ہیں۔"

رسول اکرم ﷺ اکثر یہ دعا فرمایا کرتے تھے۔

ترجمہ: "اور اے میرے خدا! تو مجھ کو بہتر سے بہتر اخلاق کی رہنمائی کر، تیرے سوا کوئی بہتر سے بہتر اخلاق کی راہ نہیں دکھا سکتا۔" (مسلم)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

1۔ مسلمانوں میں کامل ایمان اس کا ہے جس کا اخلاق سب سے اچھا ہے۔
2۔ تم میں سب سے اچھا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔
3۔ انسان حسن اخلاق سے وہ درجہ پا سکتا ہے جو دن بھر روزہ رکھنے اور رات بھر عبادت کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔
4۔ قیامت کے ترازو میں حسن خلق سے زیادہ بھاری کوئی چیز نہ ہوگی، کہ حسن اخلاق والا اپنے حسن خلق سے ہمیشہ کے روزہ دار اور نمازی کا درجہ حاصل کر سکتا ہے۔
5۔ لوگوں کو قدرت الٰہی کی طرف سے جو چیزیں عطا ہوئیں ان میں سب سے بہتر اخلاق ہیں۔
6۔ اللہ کے بندوں میں اللہ کا سب سے پیارا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔
7۔ تم میں میرا سب سے پیارا اور بہشت میں مجھ سے سب سے نزدیک وہ ہے جو تم میں خوش خلق ہے اور مجھے ناپسند اور قیامت میں مجھ سے دور وہ ہوں گے جو تم میں بد اخلاق ہیں۔
8۔ خوش خلقی اللہ تعالیٰ کا خلق عظیم ہے۔

حسن خلق کیا ہے؟

اس بارے میں مندرجہ ذیل تعریفات ملاحظہ ہوں۔

1۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں:

"طلاقت وجہ، جود و کرم کی بہتات، ایذا رسانی سے اجتناب اور مصائب پر صبر و تحمل کا نام حسن اخلاق ہے"

2۔ ابو بکر واسطی فرماتے ہیں:

"مخلوق خدا کو خوشی اور مصیبت دونوں حالتوں میں راضی اور پسندیدہ خاطر رکھنا حسن خلق ہے"

3۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں:

"حسن خلق کی علامت تین خصلتیں ہیں۔ محارم سے اجتناب، طلب حلال، اہل و عیال کے ساتھ مالی، قولی، بلکہ ہر قسم کی وسعت و حوصلہ کاملہ۔"

قرآن مجید میں رسول پاک ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے۔

انک لعلی خلق عظیم

"بلاشبہ آپ ﷺ کا اخلاق کریمانہ کے سب سے بلند مقام پر فائز ہیں"

چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے سب سے پہلے حسن اخلاق کا نمونہ پیش کیا اور لوگوں کو اخلاق حسنہ کی تعلیم دی۔ اسلامی اخلاق خشیت الٰہی کی بدولت پیدا ہوتا ہے۔

خرد سے زیست کے پہلو سنوارنے والو
جنوں کے پاس بھی ہے ایک شعبۂ تنظیم

لیا نہ گریۂ شبنم سے کچھ سبق تو نے
مجھے تو گل کی ہنسی سے بھی مل گئی تعلیم

مرا مذاق تو ہنگامہ تلاطم ہے
معاف کر مجھے اے موجِ کوثر و تسنیم

عاصی کرنالی

تنوعات

رنگ

ڈاکٹر شمیم حیدر ترمذی

رنگ کائنات کا لباس ہے۔ رنگ نہ ہوتے تو یہ دنیا پر نُچے مور کی طرح بد ہیئت ہوتی۔ رنگ کے بغیر اس کائنات کا باطن تاریک غار کی طرح ہولناک اور اس کا ظاہر اود بلاؤ کے جسم کی طرح مکروہ ہوتا۔ دنیا کا سارا حُسن، دنیا کی ساری دلکشی رنگ کے دم سے ہے۔ یہ دنیا رنگ محل ہے، ایسا محل جو رنگ کی روشنی میں نہایا ہوا ہے۔ ایسا گھر جس کے صحن میں رنگ کی دھوپ پھیلی اور جس کے دالانوں میں رنگ رس بکھرا ہوا ہے۔ جس کے باغیچے پر رنگوں کی پھوار پڑ رہی ہے۔ جس کے کمروں میں رنگ پاشی کا رقص جاری ہے۔ گویا اس محل کی ہر شے سے رنگ پھوٹتا ہے اور اس کے ماحول پر رنگ بادشاہ کی حکومت ہے۔ ایسی حکومت جس کے دورانیے کے بارے میں کہا جا سکتا ہے۔

ع...... نہ ابتدا کی خبر ہے، نہ انتہا معلوم

کائناتی رنگ، دو رنگوں سے مل کر بنتا ہے۔ ایک خدا کا رنگ اور دوسرا بندے کا رنگ۔ خدا کے رنگ اَن گنت ہیں۔ خدا کے رنگ نیارے ہیں۔ ہر روز نیا روپ، ہر گھڑی نیا رنگ۔

کلّ یوم ھو فی شان

ان سب رنگوں میں بے نیازی کا رنگ سب سے نمایاں ہے۔ کوئی آگ لینے آئے تو اسے پیغمبری مل جاتی ہے اور کوئی پیمبری کا دعویٰ کر بیٹھے تو اس کی جھولی انگاروں سے بھر دی جاتی ہے۔ وہ دینے پر آئے تو انہیں بے تحاشا دیتا ہے جو اس کا برملا انکار کرتے ہیں۔ نہ دے تو ان کی زندگی بھی مشکل میں گزرتی ہے جو دل و جان سے اس کی محبت کا دم بھرتے ہیں۔ وہ چاہے تو پل میں آبادیوں کو برباد کر دے اور چاہے تو ملبوں کے بطن سے آبادیاں جنم لیں۔ غرض خدا کے جتنے نام ہیں، اتنے ہی رنگ ہیں اور ہر رنگ میں بے شمار رنگوں کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ظاہر ہے اس صورتحال میں سب رنگوں کا احاطہ کسی رنگ میں بھی ممکن نہیں۔

دوسرا رنگ خدا کے بندوں کا رنگ ہے۔ بندوں کے رنگ تاریخ اور جغرافیہ بدلنے سے بدلتے ہیں۔ یہ رنگ ہواؤں کے رُخ کے ساتھ تبدیل ہوتے ہیں اور رنگوں کی یہ تبدیلی مانس رنگ کی کشش اور بقا کی ضامن ہے۔ بندوں کے رنگ، زمین کے ہر آباد گوشے تک پھیلے ہوئے ہیں۔

ان رنگوں کے وجود اور جلوے کے لئے بحر اور بَر کی کوئی قید نہیں۔ ہوا اور خلا کی کوئی پابندی نہیں۔ یہ رنگ موجوں کے کھیل کو حسین تر بناتے ہیں۔ یہ رنگ ہواؤں کے رقص کو پُرکشش بناتے ہیں۔ یہ رنگ مٹی کی مہکار کو بڑھاتے ہیں۔ یہ رنگ جسموں کو نمو اور روحوں کو بالید گی عطا کرتے ہیں۔ انہی رنگوں کی بدولت انسان نے شرف کی گٹھڑی کو اب تک اپنے سر پر ٹکایا ہوا ہے اور انہی رنگوں کی وجہ سے وہ کائنات کا وڈیرا بنا بیٹھا ہے۔

جہاں شیطانی رنگ کی ملاوٹ ہے، وہاں آدم رنگ، بدرنگی اور شکستگی کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ صورتحال یہ ہو تو آدمیت کی اونچی عمارت کے کنگرے ٹوٹتے اور گرتے نظر آتے ہیں۔ اس ماحول میں مسجودِ ملائک کے رنگ ڈھنگ پر حیوانی چھاپ نظر آتی ہے۔ ہم اپنے گردوپیش پر نگاہ ڈالیں تو ہمیں کھیت کھلیانوں، گلیوں بازاروں، گھر کی دہلیزوں اور درباروں پر یہ بدرنگی رقصاں دکھائی دیتی ہے اور مزے کی بات یہ کہ انسان اس بدرنگی کو رنگ بلکہ خوش رنگی ثابت کرنے پر تلا ہوا ہے۔ یہ جہل مرکب، انسان کو ایسی دلدل کی طرف گھسیٹے لئے جارہا ہے جہاں سے ابھرنا اور پلٹنا ناممکن ہے۔ یہ بے حسی، اولادِ آدم کو ایسی بھول بھلیوں میں داخل ہونے پر مجبور کررہی ہے جہاں سے باہر نکلنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا بیل گاڑی کے وسیلے سے مریخ تک پہنچنا۔

کسی رنگ شناس کی نشاندہی پر میں بندوں کے رنگ دیکھنے کے لئے ایک ایسے ریستوران میں داخل ہوا جس کے ماتھے پر لکھا تھا ..... "صرف معززین کے لئے" ..... کوئی میز خالی نہ تھی۔ بیرے سے سٹول لے کر کاؤنٹر کے قریب ایسی جگہ بیٹھ گیا جہاں سے ریستوران کا سارا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ میزوں کے شوخ اور چیختے رنگ، نیم تاریک ماحول میں بھی نمایاں تھے۔ ہر میز کا رنگ، دوسری کے رنگ سے مختلف تھا اور ہر میز کے گرد بیٹھے لوگوں کے لباسوں کا رنگ بھی میز کے رنگ ایسا تھا۔ وہ سب کھانے، پینے اور باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ ریستوران کے دستور کے مطابق بات بے بات زوردار قہقہے لگا رہے تھے۔ شاید اس لئے کہ قہقہے جگہ کے آباد ہونے کا ثبوت ہوتے ہیں۔

میں نے کاؤنٹر والے سے جب میزوں اور میز والوں کے بارے میں پوچھا تو اس نے سرگوشیوں کی زبان میں کہنا شروع کیا۔ "جب ہم نے ریستوران کھولا تو ساری میزوں کا رنگ ایک تھا اور گاہک اپنی مرضی کے لباسوں میں یہاں آتے تھے۔ چند روز بعد ہی نہ جانے کیا ہوا، یہ گاہک ٹکڑیوں میں بٹ گئے۔ پھر ہم نے ان ٹکڑیوں کی فرمائش پر میزوں کو رنگوا دیا۔ عارضی طور پر ہمارا تھوڑا بہت خرچہ تو اُٹھ گیا لیکن مستقل فائدہ یہ ہوا کہ میزوں کے رنگوانے کے بعد "گاہکی"

بڑھ گئی۔ اب جو یہ رونق دیکھ رہے ہو، انہیں رنگین میزوں کا کرشمہ ہے۔ اب یہ گاہک پورے خشوع و خضوع سے اپنی اپنی مخصوص رنگ کی یونیفارم میں روزانہ یہاں آتے ہیں۔ آندھی ہو یا زلزلہ، شادی ہو یا موت، ان کی آمد کا سلسلہ کبھی نہیں ٹوٹتا۔ ظاہر ہے اس رنگا رنگی کی وجہ سے ہماری آمدن پر صحت مند اثر پڑا ہے۔" پھر جب میں نے پوچھا کہ ان رنگدار وردیوں والے معززین کا ذریعۂ معاش کیا ہے تو کاؤنٹر والے نے یہ کہہ کر منہ پھیر لیا "بھائی! یہ بتانا ہمارے تجارتی ضابطۂ اخلاق کے خلاف ہے۔"

میں کاؤنٹر والے سے مایوس ہو کر ایک بیرے کی طرف بڑھا جو اس وقت تقریباً فارغ کھڑا تھا۔ میں نے جب ٹپ کے ساتھ اس کی طرف پہلے والا سوال اچھالا تو کہنے لگا "یہ وردیوں والے میری تمہاری طرح صرف ایک کام نہیں کرتے بلکہ ہر رنگ کا ٹولہ ہر رنگ کا کام کرتا ہے۔ ان کی آستینوں میں سانپ اور ان کی جیبوں میں بچھو ہیں۔ یہ بوقت ضرورت مختلف رنگوں کا ہتھیار آزماتے ہیں۔ خلق خدا دکھ میں ہو تو انہیں سکھ ملتا ہے۔ ہمسایہ سو رہا ہو تو یہ ڈھول بجاتے ہیں۔ بھائی رو رہا ہو تو یہ قہقہے لگاتے ہیں۔ صرف اس کی خوشی میں خوش ہوتے ہیں جس نے ان کے رنگ کی وردی سلوا رکھی ہو۔ صرف اس کے جنازے کو کاندھا دیتے ہیں جس کے تابوت کا رنگ انہیں پسند ہو" .... بیرا روانی سے رنگ کہانی سُنا رہا تھا اور میں تاریک کونے میں مبہوت کھڑا یہ سوچ رہا تھا کہ اس ریستوران سے بھاگ نکلوں یا نیلے پیلے، سبز سرخ رنگ کی وردی کسی سے مانگ پر پہنوں اور کسی میز پر جا بیٹھوں؟!!!!!

> جاہلوں کا ذکر نہیں لیکن بڑے بڑوں کو ہم نے اس خوش فہمی میں مبتلا دیکھا کہ زیادہ نہ کم پورے بائیس کھلاڑی کرکٹ کھیلتے ہیں ہم قواعد و ضوابط سے واقف نہیں لیکن جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا اسی کی قسم کھا کر عرض کرتے ہیں کہ درحقیقت کرکٹ صرف ایک ہی شخص کھیلتا ہے مگر اس کھیل میں وصف یہ ہے کہ بقیہ اکیس حضرات سارے سارے دن اس مغالطے میں رہتے ہیں کہ وہ بھی کھیل رہے ہیں۔ حالانکہ ہوتا یہ ہے کہ یہ حضرات شام تک سارس کی طرح کھڑے کھڑے تھک جاتے ہیں اور گھر پہنچ کر اس تکان کو تندرستی سمجھ کر پڑ رہتے ہیں۔
>
> (مشتاق یوسفی، چراغ تلے، ص 138)

رنگ.... شخصیت کے آئینہ دار

صائمہ بشیر
رول نمبر 741- بی- ایڈ

جس طرح ہاتھ کی لکیروں سے، انسان کی گفتگو سے شخصیت کا پتہ چلتا ہے۔ اسی طرح رنگ بھی شخصیت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ آیئے آپ بھی اپنی شخصیت کو رنگ کے حوالے سے دیکھیں اور پرکھیں۔

مالٹا رنگ:

اس رنگ کو پسند کرنے والے دھیمے پن کے مالک ہوتے ہیں۔ یہ لوگ ہر وقت کسی نہ کسی کی تلاش میں رہتے ہیں۔ میزبان ہوتے ہیں۔ جلد گھبرا جانے والے ہوتے ہیں۔ دوسروں میں اپنی مقبولیت اپنی میٹھی زبان کی بدولت حاصل کرتے ہیں۔

آسمانی رنگ:

ٹھنڈک اور سکون کو ظاہر کرتا ہے۔ اس رنگ کو پسند کرنے والے کچھ شوخ طبیعت کے مالک ہوتے ہیں۔ لہجے میں مزاح کا عنصر شامل کئے رکھتے ہیں مگر کسی کی دلِ آزاری نہیں کرتے خواتین نرم دل اور مرد کچھ مغرور ہوتے ہیں اس رنگ کو پسند کرنے والے کی شخصیت دوسرے افراد میں واضح ہوتی ہے فنونِ عمل میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ تعلیمی میدان میں اعلیٰ ذہانت کے باعث کامیاب ہوتے ہیں۔ شہرت اچھے مصور اور اچھے اداکار بن کر حاصل کرتے ہیں مگر کچھ کنجوس ہوتے ہیں۔

سبز:

یہ رنگ صحت کو اجاگر کرتا ہے۔ جو لوگ اس رنگ کو پسند کرتے ہیں بہت اعلیٰ فطین ہوتے ہیں یا دوسرے لفظوں میں بہت genius ہوتے ہیں۔ اچھے طور طریقوں کے مالک ہوتے ہیں۔ ان کے ہر ایک کام میں ایک سلیقہ ہوتا ہے۔ ایسے لوگ اپنی گفتگو سے دوسروں کو متاثر کرتے ہیں۔ اس رنگ کی ایک خامی بھی ہے ایک طرف یہ رنگ صحت مند ہوتا ہے اور اکثر بیمار

اور لاغر صحت کو بھی ظاہر کرتا ہے۔

نیلا:

یہ رنگ شہرت کو ظاہر کرتا ہے۔ جو لوگ اس رنگ کو پسند کرتے ہیں بہت حساس ہوتے ہیں۔ عام طور پر مہمان نواز ہوتے ہیں۔ دوسروں کی بہت عزت کرتے ہیں۔ اپنے خاندان میں خاموش طبع ہوتے ہیں مگر دوستوں میں بہت فری ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی زندگی امید کے سہارے گزارتے ہیں۔

گرے رنگ:

گرے رنگ پسند کرنے والے بہت ذہین ہوتے ہیں مگر ذہانت کے ساتھ ساتھ مغرور بھی ہوتے ہیں۔ اپنے کام کے متعلق گفتگو کرنے میں زیادہ مزہ لیتے ہیں۔ اکثر حضرات جسمانی طور پر کمزور ہوتے ہیں لیکن ذہنی طاقت کمال درجہ مضبوط ہوتی ہے یعنی اعصابی طور پر مضبوط ہوتے ہیں۔

پنک (ہلکا گلابی رنگ):

پنک رنگ پسند کرنے والے لوگ اکثر صحت مند ہوتے ہیں، خاموش طبع ہوتے ہیں۔ لوگوں سے زیادہ ملنا جلنا پسند نہیں کرتے، ان کا خیال ہوتا ہے کہ حد سے زیادہ ملنا جلنا عزت میں فرق لاتا ہے۔ بہت اچھی مسکراہٹ کے مالک ہوتے ہیں خوش اخلاق ہوتے ہیں۔ اعلیٰ ذہانت کے مالک نہیں ہوتے البتہ محنتی ہوتے ہیں اور قسمت والے، ضدی اور ہٹ دھرم بھی ہوتے ہیں۔ جس بات پر ایک مرتبہ اڑ جائیں جب تک پورا نہ کریں پیچھے نہیں ہٹتے۔ ہر خوبصورت چیز سے متاثر ہوتے ہیں مگر کھلم کھلا اظہار نہیں کرتے۔

جامنی رنگ:

20٪ محنتی ہوتے ہیں۔ زیادہ تر لاپرواہی سے کام لیتے ہیں۔ جھگڑالو ہوتے ہیں، گھر میں بھی اور گھر کے باہر بھی۔ اسی لئے ان کے دوست کم ہوتے ہیں۔ یہ جھگڑنا نہیں چاہتے مگر جھگڑا ہو جاتا ہے۔ زیادہ تر احساس کمتری کا شکار رہتے ہیں۔ کبھی کبھی وقت میں تبدیلی یا مزاج کی تبدیلی کے لئے کہانیاں پڑھ لیتے ہیں۔ کھیل سے دلچسپی رکھتے ہیں مگر دیکھنے کی حد تک ذاتی طور پر کھیلنا ان کا شوق نہیں ہوتا۔ کھانے میں جو مل جائے کھا لیتے ہیں زیادہ تر لوگ دال چاول پسند کرتے ہیں۔ موقع محل کے مطابق اپنے لباس کا انتخاب کرتے ہیں۔ شخصیت زیادہ ہر دلعزیز نہیں ہوتی مگر اکثر لوگوں کی کوئی ایک خوبی انہیں نمایاں کر ہی جاتی ہے۔

طوطا رنگ:

یہ لوگ کم گفتگو کرتے ہیں، سلجھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ مگر 10٪ شکل اور حلیئے سے سلجھے ہوئے دکھائی نہیں دیتے، موسیقی سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ کھیل کھیلنا پسند کرتے ہیں۔ مطالعہ سے علم میں اضافہ کرتے ہیں صرف کتابی کیڑے نہیں ہوتے پرانی موسیقی سنتے ہیں۔ ہر طرح کا فیشن کرتے ہیں۔ پودوں سے بھی خاص انس رکھتے ہیں۔ 10٪ مصور بھی بن جاتے ہیں۔

براؤن:

یہ رنگ دوستی کو ظاہر کرتا ہے۔ اس رنگ کو پسند کرنے والے سنجیدہ، مخلص اور دوست بنانے والے لوگ ہوتے ہیں۔ یہ لوگ قدرتی نظاروں کو پسند کرتے ہیں اور خوب لطف اٹھاتے ہیں۔ اکثر سیاحت پسند ہوتے ہیں اور سفر نامے لکھ ڈالتے ہیں۔

پیلا:

یہ تصور اور خیال کو ظاہر کرتا ہے۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ یہ جدائی کا رنگ ہے اور نفرت کا رنگ ہے۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں ہوتی اس رنگ کو پسند کرنے والے اکثر باتونی ہوتے ہیں اور بس باتوں باتوں میں دوسروں کے لئے ناگواری پیدا کر دیتے ہیں۔ مگر اس عادت کی اصلاح کی جا سکتی ہے یہ لوگ چالاک ہوتے ہیں۔ مشکلات پر قابو پانے کے لئے ماہر ہوتے ہیں اور مشکلات کبھی اپنے اوپر حاوی نہیں کرتے۔

کالا رنگ:

یہ رنگ بنیادی طور پر سنجیدگی کو ظاہر کرتا ہے۔ جو لوگ کالا رنگ پسند کرتے ہیں وہ وفادار، من موجی اور باحوصلہ ہوتے ہیں یہ رنگ دوسروں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے میں ماہر ہوتا ہے۔ ایسے لوگ جنہیں کالا رنگ پسند ہوتا ہے ہر جگہ ہر کام سے فائدہ اٹھاتے ہیں یہ لوگ اپنی رائے دوسروں کو سنجیدگی سے دیتے ہیں۔ کبھی انہوں نے دوسروں سے بے جا مزاق نہیں کیا جس کے باعث کسی کو نقصان اٹھانا پڑے۔ فیشن ایبل ہوتے ہیں اور اسی لئے ہر محفل میں نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ 50٪ باتونی اور 50٪ خاموش طبع ہوتے ہیں۔ زیادہ صرف مسکراہٹ پر اکتفا کرتے ہیں۔

سفید:

سفید رنگ پاکیزگی کا رنگ ہے۔ سفید رنگ کو پسند کرنے والے لوگ اعلیٰ taste کے مالک ہوتے ہیں، مہربان ہوتے ہیں، سنجیدہ، مخلص اور محب وطن ہوتے ہیں۔ صفائی کو بہت پسند کرتے ہیں اور دنیا میں نام پیدا کرنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ شفیق استاد ہوتے ہیں اپنے کام میں امانت داری سے کام لیتے ہیں۔ نفرت سے گریز کرتے ہیں لیکن جس سے نفرت ہوجائے اس سے بات کرنا پسند نہیں کرتے مگر صرف 80% لوگ۔ 20% لوگ دل سے نفرت نہیں کرتے ایسے لوگ کسی کو بد دعا نہیں دیتے، دوستی کا اظہار کھلم کھلا کرتے ہیں مگر محبت کا اظہار ان کے لئے جوئے شیر لانے کے برابر ہے۔ وہمی ہوتے ہیں اپنے لباس اور شخصیت کے معاملے میں حساس ہوتے ہیں۔

سرخ رنگ:

سرخ رنگ جوانی، بہادری، خودداری کو ظاہر کرتا ہے۔ اس رنگ کو پسند کرنے والے لوگ بھی نڈر، بہادر اور باحوصلہ افراد ہوتے ہیں۔ ذہین ہوتے ہیں اور اکثر سائنس کے طالب علم اور سائنس کے استاد بنتے ہیں۔ پامسٹری کے ماہر ہوتے ہیں، علم سے گہرا شغف رکھتے ہیں مگر مطالعہ سے حتی الوسع جان چھڑاتے ہیں۔ بہت کم لڑتے ہیں اگر خود غرض ہونے لگیں تو لمحہ ضائع نہیں کرتے اپنے لباس کے معاملے میں انتخاب بہتر سے بہتر کرتے ہیں یعنی لباس کے معاملے میں بے حد سلیقہ مند ہوتے ہیں اور یہ کپڑوں کی ڈیزائننگ کے باعث اپنی جگہ ہر محفل میں بنائے رکھتے ہیں اگر یہ کہا جائے کہ سرخ رنگ کے پسند کرنے والے اچھے خطاط اور مصور بھی ہوتے ہیں تو غلط نہیں مگر اکثر غلطیاں کرتے ہیں جن کے باعث بعد میں دکھ اٹھاتے ہیں۔

فیروزی رنگ:

بالکل سنجیدہ نہیں ہوتے، فیروزی رنگ پسند کرنے والے ہر وقت بننے بنانے میں لگے رہتے ہیں۔ بہت کم تنہائی میں بیٹھتے ہیں یہ لوگ زیادہ تر سب کے درمیان بیٹھنا پسند کرتے ہیں۔ کامیڈی سے خوب لگاؤ ہوتا ہے۔ ٹریجڈی سے بھاگتے ہیں۔ 10% لوگ ڈائری لکھتے ہیں۔ کھیل دیکھنے کی حد تک پسند کرتے ہیں۔

آف وائٹ:

یہ رنگ پسند کرنے والے خود پسند ہوتے ہیں۔ ہر چیز کی خواہش اور دیکھنے کی استطاعت

صرف اپنی ذات تک محدود رکھتے ہیں۔ نفیس ہوتے ہیں اور نفاست پسند کرتے ہیں۔ لکی ہوتے ہیں اور کبھی کبھی حسد کی آگ میں جلتے ہیں۔ اپنی تعریف کروانے کی خواہش رکھتے ہیں اور خود جلد کسی کی تعریف نہیں کرتے ان کی خواہش ہوتی ہے یہ سب کو مات دیں مگر کبھی کبھی یہ خود پیچھے رہ جاتے ہیں۔

غالب کے ہاں بعض الفاظ بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ رنگوں میں ان کی Fixation سرخ، سبز اور سیاہ رنگ کے ساتھ ہے۔ ان میں سرخ و سیاہ کو بہت اہمیت ہے۔ خون اور اس کے متعلقات کا غالب کی جنسی زندگی سے کیا رشتہ ہے؟ ان کی جنسی زندگی کی تفصیلات معلوم نہیں، اس لئے ان علامتی الفاظ کے جنسی سیاق و سباق سے قطع نظر، شہدائے کربلا کی شہادت اور اپنی مظلومی کے درمیان معنوی رشتے کی تلاش و جستجو غالب کو سرخ رنگ سے وابستہ رکھتی ہے۔ غالب کی خود رحمی کی یہ ایک رفیع صورت ہے جس میں وہ اپنی زندگی کے معمولی واقعات کو کربلا سے مماثل کر دکھاتے ہیں۔ شہادت، خون شہیداں، بسمل کے تلازمات، غالب کے ذاتی کرب کا وہ اظہار ہے جس کی جھلکیاں ہمیں لکھنوی دبستان کے شعراء کی غزلوں میں ملتی ہیں لیکن غالب کی سرخ رنگ سے چسپیدگی اس کے علاوہ بھی توجہ طلب نکات رکھتی ہے۔ ان کے ہاں سرخ کا ایک رشتہ سیاہ رنگ کے ساتھ بھی ہے، وہ سرخ کو سیاہ میں تبدیل ہوتے دیکھتے ہیں، سرخی کا انجام روشنی نہیں تاریکی ہے۔ لہو کا شہادت تک، بسمل کا مرگ تک، حنا کا داغ تک، گل لالہ کی چمک دمک کا داغِ لالہ سے، روشنی کا دھوئیں سے ربط اور خون کا تاریکی سے ایک سلسلہ قائم ہے۔

ہزاروں دل دیئے جوشِ جنونِ عشق نے مجھ کو
سیہ ہو کر سویدا ہو گیا، ہر قطرۂ خوں تن میں

ڈاکٹر وحید قریشی، "غالب اور اس کا ماحول" اردو، جلد 45، شمارہ 1، ص 410۔

ایک سوشل ورکر سے ایک انٹرویو

محمد خالد - بی ایڈ (131-E)

آج ہم جس مہمان سے شرف ملاقات حاصل کر رہے ہیں اس کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ لانبی لانبی ٹانگیں جیسے لکی ایرانی سرکس کا کوئی لانگ مین ہو۔ آواز بالکل جیٹ طیارے کی سی سخت ناگوار، اندھیرے میں دیکھنے کی صلاحیت ایسی کہ جیسے آبدوز زیر آب بحری جہاز کو بھی ڈھونڈ لیتی ہے افریقہ کی مخلوقات کی طرح خوبصورت کالا بھجنگ، انسانیت کی خدمت کا مدعی، کہ ایک بار اس نے نمرود کے دماغ میں گھس کر اس کا غرور توڑا۔ پھر وہ رات کو غفلت کی نیند سونے والوں کو جگاتا ہے تاکہ وہ عبادت کریں اور عبادت کرنے والوں کو کاٹتا نہیں بلکہ ان کے پاؤں چھوتا اور خون اس لئے پیتا ہے کہ نیک آدمی ہیں۔

اس مختصر تعارف کے بعد یقیناً آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ ہماری آج کی مہمان شخصیت کون ہے۔ جی ہاں، ہمارے آج کے مہمان ہیں جناب مچھر صاحب آج بڑی مشکل سے ان سے تھوڑا سا وقت لیا ہے تاکہ قارئین کو بھی ان کی خدمات سے آگاہ کیا جاسکے۔ کیونکہ وہ آج کل بہت مصروف ہیں۔ تو لیجئے انٹرویو حاضر خدمت ہے۔

سوال۔ جی مچھر صاحب! ہم آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ سنائیے کیسے ہیں آپ؟

ج۔ خدا کا شکر ہے میں بالکل ٹھیک ہوں اور اس میں میرا اتنا کمال نہیں جتنا آپ کے تعاون کا۔

سوال۔ آپ کی تعلیم؟

ج۔ چھوڑیے جی تعلیم میں کیا رکھا ہے۔ آج تو لوگ اپروچ کو دیکھتے ہیں۔ اور میری اپروچ ہر کسی تک ہے۔ ویسے اگر آپ صرف پڑھے لکھے لوگوں سے ہی انٹرویو لیتے ہیں تو بتائے دیتا ہوں کہ بندہ بھی باف ایم۔اے ہے۔ جسے آپ کے محکمہ تعلیم والے مڈل کہہ کر پکارتے ہیں۔ میں نے ملیریا میں سپیشیلائز کیا ہے۔ لیکن میری ڈگری کاغذی نہیں، میرا علم اس کے عین مطابق ہے۔

سوال۔ اپنی آج کل کی مصروفیات کے بارے میں بتائیں؟

ج۔ آج کل میں بہت مصروف ہوں، بلکہ خصوصی مشن پر ہوں۔ میرے کام میں بہت سے ساتھی ہیں جو پورے ملک میں مصروفِ کار ہیں اور "ملیریا پھیلاؤ" مہم میں بھرپور کردار ادا کر رہے ہیں۔ دیانت اور محنت ہمارا شیوہ ہے۔ میری مصروفیت کی بڑی وجہ ایک یہ ہے کہ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے اور کام بہت زیادہ۔ کیونکہ ایک تو نوعِ آدم نے اپنی آبادی میں بہت زیادہ اضافہ کر لیا ہے دوسرے دن لمبے ہیں اور راتیں چھوٹی۔ چونکہ ہمارا کام زیادہ تر رات کا ہے اس لئے بہت محنت کرنا پڑتی ہے۔

سوال۔ آپ کی اچھی صحت کا راز؟

ج۔ آپ نے کبھی موٹے تازے سیاسی وڈیروں اور انتظامی لٹیروں سے پوچھا ہے؟ نہیں، تو اچھا میں بتائے دیتا ہوں کہ وہ اس قدر صحت مند کیوں ہوتے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ بھی عوام کا خون پیتے ہیں۔ باہر سے غیبی امداد آتی ہے بوجھ عوام پر ہوتا ہے مگر زیادہ تر کھا یہ جاتے ہیں۔ اس لئے کہ لوگوں کا خون پینے کی اپنی ایک لذت ہے لہذا میں بھی اپنی صحت کو برقرار رکھنے کے لئے لوگوں کا خون پیتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں رات بھر ان تھک کام کرتا ہوں۔ پھر میں مساوات کا قائل ہوں۔ امیر ہو یا غریب نیک ہو یا بد سب کا خون پیتا ہوں۔ سیاسی و انتظامی لٹیروں کی طرح نہیں کہ بڑوں کو چھوڑ دیا اور غریبوں کو نشانہ بنا لیا۔

سوال۔ موسموں میں آپ کو کون سا موسم اچھا لگتا ہے؟

ج۔ مجھے برسات کا موسم بہت اچھا لگتا ہے۔ کیونکہ یہ ہمارے لئے بہار کا موسم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس موسم میں مَیں اور میری بیوی یہ گانا اکثر گنگناتے ہیں۔ "آئے موسم رنگیلے سہانے جیا نہ ہی مانے تو چھٹی لے کے آجا مچھرا"۔

سوال۔ آپ کی ریذیڈنسی کہاں ہے؟

ج۔ جناب ریذیڈنسی تو ان بڑی قوتوں کے سفارتی مقام ہوتے ہیں جو چھوٹے ملکوں کا خون پینے کے لئے رکھے جاتے ہیں۔ میری تو رہائش ہے وہ بھی بہت سادہ، جہاں کہیں گندہ پانی نظر آیا ہے میں وہیں پر بسیرا کر لیتا ہوں۔ اور پھر میری عمر ہی کتنی ہے کہ میں ریذیڈینسیاں بناتا پھروں

عمرِ فانی میں مستقل رہائش کا کیا تصور۔ مجھے تو 12 دن ہی گذارنے ہوتے ہیں۔ بھلا ہو نکاسی آب والوں کا نکاسی کا کم اور میری رہائش کا خاص بندوبست کرتے ہیں میں ان کا احسان مند ہوں کہ انہوں نے مجھے اس تردد سے۔بے فکر کر رکھا ہے۔

سوال۔ آپ کا محبوب مشغلہ ؟

ج۔ میرا سب سے محبوب مشغلہ لوگوں کو خوابِ خرگوش سے جگانا ہے۔ مجھے وہ لوگ بہت بُرے لگتے ہیں جو اپنے گھوڑے اور اونٹ بیچ کر سوتے ہیں۔ اور خدا کی عبادت نہیں کرتے، حالانکہ مانتے ہیں

وما خلقت الجن والانس الایعبدون.

سوال۔ آپ کے بارے میں سنا ہے کہ آپ سگریٹ نوشی بہت کرتے ہیں۔ کیا آپ اسے چھوڑ نہیں سکتے ؟

ج۔ کیا کہا آپ نے؟ میں سگریٹ نوشی چھوڑ دوں، میں اگر یہ چھوڑ دوں تو انسان کو کون ترغیب دے گا پھر میں سگریٹ تو چھوڑ سکتا ہوں لیکن نوشی کو نہیں چھوڑ سکتا۔ کیوکہ نوشی تو میری بیوی ہے۔ اس کے بغیر میں کیسے رہ سکتا ہوں۔

سوال۔ آپ کو عوام میں سے کسی جماعت یا گروہ سے کوئی شکایت ہے؟

ج۔ آہ! کس کس سے شکایت کی جائے۔ مجھے سب سے زیادہ شکایت ہے ان ڈاکٹر صاحبان سے جو مک مکا نہیں کرتے اور جعلی دوائیاں تجویز نہیں کرتے حالانکہ ہم ان کی آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ ہیں۔ پھر مجھے شکایت ہے ان کمپنیوں سے جو مختلف قسم کے خالص میٹس بناتی ہیں اور ملاوٹ نہیں کرتیں۔ ان کو ہمارے ساتھ خدا واسطے کا بیر ہے۔ حالانکہ ہم بھی خدا کی مخلوق ہیں۔ پھر مجھے شکایت ہے گرم ہوا سے جو میری موت کا پیغام بنتی ہے۔ مجھے شکایت ہے ایسے عوام سے جو ہفتۂ صفائی منانے لگ جاتے ہیں۔ نادیدے کہیں کے!

سوال۔ آپ سیاست میں حصہ کیوں نہیں لیتے؟

ج۔ معاف کرنا بھائی مجھے سیاست کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ کے سیاستدان خود ہی میری راہ ہموار کرتے ہیں۔ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم محلے سے گندگی کے ڈھیروں کا خاتمہ کر دیں

گے لیکن ہوتے کبھی نہیں۔ اب ان بھلے مانسوں سے کوئی یہ پوچھے کہ دعویٰ کرنے سے کیا گندگی کے ڈھیر ختم ہوئے ہیں۔ میں تو قول و فعل کا پکا ہوں۔ دھوکا کر نہیں سکتا۔ رات کو آپ کی برادری پر حملہ کرتا ہوں تو بھی الٹی میٹم دے کر۔ اس لئے یہ سیاست میرے بس کی بات نہیں۔

سوال۔ آپ کی زندگی کا تاریک ترین دن ؟

ج۔ میری زندگی کا تاریک ترین دن وہ ہے جس دن مٹی کا تیل دریافت ہوا جو انسان کے لئے روشنی کا منبع مگر میرے لئے موت کا پیام ہے۔

سوال۔ آپ کی شدید ترین خواہش ؟

ج۔ کاش کہ دنیا کا وہ ہر انسان جو انسان کے روپ میں انسان کا خون پیتا ہے، مچھر ہی بن جائے اور ان بہروپیوں کا بھید کھل جائے۔

سوال۔ آپ عوام کو کوئی پیغام دینا چاہیں گے ؟

ج۔ عوام کے نام میں یہ پیغام دینا چاہوں گا کہ وہ جعلی اور لالچی ڈاکٹروں کے پاس جا کر مہنگے داموں دوائی خریدا کریں حفظانِ صحت کے اصولوں کی پیروی نہ کریں۔ مچھر کے خاتمے کا مصنوعی بندوبست جاری رکھیں۔ رات کو سوتے وقت اپنے چہرے، پاؤں اور ہاتھوں پر تھوڑا سا مٹی کا تیل ہرگز نہ ملا کریں۔ خود گندا رہا کریں اور گندے پانی کو جوں کا توں رہنے دیں۔ تاکہ میری افزائش بڑھتی رہے۔ اور پھر

کاٹوں گا میں لوگوں کو
گندہ رہنے والوں کو
شکریہ۔

سوال۔ اب آپ جلدی سے آخری سوال کا جواب دے دیجئے کہ ....

مچھر۔ اب میں آپ کے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔ وہ دیکھئے سامنے سے ہوا آرہی ہے میں جارہا ہوں نہیں تو میں ....۔

ارے مچھر صاحب! ارے ارے۔ میں نے کہا سنیئے تو۔ میرا مطلب ہے وہ وہ..........۔

گرین ہاؤس، اثر

(Green House Effect)

صائمہ بشیر بی ایڈ (741)

گرین ہاؤس کیا ہے؟

گرین ہاؤس ایک کمرہ ہے جس کی دیواریں اور چھت شیشے یا شفاف پلاسٹک کی ہوتی ہیں یہ پودے اگانے کے لئے استعمال ہوتا ہے کیونکہ اس میں سورج کی روشنی آسانی سے گزر سکتی ہے۔ شیشے کی دیواروں سے سورج کی روشنی گرین ہاؤس میں داخل تو جاتی ہے لیکن اندر سے باہر نہیں آسکتی۔ کیونکہ ہوا کی آمد و رفت کا راستہ موجود نہیں ہوتا نتیجتاً گرین ہاؤس کے اندر درجہ حرارت بڑھتا رہتا ہے۔ گرین ہاؤس موسمِ سرما میں پودوں کو اگانے کے لئے بہترین جگہ ہے۔

آئیے اب دیکھتے ہیں کہ انسان نے ایسا کرنا کہاں سے سیکھا؟

کرۂ ہوائی میں چند گیسوں مثلاً کاربن ڈائی آکسائیڈ، آبی بخارات اور میتھین کا آمیزہ بالکل اس طرح عمل کرتا ہے کہ گیسوں کا یہ آمیزہ سورج سے نکلنے والی چھوٹی طول موج کی شعاعوں کو اپنے میں گزرنے دیتا ہے جو سطح زمین پر پہنچ کر اس کو گرم کر دیتی ہیں۔ لیکن رات کے وقت زمین کی سطح ٹھنڈی ہوتے وقت صرف لمبی طول موج والی شعاعوں (Infra Red Rays) کو واپس کرہ ہوائی میں بھیجتی ہے۔ یہ گیسیں انفرا ریڈ شعاعوں کو خلا میں واپس بھیجنے کی بجائے اپنے اندر جذب کر لیتی ہیں۔ نتیجتاً گرمی کا قابل ذکر حصہ کرہ ہوائی میں ہی دب کے رہ جاتا ہے جس کے اور سے زمین کی سطح گرم رہتی ہے۔ یہ عمل جو زمین کی سطح کو گرم رکھنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے، گرین ہاؤس اثر کہلاتا ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اگر گرین ہاؤس اثر نہ ہوتا تو زمین کا درجہ حرارت اس درجہ حرارت سے 30 درجے سینٹی گریڈ کم ہوتا جو آج ہے۔

ہم اپنے کرہ ارض کے گرین ہاؤس کے اثر سے کیوں پریشان ہو رہے ہیں؟

عہد حاضر کی ترقی یافتہ سوسائٹی میں بعض انسانی سرگرمیاں ایسی ہیں جو گرین ہاؤس اثر سے قائم شدہ توازن کو خراب کر رہی ہیں۔ یہ توازن اس لئے بگڑا ہے کہ وہ اسباب جن سے کاربن ڈائی آکسائیڈ پیدا ہوتی یا ختم ہوتی ہے توازن میں نہیں رہے۔ ان اسباب میں زیادہ قابل ذکر کوئلے، پٹرول اور قدرتی گیس جیسے ایندھنوں کے استعمال کی روزمرہ بڑھتی ہوئی مقدار ہے جو روز بروز کاربن ڈائی آکسائیڈ کی مقدار میں اضافہ کر رہی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ان ایندھنوں کے جلنے سے 18000 ملین ٹن کاربن ڈائی آکسائیڈ سالانہ پیدا ہوتی ہے لیکن دوسری طرف جنگل کاٹ کاٹ کر فصلیں بونے کے لئے کھیت بنائے جا رہے ہیں۔ اس عمل سے بھی ہوا میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کی مقدار بڑھ رہی ہے کیونکہ ضیائی تالیف میں درخت ان فصلوں کی نسبت کہیں زیادہ کاربن ڈائی آکسائیڈ استعمال کر لیتے ہیں۔ سائنسدانوں نے اندازہ لگایا ہے کہ ہمارے کرہ ارض کی فضا میں کاربن ڈائی آکسائیڈ، ایندھن کے جلنے، آبادی کے بڑھنے اور توڑ پھوڑ کی وجہ سے پچھلی صدی میں تقریباً 15 فیصد بڑھ چکی ہے۔

جدید سائنسی تحقیق کے مطابق کاربن ڈائی کے علاوہ کچھ اور کیمیائی مرکبات کا بھی پتہ چلا ہے جو گرین ہاؤس اثر کے توازن کو بگاڑنے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ ان مرکبات میں ہوائی جہازوں اور صنعتی استعمال کے لئے تیار ہونے والے کیمیکل کلورو فلورو کاربنز (CFCS)، میتھین جو قدرتی گیس کا اہم جزو ہے اور نائٹرس آکسائیڈ شامل ہیں۔ نائٹرس آکسائیڈ، کاربن آکسائیڈ کے مقابلے میں 200 گنا سے بھی زیادہ طاقتور ہے اور ہماری فضا کو اس سے صاف کرنے میں ڈیڑھ سو سال کا عرصہ درکار ہے۔ ایک تخمینہ کے مطابق کارخانوں سے اس قسم کا مادہ سات لاکھ ستائیس ہزار ٹن سالانہ خارج ہوتا ہے لیکن ابھی تک کسی حکومت نے اس پر مؤثر طور پر قابو پانے کے لئے اقدامات نہیں کئے۔

ہوا میں ان گیسوں کی بڑھتی ہوئی مقدار اپنے اندر مزید حرارت جذب کر کے زمین کے درجہ حرارت میں اضافے کا سبب بن رہی ہے اور یہ عمل تمام روئے زمین پر جاری ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اگلے تیس سالوں میں زمین کا درجہ حرارت 1.5°C - 1° تک بڑھ جائے گا۔ تصور کریں کہ ہماری زمین کے تمام سمندروں کا درجہ حرارت ایک ڈگری تک بڑھانے کے لئے کتنے کوانٹم

توانائی درکار ہوگی یقیناً یہ حرارت کی ایک بہت بڑی مقدار ہو گی۔
انٹر نیشنل بنیادوں پر زمین کے درجہ حرارت میں اضافہ کچھ خدشات کو جنم دیتا ہے جو مندرجہ ذیل ہیں۔

1۔ سطح سمندر کا بلند ہونا:

اگر درجہ حرارت بڑھنے کا یہ عمل مناسب وقت پر نہ رکا تو پہاڑوں، گلیشئرز اور قطبین پر موجود برف پگھل کر سمندر تک پہنچ جائے گی جس سے سمندر کی سطح بلند ہو گی اور بہت سے گنجان آباد جزائر زیر آب آجائیں گے۔ پیش گوئی کی گئی ہے کہ اگلے 40 سالوں میں سمندر کی سطح 1.5 میٹر تک بلند ہونے کا امکان ہے۔

2۔ موسموں میں تغیر و تبدل:

سمندر کی سطح میں اضافہ موسموں کے تغیر و تبدل کی وجہ بھی بن سکتا ہے پیشگوئی کی گئی ہے کہ موسموں میں بڑی شدت سے بار بار تبدیلیاں آئیں گی جس سے طوفان سیلاب اور سائکلون آئیں گے۔

3۔ ماحولیات میں تبدیلی:

درجہ حرارت میں اضافہ کی وجہ سے سمندر سے زیادہ سے زیادہ بخارات بنیں گے اور ان کی وجہ سے مرطوب علاقوں میں بارشوں میں اضافہ ہوگا۔ بلند ہوتے ہوئے سمندر، اٹھتے ہوئے طوفان اور آندھیاں، آب و ہوا میں شدید تبدیلیاں ماحول کو اس قدر مختلف بنا دیں گی کہ جانوروں اور پودوں کو اس نئے ماحول میں زندہ رہنے کے لئے بڑی مشکلات پیش آ سکتی ہیں جس کے نتائج خوفناک بھی ہوسکتے ہیں۔

گرین ہاؤس اثر کے نقصانات سے بچاؤ کے لئے حفاظتی اقدامات:

گرین ہاؤس اثر کے نقصانات سے بچاؤ کے لئے جن حفاظتی اقدامات کی ضرورت ہے ان میں سے چند ایک مندرجہ ذیل ہیں۔

1۔ عالمی سطح پر اس مسئلہ کو مناسب طور پر اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔
2۔ صرف ماہرینِ موسمیات اور ماہرینِ ماحولیات کو اس مسئلے کی طرف توجہ نہیں دینی چاہیے بلکہ حکومتی عہدیداران کا بھی فرض ہے کہ وہ اس مسئلے کے حل کے لئے بھرپور کوششیں کریں۔

3۔ عوام میں ماحول کی حفاظت کا شعور بیدار کرنے کی ضرورت ہے۔

4۔ درخت اس مسئلے کی روک تھام کے لئے سب سے زیادہ مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ درخت لگائیں اور جنگلات کو کٹنے اور جلنے سے بچائیں۔

5۔ توانائی کے حصول کے مائع فوسل فیولز (پٹرول اور قدرتی گیس) جیسے ایندھنوں کی بجائے سولر انرجی، ہوا اور سمندر کی لہروں سے حاصل شدہ توانائی پر انحصار کرنا چاہیے۔ ایک اندازے کے مطابق ایک کیوبک فٹ سمندری پانی سے دس ٹن کوئلے کے برابر توانائی حاصل کی جا سکتی ہے۔

6۔ گاڑیوں میں ایسے آلات نصب ہونے چاہیں جو ان سے نکلنے والے زہریلے دھوئیں کو نسبتاً کم زہریلے مرکبات میں تبدیل کر سکیں۔

7۔ زہریلے مادے خارج کرنے والی فیکٹریوں میں ری سائکلنگ پلانٹ لگانے چاہیں جو ویسٹ پراڈکٹس کو "ری سائیکل" کر کے قابل استعمال مرکبات میں تبدیل کر سکیں۔

8۔ کوئلہ جو فضا میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کی زیادتی کا سب سے بڑا سبب ہے اس کا استعمال کم کر دینا چاہیے۔

گلوبل وارمنگ حقیقتاً بہت بڑا مسئلہ ہے جو ہماری زمین کو تباہی کے دہانے کی طرف دھکیل رہا ہے۔ ہمیں اپنے سیارے پر زندگی کو محفوظ بنانے کے لئے اس کے ماحول کو مزید نقصان سے بچانا ہوگا۔

تفریح میں بُری صحبت سے پرہیز لازم ہے۔ یاد رکھیئے، آپ تجارت اور عبادت تو کسی کے ساتھ بھی کر سکتے ہیں لیکن تاش صرف اشرافوں کے ساتھ کھیلنے چاہئیں۔ ہرہیں نہیں، یورپ میں بھی اس فرق کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ وہاں بڑے سے بڑے اسٹاک ایکسچینج اور گرجا میں ہر کس و ناکس کو بے روک ٹوک جانے کی اجازت ہے مگر کلب اور کیسنو (قمار خانہ) میں فقط خاندانی شرفا بار پاتے ہیں۔

(مشتاق یوسفی، چراغ تلے، ص 134)

شعریات

ا) غزلیں

- ڈاکٹر شمیم حیدر ترمذی
- محمد ظفر آشام قتالپوری

ب) نظمیں

- تعلیم و تربیت کا ایک روپ — پروفیسر تاثیر وجدان
- آج کا بابیل — ڈاکٹر شمیم حیدر ترمذی
- تمہیں میں سوچتا ہوں — شہباز حمید (بی-ایڈ)
- ایجوکیشن کالج — محمد افضل خالد
- اج کل دے ایہہ منڈے جھلے — طاہر مجید بھٹی

غزل

ڈاکٹر شمیم حیدر ترمذی

امتیازِ بام و در، نے التزامِ ماہ و سال
ہر جتن، ہر کام کا، اپنا ثمر، اپنا مآل

آگہی کی رُت میں دیتی ہے جُدائی بھی مزہ
حیرتوں کے حَبس میں کیسی طلب، کیسا وصال!

دانۂ جُو، معصوم چڑیا، کیوں بنی رزقِ عقاب؟
گھونسلے میں، بھوک سے بلکان، بچے کا سوال

اوڑھ رکھی ہے ردائے دوش ہم نے جسم پر
آسماں والے کو سب معلوم ہے فردا کا حال

شب کا سناٹا، حَرِیم نینوا، بُجھتا دیا
رہبروں کے واسطے، ہر دور میں، روشن مثال

بے وقار آزادی، ہم غریب ملکوں کی
سر پہ تاج رکھتے ہیں، بیڑیاں ہیں پاؤں میں
(احمد ندیم قاسمی)

غزل

محمد ظفر آشام قتالپوری
رولنمبر 161، بی ایڈ

وعدہ ہے کل کا، آنکھوں کی لاچاری بڑھتی جاتی ہے
یہ کیسی رات ہے جو آفت کی ماری بڑھتی جاتی ہے
اچھا ہے رقیبوں کا رہ رہ کر ہم پہ وار کیے جانا
ان کی اس بات سے پیار میں بات ہماری بڑھتی جاتی ہے
رونا تو یہی ہے جس کے لئے ہم نے اس دل کو وار دیا
اب اُس ظالم کی غیروں سے دلداری بڑھتی جاتی ہے
زندہ ہوں بن جاناں کہ یہ جیون بھی کیا جیون جب
جتنا بھی علاجِ دل کرلیں بیماری بڑھتی جاتی ہے
کیا پیار کہاں کی دلداری، ہم ساری رسمیں بھول گئے
اب رسمِ عشق میں بھی رسمِ بازاری بڑھتی جاتی ہے
ہم نقد دل و جاں کی بازی آشام یہ سوچ کے ہار گئے
منزل اس وقت ہی ملتی ہے جب خواری بڑھتی جاتی ہے.

أُعْجُوبہ: ع.....مایُعجَبُ بہ: یعنی وہ چیز جس پر تعجب کیا جائے۔ جیسے اُضْحُوکہ، اُغْلُوطہ، اُعْلُومَہ وغیرہ۔ اُعْجُوبَہ، انوکھا، نادر

شاخِ سیمیں، شاخ اُعْجُوبہ ہے، باغِ حسن میں
انگلیاں انگور کی ہیں، سیبِ ترکی ایڑیاں

داغ

تعلیم و تربیت کا ایک روپ

از پروفیسر (ریٹائرڈ) تاثیر وجدان

(ایک ایسے شاعر کا ذاتی تاثر جو حسنِ اتفاق سے ایک کامیاب معلم بھی رہا اور ایک تجربہ کار ماہر تعلیم بھی)

سیرِ گل کے شوق میں نکلے ہوئے اے راہرو!
درسگاہِ نور کے علمی گلستانوں میں آ
دیکھ آکر سرکشیدہ، سبز پودوں کی بہار
تازہ ذہنوں کی نئی بالیدگی کے سَروزار
علم کی ضوپاش رُت ہے چار سو چھائی ہوئی
روحِ نوخیزی ہے اپنے جوش پر آئی ہوئی
عصرِ نو کی خام نسلیں، سبز بیجوں کی مثال
جن کے اندر ہے جہانِ برگ گل سمٹا ہوا
جن کی فطرت میں ابلتا ہوا تقاضائے نمود
درسگاہِ نور ان بیجوں کو دیتی ہے کشود
اور ان کے نازِ مخفی سے الٹتی ہے نقاب
جاں میں خوابیدہ تمنا کو جگاتے ہیں یہاں
کشتِ دل کو سینچ کر قابل بناتے ہیں یہاں
حرفِ سچائی کے باطن میں اگاتے ہیں یہاں
نونہالانِ وطن کی پرورش گاہ کریم
جس کے گہوارے میں ہیں فردا کے موسم محو خواب
جس کی مٹی میں ہے نادیدہ زمانوں کی بہار
روز و شب نشو و نما کی رہ پہ ہے محو سفر
یہ سفر ہو جگمگاتی منزلوں سے ہمکنار
یہ سفر اس کا سپردِ رحمتِ پروردگار

آج کا ہابیل

ڈاکٹر شمیم حیدر ترمذی

زمیں زاد ہوں
میری ماں مجھ سے خوش ہے
کہ میں نے اُسی کے لئے
رنگ کو، نسل کو، رزم کے ڈھنگ کو تج دیا ہے۔

میں ہابیل ہوں، آج کے دور کا
اپنے ہاتھوں پہ، خلقِ خدا کے لئے، کوزۂ شیر ہر دم اٹھائے ہوئے
اَدھ جلی بالیوں اور بوسیدہ پستوں سے دامانِ دل کو بچائے ہوئے
میں ظالم نہیں ہوں، میں جاہل نہیں
اپنے ہم زاد سے، عکسِ قابیل سے، ہر طرح مختلف ہوں

— — — — —

بتاؤ کہ میں ایسے ہم زاد کا ساتھ کیسے نبھاؤں؟
جو قدروں کی شہ رگ پہ خنجر چلا کر، صحیفے جلا کر
مجھے قتل کرنے میں آسودگی ڈھونڈتا ہے
سمجھتا ہے دنیا میں وہ سُرخ رُو ہے
اور اک روز چہرے کے ہر داغ پر لاکھ تارے سجیں گے

— — — — —

مری پاک ماں نے مجھے دودھ بخشا
جہاں ہوں، میں خوش ہوں
اگر کھوج میں میرے، ہم زاد نکلے، ہتھیلی پہ سورج اٹھائے
بدن پر مساوات کے رنگ مل کر

نفس میں معطر عقائد بسائے، مرے گھر تک آئے
ہزار آستیں کے لہو کو چھپائے
میں پہچان لوں گا
تعدی کے شہکار
ماضی کے عفریب، شاطر اداکار کو صاف پہچان لوں گا
فریبِ نظر کا اب امکاں نہیں ہے

امراء القیس نے اسلام سے چالیس سال پہلے کا زمانہ پایا ہے روایت ہمیں بتاتی ہے کہ جناب پیغمبر صلعم نے اس کی نسبت ایک موقع پر یہ رائے ظاہر فرمائی:

اشعر الشعراء و قائدھم الی النار

یعنی وہ شاعروں کا سرتاج تو ہے لیکن جہنم کے مرحلے میں ان سب کا سپہ سالار ہو گا۔

لیکن

ایک دفعہ قبیلہ بنو عبس کے مشہور شاعر عنترہ کا یہ شعر حضرت رسول کریم ﷺ کو سنایا گیا:

ولقد ابیت علی الطویٰ و اظلّه
حتّی انال به کریمه الماکل

(میں نے بہت سی راتیں محنت و مشقت میں بسر کی ہیں اکلِ حلال کے قابل ہو سکوں)

رسول اللہ ﷺ اس شعر کو سن کے بے انتہا محظوظ ہوئے اور صحابہ کرامؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"کسی عرب کی تعریف نے میرے دل میں اس کا شوقِ ملاقات نہیں پیدا کیا، لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ اس شعر کے نگارندہ کے دیکھنے کو میرا دل بے اختیار چاہتا ہے۔"

(اقبال اور جمالیات، ص324)

نظم

تمہیں میں سوچتا ہوں!

شہباز حمید ساحر
رولنمبر 278، بی ایڈ

تمہیں میں سوچتا ہوں
چاہتا ہوں
خدا سے بس تمہیں ہی مانگتا ہوں
غرض اس میں نہیں پوشیدہ کوئی
نہ ہے جذبات کی تسکین سے مطلب
نہ ہے درکار کوئی جاہ و منصب
نہ تم سے فائدہ میں چاہتا ہوں
نہ اپنی بے توازن زندگی کا
میں تم سے فائدہ یہی چاہتا ہوں
تمہیں میں مانگتا ہوں کیوں خدا سے
جواب اس کا بہت سادہ ہے جاناں
کہ میں اپنی ذات کی تکمیل پاؤں
میں اپنے خواب کی تعبیر پاؤں
کہ میری روح اپنا جسم پائے
مرا بے نام سا جیون بھی اک دن
تمہاری شکل میں اک اسم پائے
تمہیں میں اس لئے بس چاہتا ہوں
تمہیں میں اس لئے بس مانگتا ہوں

ایجوکیشن کالج

محمد افضل خالد (131)

امن و محبت کا گہوارا ایجوکیشن کالج
ہم کو اپنی جان سے پیارا ایجوکیشن کالج
سر کے بل دوڑے آئیں گے تیرے چاہنے والے
تم نے جب بھی نام پکارا ایجوکیشن کالج
تعلیم و تربیت صوبے بھر میں سب سے اعلیٰ
علم و عمل کا ہے یہ دھارا ایجوکیشن کالج
علم، عمل، کردار کے پیکر سب اس کے استاد
بے علمی کو ہے للکارا ایجوکیشن کالج
معمارانِ قوم ہیں اس کے اندر پڑھنے والے
پرچم پاکستان، ستارا ایجوکیشن کالج
اس کے سبزہ زاروں، گلزاروں کی اپنی شان
تیرا ہر اک پھول ہے پیارا ایجوکیشن کالج
قتل و غارت، غنڈہ گردی، بدمعاشی سے پاک
جلسے اور جلوس نہ نعرہ ایجوکیشن کالج
اپنے ہم عصروں میں سب سے اونچی تیری شان
کہیں نہ تجھ سا اور ادارہ ایجوکیشن کالج

اجکل دے ایہ منڈے جھلے

طاہر مجید بھٹی۔ بی۔ ایڈ
160 (B)

ہر کم دیوچ سبھ توں تھلے
چھڈ کتاباں پھردے کلے
اجکل دے ایہ منڈے جھلے

بُریائیاں تو باز نہ آون
کھاون چارے پاسوں کھلے
اجکل دے ایہ منڈے جھلے

ویہل پُنے دا عالم ایہ وے
جا داتا دے بوہے ملے
اجکل دے ایہ منڈے جھلے

کُٹے ٹٹا عشق کریندے
چٹھیاں لکھن بلے بلے
اجکل دے ایہ منڈے جھلے

یار زمانہ ایہ کیہ آیا
پائی پھردے گنے چھلے
اجکل دے ایہ منڈے جھلے

ایہناں تو کیہہ لبھنا جھلیا
ایہ تاں ہور کے نال چلے
اجکل دے ایہ منڈے جھلے

کالجیات

روداد تقاریب | ادارہ

یومِ اقبال

یومِ کشمیر

جشنِ آزادی

فائنل رپورٹ ICF سنٹر | سید سجاد بخاری (ایم۔ایڈ)

روداد تقاریب

ادارہ ہذا میں ہم نصابی سر گرمیوں پر اتنا ہی زور دیا جاتا ہے جتنا کہ نصابی فعالیتوں پر۔ بالخصوص ذہنی فعالیتوں پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور وہ اس لئے کہ ایک تو اپنے طلبہ / طالبات (زیر تربیت اساتذہ) کو اس قسم کی سر گرمیوں کو منعقد کرنے کی تربیت دی جاتی ہے اور دوسرے قومی مسائل اور ملی معاملات پر انہیں ذہنی طور پر بیدار اور متحرک رکھا جاتا ہے۔ اس بنا پر تربیت کے مختصر وقفے کے باوجود یہاں کئی تقاریب کا باقاعدگی سے اہتمام کیا جاتا ہے۔ ذیل میں اس نوع کی چند تقاریب کی روداد پیش کی جاتی ہے۔

ڈاکٹر مختار ظفر
انچارج ٹیوٹوریل سسٹم

یوم اقبال

حکیم الامت اور شاعرِ مشرق علامہ سر محمد اقبال کی تاریخِ پیدائش سے دو دن پہلے اور 120 سال بعد 7 نومبر 1997 کو ادارہ ہذا میں مرحوم پر ایک یادگار تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ یہ تقریب بی ایڈ کلاس کے طلبہ اور طالبات نے الگ الگ منعقد کیں۔ مردانہ حصہ میں یہ لیکچر تھیٹر میں اور زنانہ حصہ میں ریسرچ سنٹر کی بالائی منزل میں منعقد ہوئیں۔ ان دونوں تقاریب کی اجمالی تفصیل ذیل میں دی جاتی ہے۔

مردانہ حصہ میں معروف دانش ور اور شاعر پروفیسر اسلم انصاری کو صدارت کے لئے مدعو کیا گیا تھا۔ جب کہ مشہور ادبی و قلمی شخصیت ڈاکٹر طاہر تونسوی مہمان خصوصی تھے۔ سٹیج سیکریٹری کے فرائض تقریب کے مہتمم ڈاکٹر مختار ظفر نے ادا کئے .... پروفیسر شوکت مغل، پروفیسر عبدالعزیز بلوچ اور پروفیسر محمد سعید احمد نے منصفین کے فرائض انجام دیے ...... طلبہ نے اس ذوق و شوق سے حصہ لیا کہ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔

حسب پروگرام 10.30 بجے صبح کاروائی کا آغاز ہوا۔ حافظ عبدالمجید (رول نمبر 20 سیکشن B) نے تلاوت قرآن مجید کر کے سامعین کو مسحور کیا۔ محمد معصوم رزاقی (229/A) نے علامہ

اقبال مرحوم کے نعتیہ اشعار (..... لوح بھی تو قلم بھی تو ترا وجود الکتاب.......) پیش کر کے حاضرین کو کیفیات وجد سے ہمکنار کیا............ سٹیج سیکٹری نے اس پروگرام کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے باقی پروگرام کا آغاز کیا۔ یہ پروگرام ایک مقالہ اور (اقبال کی) ایک نظم (ترنم سے) کی ترتیب سے مرتب کیا گیا تھا۔ اس ترتیب کے مطابق کامران صدیقی (198/F) نے اقبال اور پاکستان کے عنوان سے ایک موثر مقالہ پیش کیا............ پھر مسعود (34/D) نے "اقبال اور آج کے لئے ان کا پیام" کے موضوع پر ایک خوبصورت مقالہ پیش کیا............ خالد نعیم (104/B) نے "اقبال تیرے دیس کا کیا حال سناؤں" کے مطلع سے ایک مزاحیہ اور تنقیدی نظم پیش کی............ طارق عزیز (157/A) نے "قومی تشخص کی تعمیر میں فکر اقبال کا کردار" کے عنوان سے دلنشیں مقالہ پڑھا............ محمد افضل خان (131/F) نے وجد آفرین ترنم میں اقبال کی نظم پیش کی جس کا پہلا مصرع تھا۔

دریا میں موتی اے موجِ بے باک

سید حماد الرحمن (02/B) نے "اقبال اور خانقاہ" کے عنوان سے فکر انگیز مقالہ پیش کیا۔ یہی مقالہ اول قرار دیا گیا تھا............ ان تمام مقالات کی خوبی یہ تھی کہ ان کے ذریعے فکرِ اقبال کے تناظر میں ہمارے عملی رویوں کا جائزہ لیا گیا تھا۔

آخر میں، مہمان خصوصی، ڈاکٹر طاہر تونسوی نے فکرِ اقبال کے بعض پہلوؤں کی توضیح کر کے طلبہ کو تلقین کی کہ وہ فکر اقبل کو مشعلِ راہ بنائیں .... صاحب صدر جناب اسلم انصاری نے اقبال اور فکر اقبال کا بصیرت افروز جائزہ پیش کیا............ طلبہ کے اصرار پر انہوں نے اپنے اشعار بھی پیش کئے۔ ان کا یہ شعر بہت پسند کیا گیا۔

ہمارے عہد کی نیکی ہے نرمیٔ گفتار

صبا کے لہجے میں حرفِ دلنشیں کہنا

اس تقریب کی یہ خوبی تھی کہ سب شریک طلباء کو انعامات دیے گئے۔ کیونکہ ہر کسی کی کاروائی خوب تھی۔

Female Unit میں تقریب کی صدارت پروفیسر رشیدہ لیاقت (شعبہ اردو) نے کی اور پروفیسر رفعت یاسمین مہمان اعزاز تھیں، .... منصفین کے فرائض پروفیسر شہناز الطاف، پروفیسر زاہدہ رؤف اور پروفیسر عذرا بخاری نے انجام دیئے۔ تقریب کا آغاز سمیرا رفیق کی تلاوتِ

قرآن سے ہوا۔ جویریہ کوکب نے ہدیہ نعت پیش کیا............ باقی پروگرام تین حصوں پر مشتمل تھا۔

کلامِ اقبال (ترنم سے)

تقاریر (بحوالہ فکرِ اقبال)

ٹیبلو بحوالہ تین نظمیں .... ابلیس کی مجلس شوریٰ

عقل و دل

حقیقتِ حسن

کمپیئرنگ کے فرائض دو طالبات نے انجام دیے۔ کلامِ اقبال کی Recitation میں نوشی انجم اور تقاریر میں جویریہ کوکب سٹیج سکیریٹری تھیں۔

جویریہ کوکب نے کلامِ اقبال میں اول انعام حاصل کیا۔ جب کہ تقاریر میں تُبلاخا کوانی نے، سعدیہ، فوزیہ اور شمع نے بھی حصہ لیا۔ جن میں سے سعدیہ نے دوم پوزیشن حاصل کی۔

"ابلیس کی مجلس شوریٰ" کے ٹیبلو میں فوزیہ نے ابلیس اور عطیہ رانی، سعدیہ حبیب، لبنیٰ نصیر چوہدری اور نزہت نے مشیرانِ ابلیس کے کردار ادا کئے .... "عقل و دل" میں لبنیٰ نصیر نے "عقل" اور نزہت نے "دل" کا کردار ادا کیا .... "حقیقتِ حسن" کے ٹیبلو میں سمعیہ ہاشمی نے حسن کا کردار پیش کیا۔ باقی کردار لبنیٰ نصیر، صائمہ بشیر، ثمینہ نیاز اور شازیہ نے ادا کئے۔

مہمانِ خصوصی اور صدرِ تقریب نے کلامِ اقبال کے تناظر میں طالبات کو اچھے کام کرنے کی تلقین کی۔

تین گھنٹے کی یہ خوبصورت تقریب اپنے یادگار اثرات چھوڑ کر اختتام کو پہنچی۔

یوم کشمیر

آج بتاریخ 5 فروری 1998، گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن ملتان میں، اہل کشمیر کے ساتھ اظہارِ یکجہتی کے لئے تین تقاریب منعقد ہوئیں ....

(الف) اساتذہ کا سیمینار

(ب) زنانہ اساتذہ و طالبات کا اجلاس

(ج) طلبہ و اساتذہ کا جلسہ

(الف) اساتذہ کے سیمینار کی صدارت پروفیسر خان محمد دستی نے کی اور ڈاکٹر مختار ظفر

نے کمپیئرنگ کے فرائض انجام دیئے۔ اس سیمینار میں، مندرجہ ذیل اساتذہ نے اپنے نقطہ ہائے نظر پیش کئے۔

پروفیسر محمد ارشد خان	پروفیسر عبدالعزیز بلوچ	شوکت حسین مغل
قاضی غلام مرتضیٰ	حافظ صباحت حسن	پروفیسر قمرالحسن
ڈاکٹر منہاج الدین	پروفیسر جاوید فرید	ممتاز ایزد

ڈاکٹر مختار ظفر اور صدر مجلس جناب پروفیسر جان محمد دستی۔

اساتذہ نے مسئلہ کشمیر کا، اہل کشمیر، جغرافیہ محل وقوع، الحاق کے قانونی جواز، برصغیر اور ایشیاء کے امن و امان اور حق و انصاف کے حوالے سے دانشمندانہ جائزہ لیا۔ .... جناب خان محمد دستی نے اپنے خطبہ صدارت میں کہا کہ ناامید اور مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ حق کا بول ہمیشہ بالا ہوتا ہے۔ جب روس جیسی سپر طاقت افغانستان میں الجھ کر بکھر سکتی ہے، بھارت کیا چیز ہے؟ اس کو اس ظلم و عدوان کا خمازہ بھگتنا پڑے گا۔

(ب) زنانہ اساتذہ و طالبات کے جلسے کی صدارت محترمہ پروفیسر مسز صغریٰ خاکوانی نے کی۔ مہمان خصوصی پروفیسر شمع پاشا تھیں۔ اور پروفیسر رشیدہ لیاقت نے کمپیئرنگ کی۔ محترمہ خاکوانی نے جہاد کی فضیلت اور ضرورت پر زور دیا۔ اور کشمیریوں کے ساتھ بھارتیوں کے ظلم و ستم کی مذمت کی۔ آخر میں ایک قرارداد کے ذریعے بھارت کی سیہ کاریوں کی مذمت کی گئی اور مسئلہ کشمیر کے حل پر زور دیا گیا۔

(ج) طلبہ اور اساتذہ کے جلسے کی صدارت پرنسپل کالج ڈاکٹر طاہر تونسوی نے کی۔ پروفیسر سلامت علی ڈوگر اور ڈاکٹر منہاج الدین مہمانانِ خاص تھے۔ سٹیج سیکریٹری کے فرائض مختار ظفر نے ادا کئے۔ کاروائی کا آغاز، حسب روایت تلاوت قرآن حکیم سے ہوا۔ B.Ed کلاس کے طالب علم حافظ عبدالمجید نے تلاوت کی۔ پھر تین طلبہ نے خطاب کیا۔ آغاز میں مبشر حسین کھیڑا، رول نمبر 301 نے وادیٔ کشمیر کے فطری حسن و جمال اور بھارتی غاصبوں نے ظالمانہ اقدامات سے اس فطری حسن و جمال اور اعلیٰ اخلاقی قدروں کی پامالی کا جائزہ پیش کیا۔ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ کشمیر کے مسئلے کا حل مسلمانوں کی اپنی قوت اور ہمت پر منحصر ہے۔ اقوامِ متحدہ کی طرف امیدانہ نگاہیں لگا کر ہم اس مسئلے کو طول دے سکتے ہیں، حل نہیں کرا سکتے۔ کیونکہ 1948 میں سلامتی کونسل کی پاس کردہ دو قراردودوں پر آج تک عمل نہیں ہو سکا۔

حافظ محمد ایاز غفار، رول نمبر 63 نے اپنی تقریر میں مسئلہ کشمیر کی موجودہ صورتحال کا جائزہ

لیا۔ پھر اس کے حل کے لئے ملکی اور بین الاقوامی سطح پر ایک زور دار تحریک کو اٹھانے پر زور دیا۔ طالب علم نے اس ضمن میں کشمیر، بھارت، پاکستان اور عالمی سطح پر اقدامات کے لئے ٹھوس تجاویز پیش کیں۔

محمد سلیم رول نمبر 127 نے "مسئلہ کشمیر، عملی اقدامات کی ضرورت" کے عنوان سے گفتگو کی۔ طالب علم نے جذباتی انداز میں کشمیریوں کی پاکستان سے بے پناہ محبت اور امیدوں کا ذکر کرتے ہوئے تجویز کیا کہ مسئلے کا حل جہاد میں مضمر ہے۔

منصفین (پروفیسر عبدالعزیز بلوچ، شوکت حسین مغل اور پروفیسر عمر دین قادری) کے فیصلے کے مطابق تقریری مقابلہ میں محمد سلیم (127) اول، مبشر حسین کھیڑا (301)، دوم، اور حافظ محمد ایاز غفار (63) سوم آئے۔ جنہیں انعامات دینے کا اعلان کیا گیا۔

مہمانِ خصوصی پروفیسر سلامت علی ڈوگر نے دو واقعات کے حوالے سے مسئلہ کشمیر کو خود بھارت کے لئے وبالِ جان قرار دیا۔ .... ایک اس بنیاد پر یہ کہ بھارتی TV کے ایک مذاکرے میں چار بھارتی دانشوروں نے وزیر داخلہ سے اس مسئلے کے فوری حل پر زور دیا .... اور دوسرا یہ کہ بھارت معاشی بحران کی دلدل میں پھنس چکا ہے۔ یہاں تک کہ کئی بھارتی سکھ 15 دن کے ویزے پر پاکستان آ کر محنت مزدوری کر کے اپنے بچوں کا پیٹ پالتے ہیں۔

ڈاکٹر منہاج الدین کی تقریر کا لبِ لباب یہ تھا کہ پاکستان کو سلامتی کونسل کی قراردادوں پر عمل درآمد کرانے کے سلسلے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرنا چاہیے۔

آخر میں پرنسپل کالج، ڈاکٹر طاہر تونسوی نے، اپنے فکر انگیز خطاب میں کہا کہ کشمیر ہمارا دل ہے اور یہ ہر پاکستانی کے دل میں دھڑکتا ہے۔ انڈیا پچاس سال سے اس کے لئے اٹوٹ انگ کا راگ الاپ رہا ہے مگر وہ آج تک اس کو اپنا نہیں بنا سکا .... آپ نے کشمیر پر بھارتی ظلم و ستم کی مذمت کی اور مقتدر طاقتوں کی بے حسی کا ماتم کرتے ہوئے کہا کہ عراق کے مسئلے پر تو یہ طاقتیں فوری اقدامات کرتی ہیں مگر کشمیر کے سلسلے میں ان کا ضمیر سویا رہتا ہے۔ آپ کا طویل و مربوط خطاب بڑا موثر رہا۔

تینوں تقاریب میں مجاہدین اور اہل کشمیر پر بھارتی دیو استبداد کے خونچکاں ظلم و ستم کی مذمت کی گئی اور قراردادوں کے ذریعے مقتدر عالمی طاقتوں سے پر زور مطالبہ کیا گیا۔ کہ اس مسئلے کو سلامتی کونسل کی قراردادوں کے مطابق استصوابِ رائے کے ذریعے حل کرایا جائے۔ آخر میں اہل کشمیر کے لئے بطور خاص دعا کی گئی۔

جشنِ آزادی

گولڈن جوبلی مارچ ٹرین کا استقبال:

ڈائریکٹریٹ کالجز ملتان کے زیر انتظام نومبر 1997 میں ملتان کینٹ سٹیشن پر گولڈن جوبلی مارچ ٹرین کے استقبال میں ادارہ ہذا کے طلبہ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ استقبال کے بعد اسٹیشن کے سامنے لان میں ڈائریکٹر کالجز ملتان جناب ملک سعید اعوان کی زیرِ صدارت ایک شاندار تقریب منعقد ہوئی۔

جس میں حسنِ نعت، حسنِ قرأت اور آزادی سے متعلقہ موضوعات پر تقریروں کے مقابلے ہوئے۔ ان مقابلوں میں شہر بھر کے مردانہ کالجوں کے طلبہ نے خوب حصہ لیا۔ حسنِ نعت کے مقابلے میں ادارہ ہذا کے بی ایڈ کے متعلم معصوم رزاقی نے پہلی پوزیشن حاصل کر کے کالج کا نام روشن کیا۔

ضلعی سطح پر جشن آزادی کی تقریب:

ڈائریکٹریٹ کالجز ملتان کے پروگرام مجریہ 16 جولائی 1998 کے مطابق، ضلع بھر کے زنانہ کالجوں کی طالبات کے تقریری مقابلے ادارہ ہذا میں منعقد ہوئے۔ حسب پروگرام 22 جولائی 1998 کو 10 بجے لیکچر تھیٹر میں تقریب کا اہتمام ہوا تقریروں کے تین موضوعات تھے۔

1۔ خود انحصاری اور ہمارا نصب العین۔
2۔ ہمارے ذرائع ابلاغ اور ثقافتی یلغار
3۔ اسلامی ممالک اور نیو کلیائی قوت

تقریب کی صدارت گورنمنٹ کالج برائے خواتین ملتان کی پرنسپل مسز طاہرہ سلام نے کی۔ جب کہ مہمان خاص، پروفیسر مسز مریم قادر تھیں۔ کمپیرنگ کے فرائض تقریب کے منتظم ڈاکٹر مختار ظفر نے ادا کیے۔ ادارہ ہذا کے پروفیسر عبدالعزیز بلوچ نے منصفِ اعلیٰ کا فریضہ انجام دیا۔ ان کے ساتھ پروفیسر فیاض خالد اور پروفیسر قمر الحسن معاونین تھے۔

منصفین کے فیصلے کے مطابق گورنمنٹ کالج برائے خواتین کی متعلمہ شذرہ سلام رول نمبر 501 سال دوم نے پہلی پوزیشن حاصل کی جب کہ اسی کالج کی زنیرہ فاطمہ رول نمبر 533 سال

دوم نے دوسری۔ تیسری پوزیشن دو طالبات نے حاصل کی۔ ایک گورنمنٹ گرلز انٹر کالج چونگی نمبر 14 ملتان کی رخسانہ جبیں رول نمبر 68 نے اور دوسری گورنمنٹ کالج برائے خواتین ملتان کی بینش علی رول نمبر 5 سال چہارم نے۔ ادارہ ہذا نے ان تمام طالبات کو کتابوں کی صورت میں انعامات دیے۔

14 اگست 1998:

14 اگست 1998 کو حسب روایت ادارہ ہذا میں جشن آزادی منانے کے لئے ایک بھر پور تقریب کا اہتمام ہوا۔ صدارت پرنسپل کالج جناب پروفیسر ڈاکٹر طاہر تونسوی نے کی۔ اور سٹیج سیکرٹری کے فرائض تقریب کے منتظم ڈاکٹر مختار ظفر نے ادا کئے۔ منصفین کے فرائض ڈاکٹر منہاج الدین، پروفیسر شوکت مغل اور پروفیسر عمر قادری نے ادا کئے۔ طلبہ کے مابین تین قسم کے مقابلے ہوئے۔ ترانے، تقریری مقابلے (اردو)، تقریری مقابلے (انگریزی)۔ ترانے میں اشتیاق احمد نے اول پوزیشن حاصل کی جب کہ انگریزی تقریر میں نوید عباس نے اور اردو تقریروں میں حماد الرحمن نے اول، عمر حیات نے دوم اور عبدالجبار نے تیسری پوزیشن حاصل کی۔

ان تمام طلبہ کو نظریہ پاکستان کے متعلقہ کتابوں کی صورت میں انعامات دیے گئے۔ تقریب کے آغاز میں پروفیسر محمد سعید احمد کی تقریر فکر انگیز تھی۔ جب کہ آخر میں پرنسپل کالج جناب ڈاکٹر طاہر تونسوی کا خطاب معرکتہ الارا تھا۔

عید میلاد النبی ﷺ:

ڈائریکٹوریٹ کالجز ملتان ڈویژن کے پروگرام بحوالہ مراسلہ نمبری 2780 زیر تاریخ یکم جولائی 1998، کے مطابق۔ 7 جنوری 1998، کو ادارہ ہذا کے زنانہ یونٹ میں عید میلاد النبی ﷺ انتہائی ادب و احترام سے منائی گئی۔ کمپیرنگ کے فرائض مجلس علوم اسلامیہ کی جوائنٹ سیکریٹری جویریہ کوکب رول نمبر 676 نے ادا کئے۔ نبلیٰ خاکوانی رول نمبر 681 نے تلاوت قرآن حکیم کی۔ مقابلہ نعت خوانی میں جویریہ کوکب نے پہلی، شہناز بی بی رول نمبر 608 نے دوسری اور عذرا جبیں (506) نے تیسری پوزیشن حاصل کی۔

تقریری مقابلے میں نبلیٰ خاکوانی نے اول، سعدیہ حبیب (651) نے دوسرا اور صائمہ خالد (

744) نے تیسرا انعام حاصل کیا۔ اس تقریب کی صدارت پروفیسر رفعت یاسمین نے کی جب کہ مہمان خاص پروفیسر مسز زاہدہ رؤف تھیں۔

ہوسٹل کی تقریبات:

7جنوری 1998ء کو ادارہ ہذا کے ہوسٹل (male) میں ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ پروفیسر ملک اقبال حسین نے سیرت النبوی ﷺ کے موضوع پر ایک پُروقار تقریب کا اہتمام کیا۔
صدارت ملک کے نامور ادیب و نقاد اور پرنسپل کالج ڈاکٹر طاہر تونسوی نے کی۔ مہمان خصوصی وائس پرنسپل پروفیسر محمد آزاد تھے۔ یہ پروگرام تین حصوں پر مشتمل تھا۔ تقریری مقابلہ، مقابلہ حسن قرآت، مقابلہ حسن نعت۔
حسن قرآت کے پروگرام میں پانچ طلبہ نے حصہ لیا۔ پہلا انعام عطاء المرتضیٰ نے اور دوسرا امیر حمزہ نے حاصل کیا۔ نعت خوانی کے مقابلے میں چار طلبہ نے حصہ لیا۔ تنویر احمد اور باقر حسین اول و دوم انعامات کے مستحق قرار دیے گئے۔ تقریری مقابلے میں گیارہ طلبہ نے حصہ لیا۔ ان میں سے محمد ارشاد نے اول، رانا رفیق اکمل نے دوسری اور محمد سمیع نے تیسری پوزیشن حاصل کی۔ پوزیشن حاصل کرنے والے تمام طلبہ کو کتابوں کی صورت میں انعامات دیے گئے۔

کل پاکستان بین الکلیاتی تقاریب:

گورنمنٹ کالج برائے خواتین ملتان کی "کل پاکستان بین الکلیاتی تقاریب" میں ادارہ ہذا کی طالبات ذوق و شوق سے حصہ لیتی ہیں جس کے نتیجے میں گزشتہ تین سال سے آل راؤنڈ ٹرافی کا اعزاز اسی ادارے کو مل رہا ہے........ 1998ء کی ان تقاریب میں نبیلہ خاکوانی نے اسلامی مذاکرہ میں پہلا جب کہ اردو اور انگریزی دونوں مباحثوں میں دوسرا انعام حاصل کیا۔ جویریہ کوکب نے ملی نغمہ میں پہلا اور مقابلہ حسن نعت میں حوصلہ افزائی کا انعام پایا۔ سعدیہ حبیب نے اردو مباحثے میں حوصلہ افزائی انعام وصول کیا۔ سمیرا رفیق نے انگریزی مباحثے میں دوسرا لیکن مقابلہ حسن قرات میں حوصلہ افزائی انعام حاصل کیا۔ صائمہ بشیر نے آرائش گل میں دوسرا انعام وصول کیا........ "علاقائی ڈریس شو" میں جویریہ، طیبہ، ثروت اور صائمہ نے حصہ لیا اور اوّل انعام کا اعزاز حاصل کیا۔
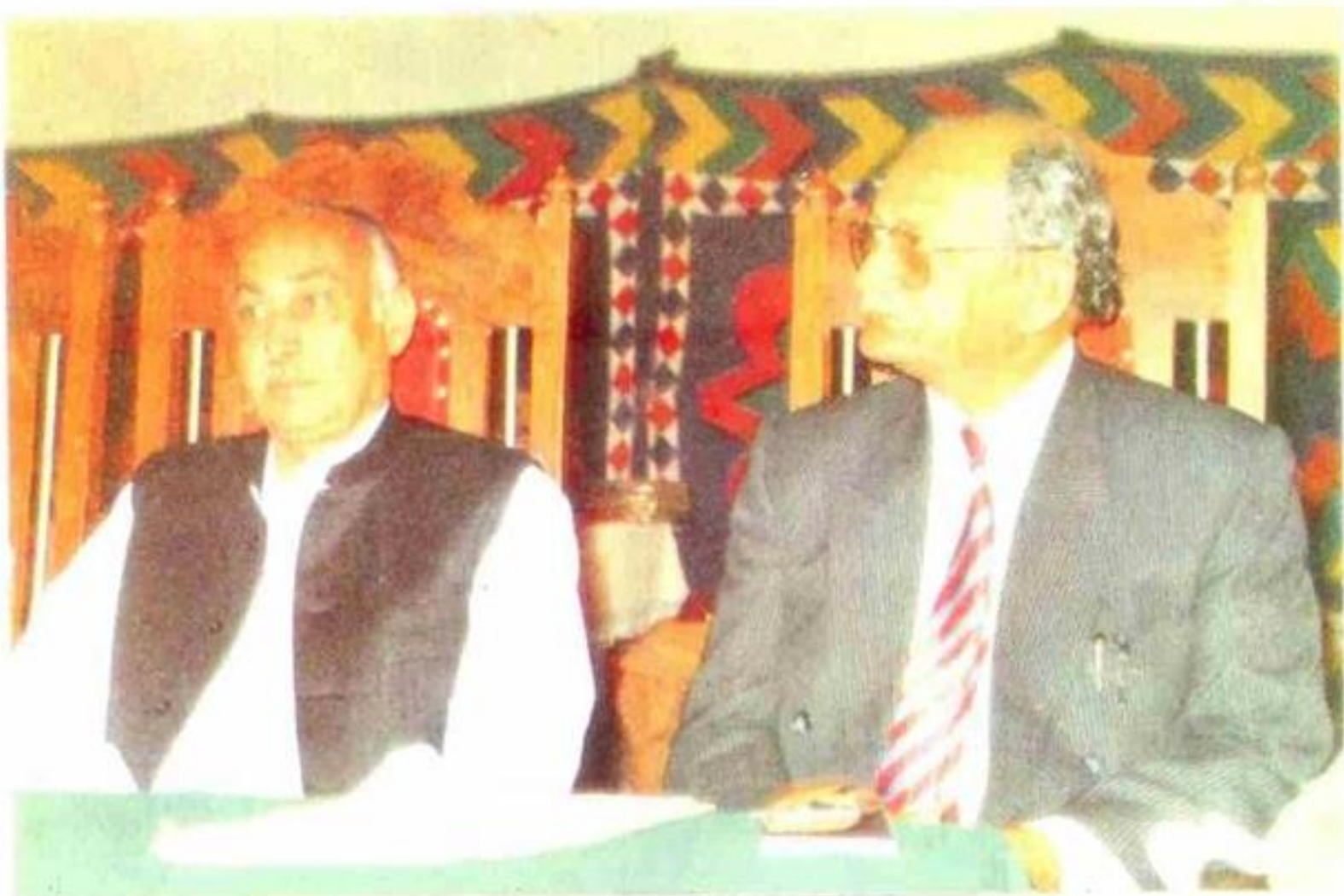
جلسہ تقسیم انعامات ' مہمان خاص اور صدر مجلس ' پروفیسر قمر الزمان خاں ' پروفیسر ڈاکٹر طاہر تونسوی

جلسہ تقسیم انعامات سٹیج سیکرٹری پروفیسر مختار ظفر خطاب کر رہے ہیں
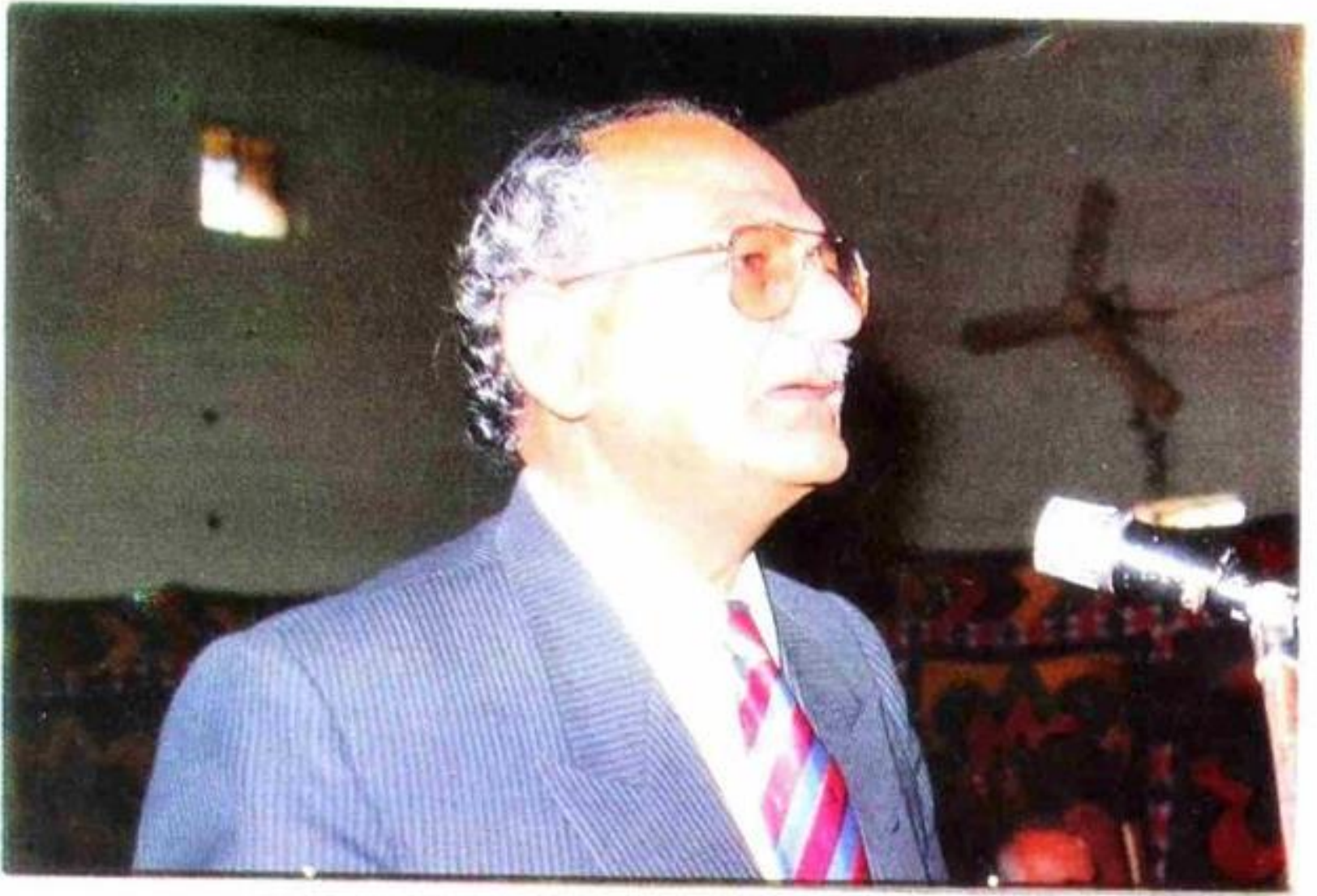
ڈائریکٹر تعلیمات جناب پروفیسر قمرالزماں خاں جلسہ تقسیم انعامات سے خطاب کر رہے ہیں

جلسہ تقسیم انعامات میں ایک جانب کے سامعین میں سابقہ پرنسپل پروفیسر محمد سعید اشرف' پروفیسر ڈاکٹر محمد احسان پرنسپل گورنمنٹ کالج بوسن روڈ ملتان' پروفیسر محمد حسین آزاد' پروفیسر ڈاکٹر مہناج الدین' پروفیسر ڈاکٹر شمیم حیدر ترمذی' پروفیسر سیف اللہ اور پروفیسر حافظ صباحت حسن نمایاں ہیں
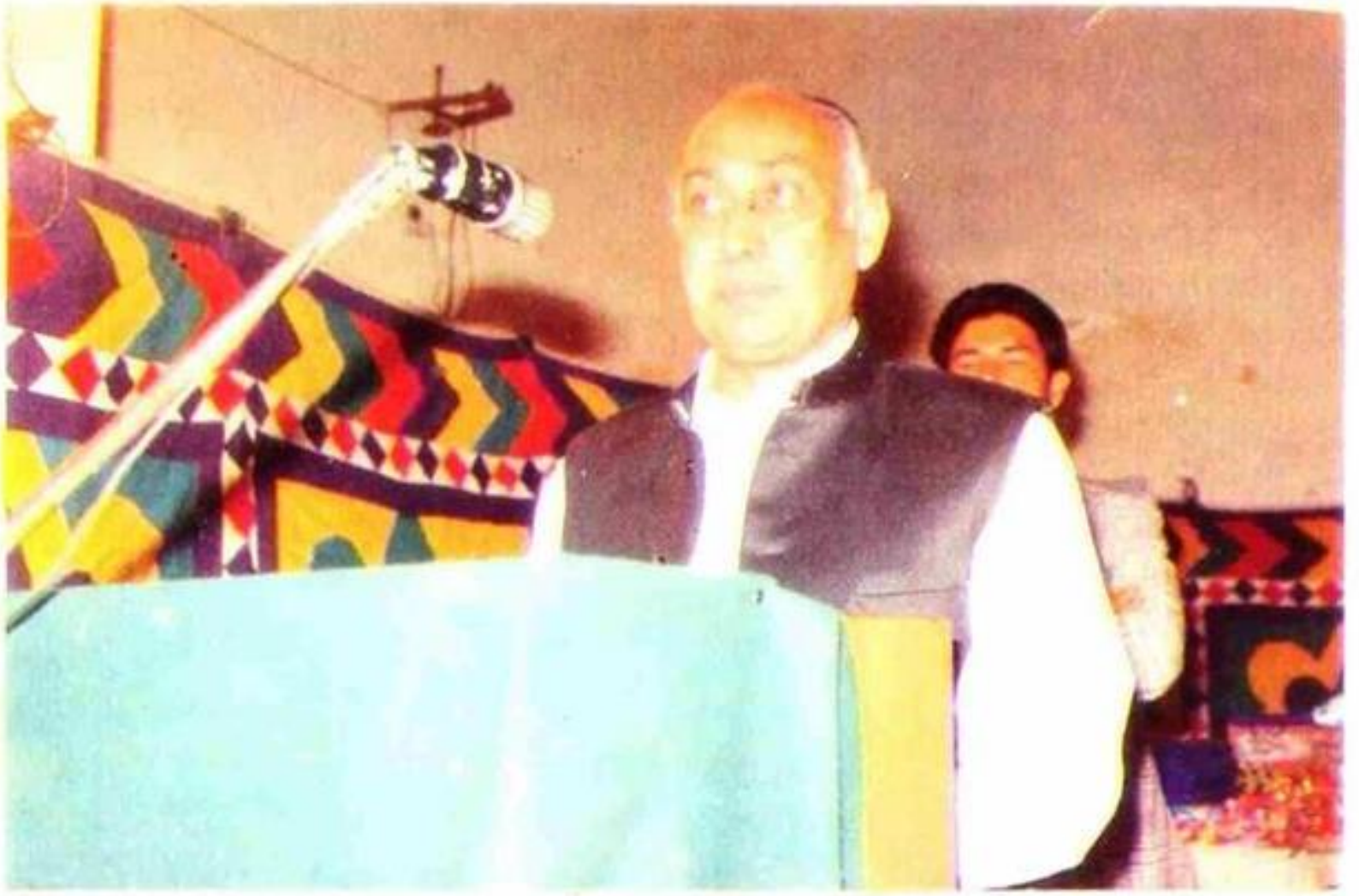
پرنسپل ڈاکٹر طاہر تونسوی' جلسہ تقسیم انعامات میں خطبہ استقبالیہ پیش کر رہے ہیں

ڈائریکٹر تعلیمات (کالجز) پروفیسر قمرالزمان خاں چیرمین ثانوی و اعلیٰ ثانوی تعلیمی بورڈ ملتان کو کالج کی طرف سے سوونیر پیش کر رہے ہیں وائس پرنسپل پروفیسر محمد آزاد چودھری اظہار مسرت کر رہے ہیں۔

پروفیسر قمرالزمان' ڈائریکٹر تعلیمات (کالجز) اور پرنسپل' ڈاکٹر طاہر تونسوی

ڈائریکٹر تعلیمات (کالجز) ملتان' پروفیسر قمرالزمان خاں' ڈائریکٹر تعلیمات (کالجز) بہاولپور' پروفیسر ارشاد احمد نقوی اور وائس پرنسپل پروفیسر محمد آزاد چودھری

ڈائریکٹر تعلیمات پروفیسر قمرالزماں خاں اور ادارہ کے پروفیسر جناب کنور منیر خاں

جلسہ تقسیم انعامات ڈائریکٹر کالجز جناب پروفیسر قمرالزماں خاں ڈپٹی ڈائریکٹر جناب پروفیسر محمد حسین آزاد کو کالج کی طرف سے سووینر پیش کر رہے ہیں

سالانہ اتھلیٹکس، ڈاکٹر شمیم حیدر(، پروفیسر غلام مصطفیٰ سہو کو مشورہ دے رہے ہیں۔
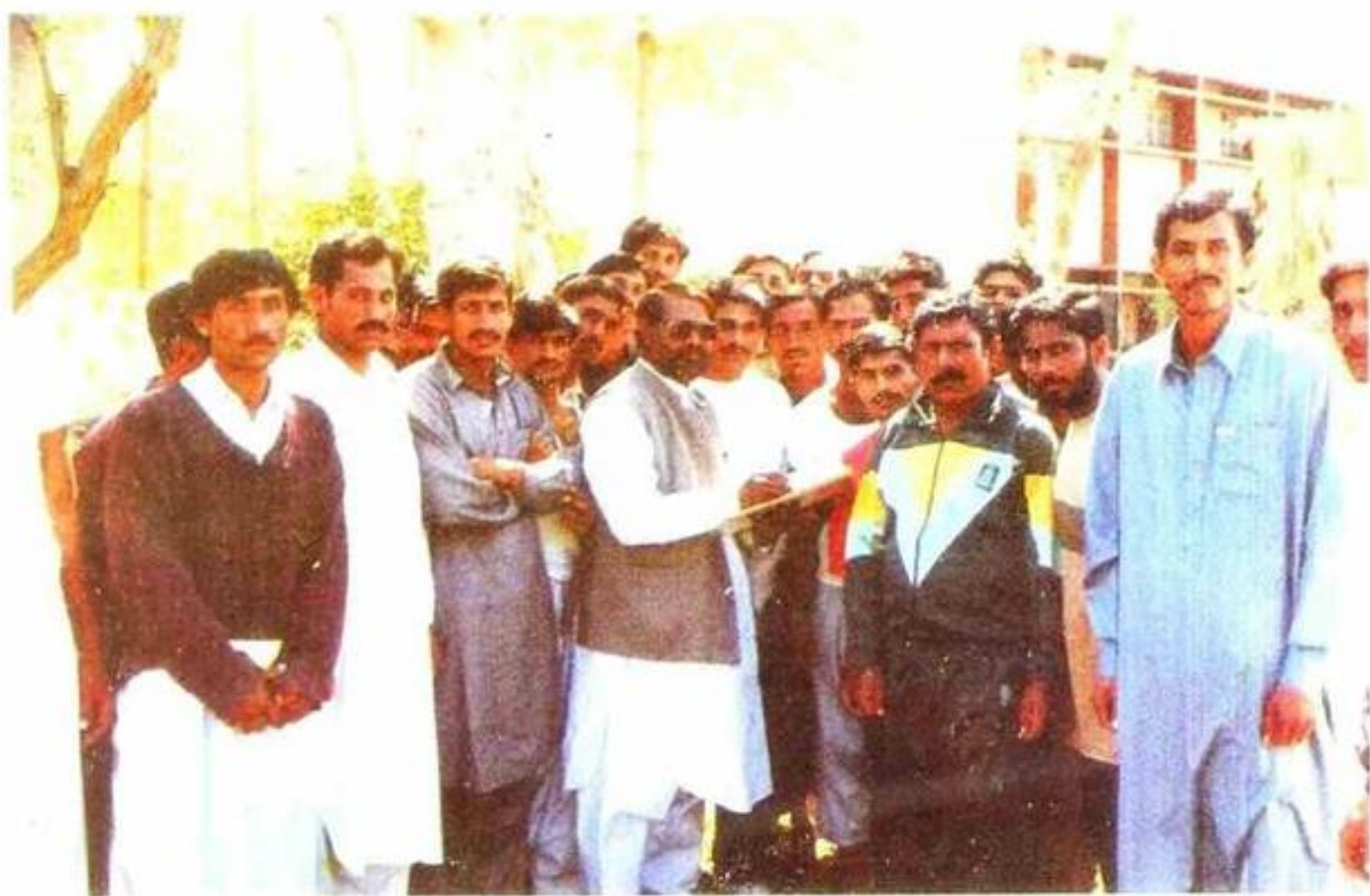
سالانہ اتھلیٹکس، پروفیسر عبدالعزیز بلوچ، غلام مصطفیٰ سہو (ڈی پی ای کالج) اور طلبہ

متن
فائنل رپورٹ ICF سنٹر
گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن، ملتان

تیار کردہ و پیش کردہ:
سید سجاد حسین بخاری
سبجیکٹ سپیشلسٹ

یہ راکھ راکھ رتیں اپنی رات کی قسمت
تم اپنی نیند بجھاؤ، تم اپنے خواب چنو
بکھرتی ڈوبتی نبضوں پہ دھیان کیا دینا
تم اپنے دل میں دھڑکتے ہوئے حروف سنو

عالی مرتبت جناب محترم پروفیسر ڈاکٹر طاہر تونسوی صاحب سربراہ ادارہ، ICF کورس ڈائریکٹر میرے محترم پروفیسر کنور محمد منیر صاحب، محترم ومکرم جناب پروفیسر سلامت علی ڈوگر صاحب، میرے معزز رفقاء کار حضرات و خواتین!

یکم ستمبر کو ICF کے اس تربیتی پروگرام کا آغاز ہوا۔ طویل سفر محسوس ہوتا تھا۔ کٹھن مرحلہ لگتا تھا۔ حوصلہ اور ہمت بندھائے نہ بندھتے تھے۔ لیکن ہمارے اساتذہ محترم پروفیسرز صاحبان نے جس طرح ہماری مدد فرمائی اور سرپرستی کی اس سے نے صرف یہ کہ تین ماہ کا عرصہ اب ایک لمحہ محسوس ہو رہا ہے۔ بلکہ ابھی یہ دور ایسا سہانا ماضی لگ رہا ہے کہ جس کی یادیں ہمیشہ ذہنوں کو معطر کرتی رہیں گی۔ سماں بے حد دلکش ہے۔ شاید اس لئے کہ ابھی تو محبت پروان چڑھی تھی۔ ابھی تو ہم کو اساتذہ کی شفقتوں سے مستفید ہونا تھا کہ جدائی کا آغاز ہونے لگا ہے۔

میں تیرے ملنے کو معجزہ کہہ رہا تھا لیکن
ترے بچھڑنے کا سانحہ بھی کمال گزرا

لیکن جو ہونا ہوتا ہے۔ بہر حال ہو جاتا ہے۔ یہ قدرت کا اصول ہے۔ مگر فخر یہ ہے کہ ہمارے اساتذہ ہمیں رخصت کرنے آئے ہیں اور پھر جناب پروفیسر ڈاکٹر طاہر تونسوی صاحب کی موجودگی ہمارے لئے مزید باعث مسرت ہے۔ ہم اپنے پروفیسرز صاحبان اور جناب ڈاکٹر صاحب کے شکر گزار ہیں۔ کہ انہوں نے تشریف فرما کر ہماری اس الوداعی تقریب کو زعفران فرمایا۔ ہم محسون بھی ہیں اور ممنون بھی۔

لو بادِ بہار آگئی
کلی دِل کی کھِلا گئی

جنابِ صدر محفل! ICF کا نصاب تعلیم کافی معیاری تھا۔ اسمیں اکثر موضوعات M.Phil لیول کے برابر تھے۔ TOPICS کی بھرمار تھی۔ اتنا طویل نصاب اور اتنا کم عرصہ شاید تعلیم و تدریس میں ہمارے ملک کی تاریخ کا پہلا عجوبہ ہے۔ اس اعتبار سے یہ نصاب غیر نفسیاتی بنیادوں پر استوار کیا گلتا ہے۔ لیکن آپ نے جن اساتذہ کی ٹیم متعین کی وہ واقعی تدریسی مہارت اور تجربہ کی بلندیوں پر تھے۔ یہ ان کی صلاحیت اور اہلیت ہی تھی کہ راہ میں حائل تمام مشکلات و مسائل ساتھ ساتھ حل ہوتے رہے۔

کاش کچھ دیر یُونہی وقت گزرتا رہتا
مَیں اُسے دیکھتا رہتا وہ سنورتا رہتا
اجنبی، کتنا اکیلا ہے محبت کا سفر
تُو مرے ساتھ نہ ہوتا تو مَیں ڈرتا رہتا

جنابِ پروفیسر ڈاکٹر شمیم حیدر ترمذی صاحب کا تدریسی مضمون تھا Research & Assessment یہ مضمون ازحد ٹیکنیکل اور پیشہ ورانہ نوعیت کا تھا۔ مگر انہوں نے اپنے مضمون کے ثقیل اور مشکل تصورات کو انتہائی محنت و باقاعدگی اور اپنے مخصوص تدریسی انداز میں اس طرح پڑھایا کہ ملک بھر میں شاید ہی کوئی استاد اس انداز سے ایسے پیچیدہ تصورات کی تدریس کر سکے۔ ان کی تدریس، تدریسی طریقوں کو جنم دیتی ہے۔ ان کی تدریس جماعت میں روح ڈال دیتی ہے۔

طلباء میں زندگی کی چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اساتذہ میں جذبوں کی تڑپ جنم لیتی ہے۔ واقعی وہ رموز تدریس کے ماہر ہیں۔ نفسیات کے تدریسی تقاضوں میں کمال رکھتے ہیں۔ یہ ان کی باکمال شخصیت کی کرامت ہے یا ان کے تدریسی انداز کا معجزہ کہ پوری جماعت بڑی چاہت سے ان کی منتظر رہتی تھی۔

مت سہل "اسے" جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

ہم انہیں سلام پیش کرتے ہیں اور خصوصی طور پر شکر گزار ہیں۔

جناب محترم کنور محمد منیر صاحب نے نہ صرف اپنا مضمون Curriculum & hstructions بڑی مہارت سے پڑھایا۔ بلکہ کورس کے تمام تر انتظامات بطریق احسن پورے کئے۔ نوٹس کی بھرمار کر دی۔ ہماری تمام تر تدریسی سہولتوں کا ہمہ وقت دھیان رکھا۔ ہمارے تمام لاڈ، فرمائشیں بروقت پوری کیں۔ کورس کی کامیابی کا سہرا انہیں کے سر ہے۔ ان کا خلوص اور جنون سے ذمہ داریوں کو نبھانا ان کا ہی طریقہ اور انداز ہے۔

جناب والا! میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ جب تک پروفیسر کنور منیر صاحب جناب کے ساتھ ہیں جناب انتظامی امور میں ہمیشہ کامیاب و سرخرو رہیں گے۔ انشاء اللہ
کیونکہ یہ وہ شخص ہے جو

اپنی تو وہ مثال ہے جیسے کوئی درخت
اوروں کو چھاؤں بخش کے خود دھوپ لیتا ہے

جناب پروفیسر سلامت علی ڈوگر صاحب نے اپنے مضمون Principles and Methods of Teacher Education کو ایک ایسے دلکش انداز میں پیش کیا۔ کہ جس سے ان کے طویل تدریسی تجربہ کا پتہ چلتا تھا۔ وہ شفیق و شریف استاد ہیں اور ماہر تعلیم بھی۔ وہ استاد ہونے کے تمام تقاضوں کو باکمال طریقے سے پورا کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنا مضمون بھی پڑھایا اور ریاضی میں بھی ہماری رہنمائی فرمائی۔ اور یوں ICF کورس میں دوہرے فرائض انجام دے کر اپنی اہلیت ثابت کر دی۔

ہوا ہے تجھ سے بچھڑنے کے بعد اب معلوم
کہ تو نہیں تھا، ترے ساتھ ایک دنیا تھی

جنابِ پروفیسر چودھری عبدالستار صاحب شرافت و سیادت کا نمونہ ہیں۔ ان کا مضمون Trends & Issues in Teacher Education جدید نوعیت کا تھا۔ انہوں نے حتی المقدور اپنے کورس کو نبھانے کی کوشش فرمائی۔ کورس کی نوعیت کے پیشِ نظر کچھ رکاوٹیں ضرور پیش آتی رہیں۔ Topics حد درجہ Challenging تھے۔ بحث و تمحیص ہمیشہ عروج پر پہنچتی رہی۔ لیکن انہوں نے طویل تدریسی تجربہ سے ان مشکلات کو ممکن حد تک دور فرمانے کی کوشش کی۔ انہوں نے ہمیں اپنے بھر پور پیار سے نوازا اور ہمیشہ محبت و شفقت پیش کی۔

کیا بتاؤں کہ رُوٹھ کر تُجھ سے
آج تک تجربوں میں کھویا ہوں
تو مجھے بھول کر بھی خوش ہوگا
میں تُجھے یاد کر کے رویا ہوں

محترمہ میڈم نزہت کی باقاعدگی، محنت اور ریاضت سے انگریزی کی تدریس نہایت ہی خوبصورت انداز میں ہوئی۔ جنابِ پروفیسر خادم علی ہاشمی صاحب کی اعلیٰ رہنمائی سے سائنس گروپ بطورِ خاص مُستفید ہوا۔ وہ اہلیت و صلاحیت کے اعتبار سے تسلیم شدہ حیثیت کے حامل ہیں۔ عمر بھر تدریسِ سائنس میں ان کی سنہری خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ اُن کی اُصول پسندی مسلّم ہے۔ مگر ہم بہر طور اساتذہ سے قدرے رعائیت کی درخواست ہمیشہ کرتے رہیں گے۔ شکریہ۔

جنابِ پرنسپل صاحب! واقعی یہ سب لوگ نہ بُھولنے والی شخصیات ہیں۔ اس کالج کا سرمایہ ہیں۔ جنوبی پنجاب میں تعلیم و تدریس کے Pillars ہیں۔ رہنما ہیں، اور تربیتِ اساتذہ کے میدان کے لیڈر ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں، کہ

راہِ وفا میں ہو جذبۂ کامل جن کے ساتھ
خود اُن کو ڈھونڈ لیتی ہے منزل کبھی کبھی

ہم انہیں خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں اور خلوص بھرا سلام بھی۔ شکریہ بھی پیش کرتے ہیں اور دعاؤں کا تحفہ بھی۔ ادب بھی آداب بھی۔ عنائیتوں کا احسان بھی تسلیم کرتے ہیں اور آئندہ کیلئے عنائیتوں کی امیدیں بھی رکھتے ہیں۔ شکریہ۔

سامعینِ محترم! ہم اس کالج کے سبزہ کو دیکھتے رہے ہیں۔ ہم اس کالج کے سبز میدانوں پر

نظر دوڑاتے رہے ہیں۔ اس کالج کی پگڈنڈیوں کا نظارہ کرتے رہے ہیں۔ یہاں کی باقاعدہ لگتی کلاسوں کا مشاہدہ کرتے رہے ہیں۔ ہر کلاس میں چھوٹے چھوٹے مائیکس پر درسِ قرآن سنتے طلباء کو دیکھتے رہے ہیں۔ قحط الرجال کے اس دور میں کلاسوں میں کھڑے اساتذہ کا مشاہدہ کرتے رہے ہیں۔ ان سب سے جناب ڈاکٹر طاہر تونسوی صاحب کی شخصیت کا ایک انوکھا تصور اُبھرتا ہے۔ ان سب کا کریڈٹ یقیناً آپ کی ذات کی طرف جاتا ہے۔ کہ جو کالج کی روایات کا امین ہے۔ جو کالج کی زندگی کا ذمہ دار ہے۔ جو کالج کی روح سے واقفیت رکھتا ہے۔ اور ادارہ کو اپنی بھرپور صلاحیتوں سے جواں رکھے ہوئے ہے۔ آپ کی قیادت یقیناً کالج کیلئے رحمت و برکت ہے۔ یہ کالج اور کالج کے سٹاف کی خوش نصیبی ہے کہ اُنہیں آپ کی صورت میں ایک شفیق، مہربان، ادیب، شاعر، دانشور، ماہرِ تعلیم اور ایک ایسا سربراہ ملا ہے جو زندہ ضمیر رکھتا ہے سچا دل رکھتا ہے۔ صاف ذہن رکھتا ہے پاکیزہ عمل رکھتا ہے۔ اور ہر بات صاف صاف کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں کیلئے ہمدردیوں اور خلوص کا پیکر بن کر ایک ایک قدم پر ساتھی و مددگار بھی ہے اور رہنما بھی ہے۔ اور مجھے تو ذاتی طور پر فخر ہے کہ اپنی پوری زندگی علمی جہاد میں صرف کرنے والے اس نوجوان کا تعلق سرزمینِ ڈیرہ غازی خان سے ہے۔

ICF کورس میں جناب کی بطور منتظم جو دلچسپی رہی ہے اُس کا ہی نتیجہ ہے کہ ہمارے تمام تر مسائل بروقت حل ہوتے رہے ہیں۔ ہم آپ کے شکر گزار ہیں۔ او محسن نقوی مرحوم کے ان الفاظ میں دعا کرتے ہیں۔

"میرا طاہر تونسوی زندہ باد۔ آپ جیئیں، آپ کا قلم جیئے! آمین"

میں کس طرح تجھے لفظوں کا پیرہن بخشوں
میرے ہنر کی بُلندی تو سرنگوں ہے ابھی

میرے محترم پروفیسرز صاحبان اور جنابِ کورس ڈائریکٹر صاحب!

میں یہ عرض کرتے ہوئے فخر محسوس کر رہا ہوں کہ اب ہماری سکول سائیڈ میں بھی ماہرینِ تعلیم کی کمی نہیں۔ ایلیمنٹری کالجز سکیم اور ہائیر سیکنڈری سکولز سکیم نے سکول سائیڈ پر انقلاب برپا کر دیا ہے۔ تدریس کے میدان میں اعلیٰ تعلیم یافتہ ماہرینِ تعلیم کا ایک بہت بڑا گروپ بطور Subject Specialists اور Senior Subject Specialists ان اداروں میں پرجوش طریقے سے باقاعدہ تدریسی فرائض انجام دے رہا ہے۔ اب سکول سائیڈ پر احساسِ کمتری کی دلدل میں پھنسے ہوئے اساتذہ نہیں رہے۔ کہ جو محنت کرنے کے باوجود اپنے مسائل کیلئے افسران کی

طرف بے بس نگاہوں سے تکتے تھے۔ بلکہ یہ لوگ کام کرنے والے ہیں۔ اہل ہیں۔ اپنا حق منوانے کے تمام قرینے اور طریقے جانتے ہیں۔ اب سکول سائیڈ جواں قیادت، تازہ و گرم خون اور جوش و ولولوں سے بھرپور باہمت لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔ جو علم بھی رکھتے ہیں۔ تنقیدی مزاج بھی، شوق بھی اور مہارت بھی۔ یہ وہ لوگ ہیں۔ کہ

ٹوٹے جو ستارا تو زمیں پر نہیں گرتا
حالات کے قدموں میں قلندر نہیں گرتا
گرتے ہیں سمندر میں بڑے شوق سے دریا
لیکن کسی دریا میں سمندر نہیں گرتا

جناب والا! ان 38 قلندروں نے تعلیم و تدریس کے موضوع پر ICF کے کالج آف ایجوکیشن ملتان کے فورم سے مسلسل تین ماہ تک جس مہارت سے اپنے نظریات و خیالات پیش کئے ہیں ان کی گواہی ہمارے محترم پروفیسرز صاحبان دیں گے۔

محترم صدر ذی وقار! شرکاء کورس اساتذہ نے خوب Participation کی۔ Assignments تحریر کیں۔ Representations کیں۔ مڈ ٹرم امتحانات اور فائنل ٹرم امتحانات دیئے جو کسی دوسرے کالج کے ICF سنٹرز میں نہیں ہوئے۔ اساتذہ کے احکامات بجا لانے میں ذرا بھر بھی تساہل سے کام نہ لیا۔ جو یقیناً ان کی مثبت سوچ اور تعلیم کے فیلڈ میں ان کے اچھے رویوں کے تقاضوں کے بھرم رکھنے کو ظاہر کرتا ہے۔ یوں تو کورس میں سب ساتھیوں نے اپنے تجربات پیش کئے۔ کس کا نام لوں کس کا نہ لوں۔ فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ لیکن ان سب ساتھیوں کی اجازت سے کہہ رہا ہوں کہ اشتیاق اعوان صاحب، کامران صاحب، کبیر ملک صاحب، ریاض بلوچ صاحب، ریاض احمد خاں صاحب، حافظ نذیر احمد صاحب، احمد فاروق صاحب، منیر احمد صاحب، ارشاد صاحب، حافظ مجتبیٰ صاحب، جناب نور احمد صاحب اور مسز نیاز الٰہی صاحبہ کی Participation کو بہرحال خصوصی طور پر یاد رکھا جائے گا۔ ان صاحبان نے کورس میں یادگار Participation کر کے سکول سائیڈ کو زندہ باد کر دیا اور کورس میں بیداری پیدا کی۔ جس سے کورس کے بنیادی تصورات کے شعور میں بڑی حد تک مدد ملی۔ اور اس طرح کورس کو ناقابل فراموش بنا دیا۔

میں یہ چند شعر ان رفقاء کی نذر کرتا ہوں:

اے فکرِ کم نشاں! مری عظمت کی داد دے
تسلیم کر رہا ہوں، میں تیرے وجود کو
اے شعورِ حرف و صوت مجھے بھی سلام کر
توڑا ہے میں نے شہرِ غزل کے جمود کو
اے وسعتِ جنوں مری جرأت پہ ناز کر
میں نے بھلا دیا ہے رسوم و قیود کو

جناب والا! کورس میں یقیناً کچھ خلا اور Flaws رہ گئے ہوں گے۔ اس مرحلہ پر میں اپنے پروفیسرز صاحبان کی خدمت میں عرض کروں گا کہ وہ بڑے ادارے کے ماہرین تعلیم ہیں۔ ہم ان سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنے لیکچرز میں Edul. Innovations کو کسی نہ کسی طرح ضرور متعارف کروایا کریں۔ اس میں قدرے مطالعہ اور محنت و ریاضت درکار ہو گی۔ لیکن روایتی تدریس کی بجائے جدید تدریس کے تقاضے یقیناً پورے ہوں گے اور اس طرح ICF جیسے تربیتی پروگرام میں نظم و ضبط بھی رہے گا۔

وقت کے ساتھ بدلتا تو کوئی کردار نہیں
جو وقت ہی کو بدل دے وہ انساں ہے عظیم

جناب والا! اس موقعہ پر سوال یہ ہے کہ ICF نے ہمیں کیا دیا۔ میری رائے یہ ہے کہ ICF نے ہمیں بہت کچھ دیا۔ مالی فائدے کے علاوہ ICF نے ہمیں عزت دی، حوصلہ دیا، confidence دیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان شخصیات سے Interaction کا موقعہ فراہم کیا جو تعلیم و تدریس میں مانی جاتی ہیں۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اب جب ہم جا کر اپنے Colleagues میں بیٹھیں گے اور علمی نظریات پر بحث کا موقعہ آئے گا تو یکم ستمبر کی نسبت یکم دسمبر کو ہم زیادہ پر اعتماد اور پختہ ذہن ہوں گے۔ بلکہ ہم خود محسوس کریں گے کہ تعلیمی تصورات کے سلسلہ میں ہماری رائے تسلیم کی جا رہی ہے۔ یہی Professional Growth ہے۔ جو کسی کورس کا مقصد ہوتا ہے اور ICF نے اس مقصد کو حاصل کر لیا ہے۔

صدرِ مجلس! شرکاء کورس کی پرجوش Participation، پروفیسرز صاحبان کی تجربہ کار قیادت اور جناب کی بطور کورس ڈائریکٹر انتظامی صلاحیتوں کے پیشِ نظر کہا جا سکتا ہے کہ ICF کا ہمارا سنٹر پنجاب بھر میں نمایاں حیثیت میں چلا ہے۔ آپ مختلف تعلیمی میٹنگز میں جا کر بے

دھڑکن فخر سے دعویٰ فرما سکتے ہیں کہ ہمارا سنٹر ہر لحاظ سے قابل رشک رہا ہے۔

جناب والا! آخر میں یہ کچھ گزارشات بھی ہیں۔ جو آپ اور ارباب بست و کشاد کی خاص توجہ کی طالب ہیں:

1۔ ICF کا نصاب M.Ed اور MPhill سے ماخوذ ہے۔ جناب سے گزارش ہے کہ جب بھی موقع میسر آئے میٹنگز میں سفارش فرمائیں بلکہ بھرپور وکالت فرمائیں کہ ICF تربیت یافتگان کو MEd کے Equivalent تصور کیا جائے اور اس کا باقاعدہ نوٹیفکیشن جاری کیا جائے۔

2۔ ICF کے تربیت یافتگان کو Two Advance Increments عطا کی جائیں جو TTP کے ارباب بست و کشاد نے پہلے ہی Recommend فرمائی ہوئی ہیں۔

3۔ بورڈز آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن کی مختلف کمیٹیوں میں نمائندگی کے لئے ICF کے تربیت یافتہ ماہرین مضمون کو بطور خاص ترجیح دی جائے۔

4۔ ICF کے تربیت یافتگان کو مختلف گریڈز کی پوسٹوں کے انتخاب کے لئے ترجیح دی جائے۔

5۔ ICF کے تربیت یافتہ SS اور SSS صاحبان کو ICF کے آئندہ کورسز میں بطور خاص Trainers یا CoTrainers تعینات کیا جائے۔ خصوصاً لوکل حضرات کو تاکہ ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایا جاسکے۔

آخر میں میں جناب پرنسپل صاحب، جناب پروفیسر صاحبان کا دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس تقریب میں شمولیت فرما کر ہمیں عزت بخشی۔ اپنے لوکل بھائیوں کا بھی شکر گزار ہوں کہ جنہوں نے آج کی اس تقریب کے اہتمام کے لئے تمام اخراجات رضاکارانہ طور پر برداشت کئے۔ اور ہم سب کو پارٹی دے کر مہمان نوازی کی اعلیٰ اقدار و روایات کو نبھایا۔ میں ان سب کی نذر کرتا ہوں ...... یہ اشعار ......

مجھے دوسروں سے طلب نہ کر مجھے خود سے مانگ کر دیکھنا
میں برنگِ عکسِ گہر نما کفِ التماس میں آؤں گا
مجھے اب تو شوق سے بھول جا، یہی ناز کم تو نہیں کہ میں
تری چاہتوں کی کتاب کے کسی اقتباس میں آؤں گا

شکریہ

مجلّہ "مسلک" پر ایک تاثر

مجلّہ "مسلک ۱۹۹۷" بڑی دیدہ زیب get up میں پیش کیا گیا ہے۔ سرورق پر رنگوں کا خوبصورت امتزاج اور علاقائی کلچر کی واضح تصویر ملتی ہے۔ "تحریک و تشکیل" "پاکستان گولڈن جوبلی نمبر" ہر طرح سے نفس مضمون کی عکاسی کرتا ہے۔ "گوشہ پاکستان" بسلسلہ گولڈن جوبلی بڑی مہارت اور جانفشانی کا مرقع نظر آتا ہے۔ "عکس ترتیب" میں عنوانات کا تنوع بڑا دلکش ہے۔ مضمون لکھنے والے اساتذہ حضرات اور طلباء نے بڑی کاوش کی ہے۔ پروف ریڈنگ کمال کی ہے کہ مجلّہ اغلاط سے پاک ہے۔

ج) "پاکستان اور ملتان" کے زیر عنوان جناب "اسد ملتانی"۔ "قومی شاعری کی روایت اور ملتان" از ڈاکٹر مختار ظفر میں بہت ہی خوب مواد پڑھنے کو ملا۔ ولی مظہر ایڈووکیٹ جو گورنمنٹ ایمرسن کالج ملتان کے سابقہ طالب علم اور کہنہ مشق صحافی ہیں، کے "جنگ آزادی ۱۸۵۷ء اور ملتان" کے جاندار مضمون نے مجلّہ کو رونق بخشی۔ ڈاکٹر مختار ظفر کا مضمون "تاریخ ملتان کا ایک خونیں ورق" نے تاریخ ملتان کے خونیں باب کی نشاندہی کی ہے۔ تاریخ ملتان کے اس منفرد واقعہ نے ملتان کو حیات دوام سے ہمکنار کیا ہے۔ اور مجلّہ کی افادی حیثیت کو چار چاند لگائے ہیں۔ یہ مضمون قاری کیلئے تاریخ ملتان کا ایک اہم باب تصور ہوگا اور مورخ اس سے خوشہ چینی کرے گا۔

ڈاکٹر شمیم حیدر ترمذی نہایت قابل استاد اور بہت بڑے مصنف ہیں۔ "خیال و نظر" کے زیر عنوان ان کا مضمون "اسلامی ثقافت کی اقدار اور ہم" ایک بلیغ اور جامع مضمون ہے۔ دیگر اساتذہ حضرات کے مضامین بھی خاصے معتبر ہیں

مختصر یہ کہ یہ مجلّہ میری نظر میں پہلا مجلّہ ہے جس پر مرتب ڈاکٹر مختار ظفر نے نہایت دیدہ ریزی اور جانفشانی سے کام لیکر خوبصورت get up میں مضامین کی ترتیب و تشکیل اور چناؤ کیا ہے جس کے لئے مجلس ادارت اور پرنسپل کالج تحسین و آفرین کے مستحق ہیں۔

عبدالمجید خان ساجد

"مسلک" ۱۹۹۷ء ایک نظر میں

طلبہ میں ذوق مطالعہ کا فقدان ہے، ادبی ذوق اور لکھنے کا شوق بھی کم ہے اور کالج کے رسائل کا معیار بھی گر رہا ہے۔ بلکہ کئی کالجوں میں تو برسوں تک رسالہ چھپتا ہی نہیں۔ ایسی صورت حال میں ایک معیاری رسالہ نکالنا ہر اعتبار سے قابل ستائش ہے۔ ڈاکٹر مختار ظفر باذوق اور محنتی استاد ہیں۔ وہ معیار کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن ملتان کا علمی و ادبی مجلّہ "مسلک" جو پاکستان گولڈن جوبلی نمبر ہے۔ ان کی ریاضت اور کاوش کا قابل داد حاصل ہے۔ اس مجلّے کا معیار انتخاب لائق مطالعہ ہے۔ حسن طباعت بھی قابل تحسین ہے۔ اساتذہ کے ساتھ ساتھ طلبہ کی تحریریں بھی طلبہ کے ادبی ذوق کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ڈاکٹر مختار ظفر نے منتخب اقتباسات کو بھی ادبی رسالے کی زینت بنایا ہے۔ ان اقتباسات کا حسن انتخاب بھی ان کی وسعت مطالعہ پر دال ہے۔ طلبہ اور اساتذہ کے علاوہ چند نامور مصنفین کی گراں قدر تحریروں نے بھی اس مجلّے کو دلکش بنا دیا ہے۔ پاکستان اور ملتان کے حوالے سے ملتان کا خصوصی مطالعہ بھی قابل تذکرہ ہے۔ مجھے "مسلک" ہر لحاظ سے ایک معیاری رسالہ نظر آتا ہے اور کالج کے رسالوں میں ایک نمایاں مقام رکھتا ہے اس لئے سزاوار تقریظ ہے۔ اس کا کریڈٹ مشہور ادیب و شاعر اور نقاد ڈاکٹر طاہر تونسوی کو جاتا ہے جن کی رہنمائی میں یہ رسالہ مرتب ہوا۔

ڈاکٹر محمد امین

کھلاڑی کا اعزاز

رانا محمد یونس کلاس بی۔ایڈ ۹۷-۱۹۹۶ء رول نمبر ۳۳۳ نے پہلے "ملتان سپورٹس میلے" میں شرکت کر کے مجموعی طور پر دوسری پوزیشن حاصل کی اور کالج کے بالکل اکیلے ایتھلیٹ نے تمام ایونٹس میں حصہ لے کر پہلی اور دوسری پوزیشن حاصل کر کے سیکنڈ ٹرافی جیتی۔ اور موجودہ سیشن ۹۷-۱۹۹۶ء کی کالج کی سالانہ کھیلوں میں بہترین کھلاڑی Best Athelete قرار پائے اور ہاپ سٹیپ اینڈ جمپ ۴۰ فٹ لگا کر ریکارڈ ہولڈر قرار پائے۔
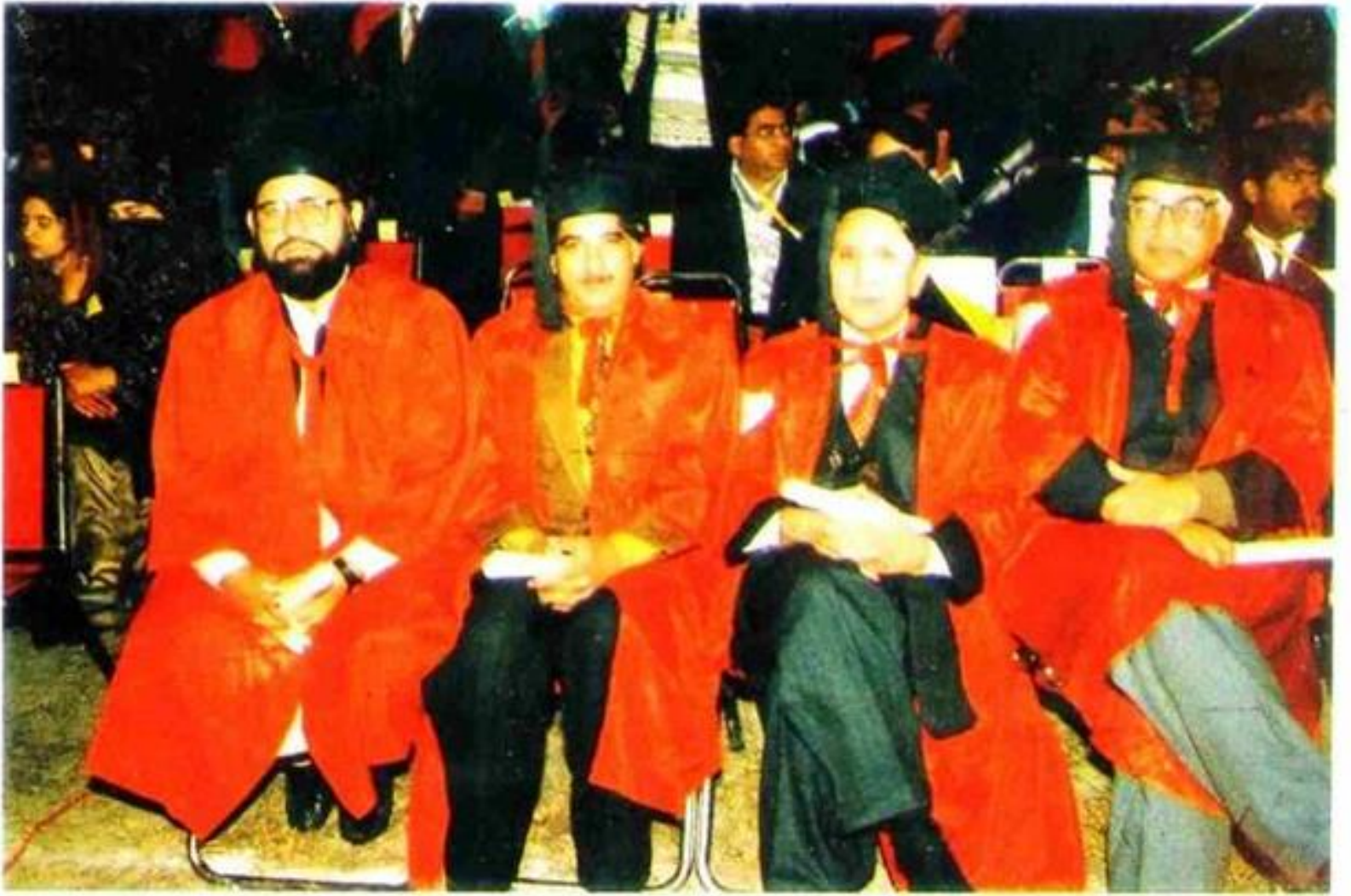
بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی کی کانووکیشن کی تقریب منعقدہ 29 دسمبر 1997ء میں سیکرٹری ہائر ایجوکیشن ڈاکٹر شہزاد قیصر' ڈاکٹریٹ کی سند وصول کرنے کے لیے تشریف فرما ہیں' ڈاکٹر زماں اشرف اور ڈاکٹر مختار ظفر یمین ویسار ہیں۔

کانووکیشن منعقدہ 29 دسمبر 1997ء میں چانسلر بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی' جناب شاہد حامد سے ڈاکٹر مختار ظفر' ڈاکٹریٹ کی سند وصول کر رہے ہیں' وائس چانسلر ڈاکٹر عاشق محمد خاں درانی درمیان میں موجود ہیں۔
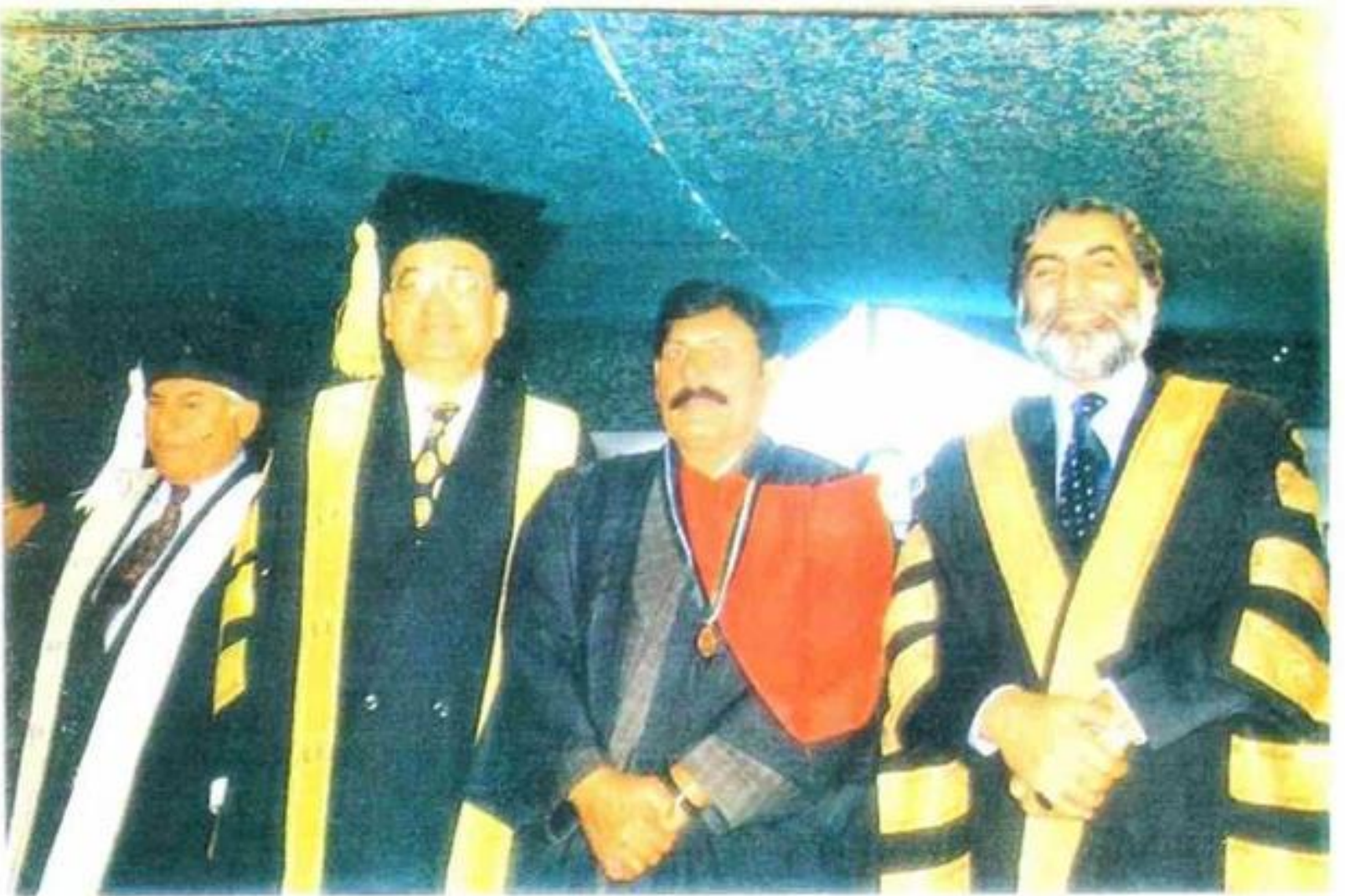
بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی کی سیکنڈ کانووکیشن کے موقع پر ادارہ ہذا کے لیکچرار ملک غلام مصطفیٰ سمو BED کلاس میں اول پوزیشن حاصل کرنے پر یونیورسٹی کانووکیشن منعقدہ 29 دسمبر 1997 میں گولڈ میڈل حاصل کرنے کے بعد' جناب محمد اقبال خاکوانی وزیر صحت گورنر پنجاب شاہد حامد اور وائس چانسلر ڈاکٹر محمد عاشق خان درانی کے ہمراہ
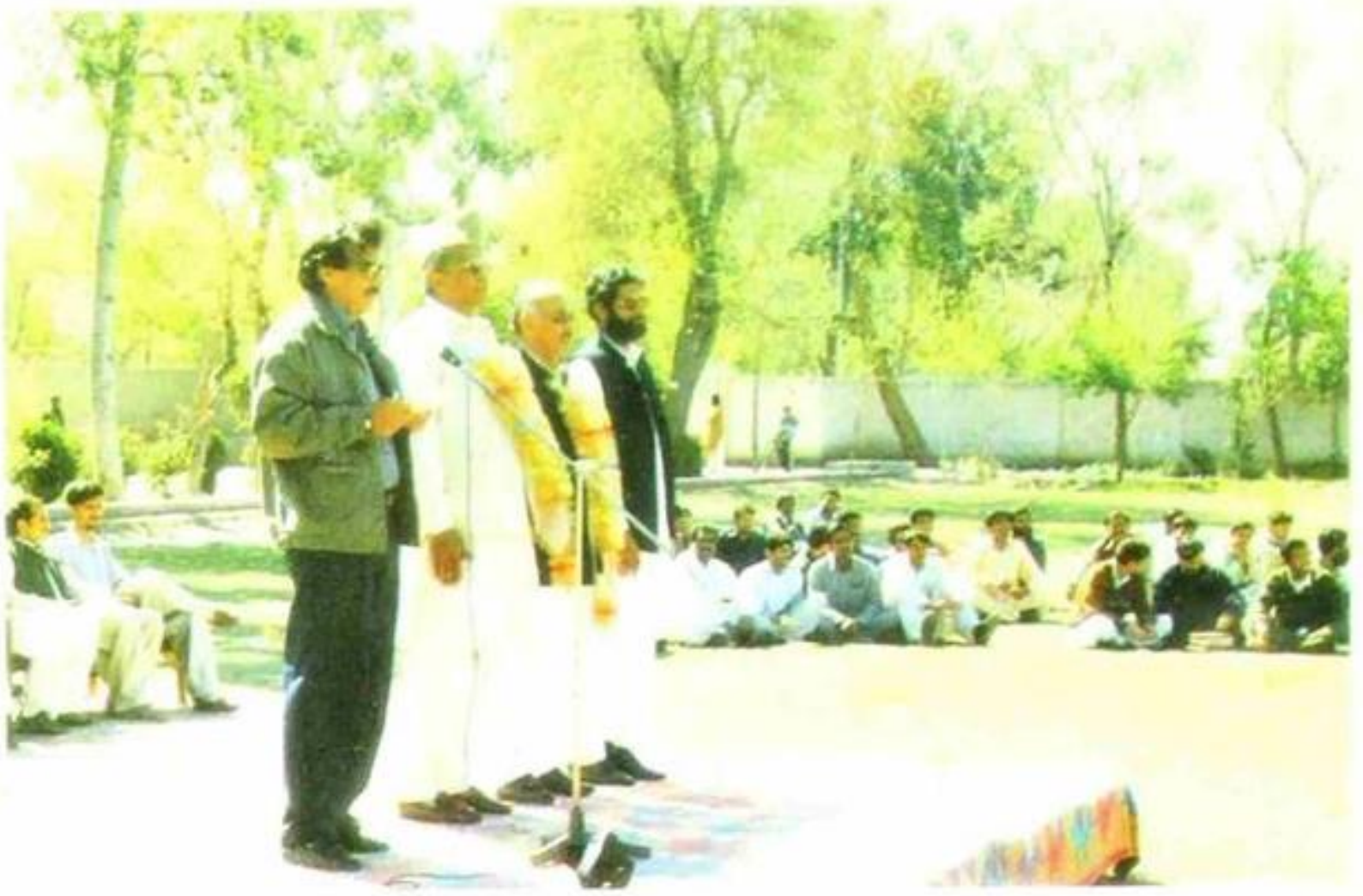
سالانہ اتھیلٹکس میں پریڈ کی سلامی کے موقع پر پروفیسر ملک بشیر احمد، پرنسپل ڈاکٹر طاہر تونسوی اور وائس پرنسپل محمد آزاد چودھری ڈائس پر کھڑے ہیں اور ڈاکٹر مختار ظفر اظہار خیال کر رہے ہیں

اساتذہ کا گروپ فوٹو (سالانہ کھیلوں کے موقع پر)

سالانہ اتھلیٹکس ' اساتذہ اور طلبہ

پروفیسر محمد سعید احمد ' پروفیسر جاوید فرید اور پروفیسر فاروق انصاری
سالانہ اتھلیٹکس

I should end my article by quoting a translation from a poem of a German poet-Philosopher Pannwitz (D. 1969) who was extremely appreciative of Iqbal's philosophy and thoughts. He says:-

> *"Every great poetry is part of the time and at the same time more than the time. It completes time, takes out its not yet unfolded germinal layers, e.g., that what it lacks, what future should bring, and what is valid for eternity. It is time's mirror, it is not passive but active history, prophesy which helps creating history. Great poetry opens in the souls of the contemporaries a productive process which is stranger than any presence, and which is able to tear out of it the future, or to deliver future from it."*

This perfectly applies to Iqbal's poetry.

"Medio tutissimus ibis."
You will go most safely
in the middle.
"Inopem me copia fecit."
Plenty makes me poor.
[Metamorphoses - OVID]

of his poems 'Javid Nama' Iqbal has inserted as a kind of incantation to call back the spirit of Maulana".

But the concept of Rumi about the relationship between man and his society is not clear. Whereas Iqbal's ideal man devotes all his faculties both of head and heart to the welfarer of his "millat". In his Masnavi "Secrets of self-devotion" (Rumuz-e-Bekhudi) he has dealt with this subject at length. In his view an individual and his society are mirrors to one-another. An individual is respected due to his nation and nation derives esteem from her individuals. Moreover in the words of Dr. Anne Marie Schimmel, "In his way towards the ideal state of things and that means towards the ideal man, one has to throw out every thing that hampers one's productivity and when an ideal community is supposed to emerge, it is necessary that the individual too has a firm stance of his own; the Asrar-I-Khudi" are a pre-requisite for the Rumuz-e-Bekhudi".

I here by quote some verses from "Rumuz-e-Bekhudi" to illuminate my point.

Man and society are mirrors to each other,
They are like thread and pearls, the galaxy and the stars.

An individual gets esteem from his society,
A society finds its system from individuals.

When an individual absorbs himself into society,
A drop turns as wide as an ocean!

The unity of hearts brings the community into being,
This Sina is a glow with that single flame!

Iqbal's ideal man is visionary and has creative faculties in him. If, he lacks the power of creation, he cannot be a true Muslim. In his verses Iqbal says:- ·

He who lacks the power of creation,
Is naught to us but an atheist and an agnostic
He has not taken his share of our Beauty,
He has not eaten the fruit of the Tree of Life!
Man of Truth! Be sharp and incisive like the sword,
And become the destiny of thy own world!

"Insan-e-Kamil" is like a lightening sword against falsehood, but for Truth and righteousness he is a protecting shield. his affirmation and negation are the criteria for Good and Evil. Ever great are his forgiveness, his justice, his generosity and his grace. Even in anger he knows how to be kind and merciful.

Abdul Karim Aljelli also presented an idea of a singular man (Insan-e-Kamil). But his individual is a mixture of metaphysical and spiritual elevation only. He ingnored the importance of this material world altogether. Whereas Iqbal's insan-e-kamil is a combination of social, psychological and spiritual values of life. Similarly Maulana Jalaluddin Rumi, Iqbal's spiritual teacher, also yearned for a man to appear in this world full of devils and Satan, to replace them all. According to Dr. Anne Marie Schimmel, "The search of this man forms an integral part of Mulana's poetry. No less than three times has he alluded to the story of the philosopher (sheikh) who goes around with the lantern in search for man, and it is not astonishing that in the most famous

limits to the expansion of an individual. His superman has no faith in humility, goodness, obedience, forbearance, pity, justice, kindness and other values of life. All these he calls the ethics of the slaves. The ethics of the masters are ruthlessness, independence, unlimited strength, self-effort and boundless progress. The weak has no right to live. Merciful God has no role to play, rather He has cease to live.

Being a Muslim thinker Iqbal could not go all the way with Nietzsche. Iqbal's ideal man is a blend of modesty, humility, humanity, pity, forbearance, justice and other ethical values of life. In other words Nietzsche's ideal man is manifested in the shape of Chengiz Khan, Haluku and Hitler etc. where as Iqbal's "Insan-e-Kamil" is the most virtuous personality of Muhammad, the messenger (PBUH), who stands unparallel in the annals of humanity. So keeping in view the teachings of the prophet, Iqbal advises us to be kind, loving, courageous, determined, upright and just. He says:-

What is Admiyat (humanism)? Respect for man,
To learn to appreciate true place in life's economy!

The man of love learns the ways of God,
And is benevolent alike to the believer and the unbeliever!

Hold fast to the ways of truth,
Rid thy self of the fear of kings and nobles,
Do not forsake justice in anger or in joy,
In poverty or in affluence!

The law of attraction makes the drop a river,
And specks of dust turn into desert under the same law.

In this world everlasting joy lies in observing the law of nature,
The lawlessness of the waves ends in mourning.

Second stage is to control one's baser self that tends to lead astray. It instigates mean desires i.e., greed, debauchery, perversion, rudeness, obstinacy and so on. Baser self of being, as laid down by Iqbal, is like a self-centred camel who is self-loved, self seeking and repugnant. Iqbal says:-

Thy baser self is like a self-centred camel,
Who is self-loved, self-seeking and repugnant,
Be a man and keep its rein in thy hands,
So thee shalt cease to be a stone and become a pearl.

After passing through these two stages, one could reach at the culmination of one's self elevation. Here comes Iqbal's supreme individual, who is an embodiment of Iqbal's philosophy and thoughts. When all the conditions to strengthen the "Khudi" are accomplished in an individual, there appears Iqbal's ideal man i.e., Insan-e-Kamil. According to Khalifa Abdul Hakim and some other critics of Iqbal, the most pervasive influence on Iqbal was that of Nietzsche. But Iqbal himself, in a letter to professor Nicholson, refuted this idea. No doubt Iqbal liked the philosophy of development, strength, self-confidence and achievement, put forward by Nietzsche, yet there is a world of difference between the two thinkers, Nietzsche was an evolutionist, who imposed no

took it only a sex-passion. On the contrary Iqbal attached wide meanings to this word. As viewed by him, love passion is not separate from reason or intellect. Mystics also held that love carries insight as well as ecstasy at the same time.

This idea comes very close to Bergson's "Elan Vital", Iqbal says,

The ecstasy of vision is also hidden in the same dust,
O oblivious! thou artn't only a believer of intellect!

If vision is the goal of the intellect,
It becomes both the path and the guide!

Iqbal has specified three stages for the training of one's ego. First step is the submission and obedience, that is yeilding to the will and the commands of Almighty Allah. Confinement of air in a flower makes it frangrance, whereas fragrance in a belly of a deer becomes musk. Similarly when one yields dutifully to the restraints and instructions of the Almighty and becomes completely obedient to Him, one is bound to acquire such a strength that everything created will obey one.

O oblivious! Try to be obedient.
Authourity comes but through submission.

Anyone who conquers the moon and the stars,
Yields oneself to the commands and the laws.

Imprisonment in a flower makes the air fragrance,
Confinement of fragrance in a belly of deer becomes musk.

Not devoid of life are these open spaces of heaven,
There are hundreds of other caravans in them as well!

Do not remain contented with this sensible world;
Beyond it there are other gardens and nests as well!

Similarly in "Javed Nama" Iqbal says:-

Life is nought but the joy of soaring,
The nest is not congenial to its nature!

According to Iqbal the source of strength to self-consciousness is love (Ishq). Love is not a cliche in Iqbal's poetry. It is a centre of gravity for Iqbal's philosophy. This is the passion which leads life to a supreme goal. Once again I quote from "Asrar-e-Khudi"

When self is fortified by love,
It becomes the law-giver to the world!

By love it is made lasting
More living, more burning, more glowing.

And a verse from Urdu ghazal,

When the self is fortified by intellect,
It is envy of Gabril:
If it is fortified by love,
It becomes the trumpet call of Israfil!

Freud Sigmund - An Austrian physician and founder of Psycho - analysis also thought this passion a source of life, but he

doctrine called "Khudi" - i.e., self-consciousness of ego, which "illuminates all human desires, feelings and ideals. It is a living principle of the universe, the foundation of all human endeavor and achievements Iqbal says:-

The luminous point whose name is the self,
Is the life spark beneath our dust!

Since the life of the universe comes from the strength of the self,
Life is in proportion of this strength.

When a drop of water gets the self's lesson by heart,
It makes its worthless existence a pearl!

When life gathers strength from the self,
The river of life expands into an ocean!

According to Iqbal, constant sturggle and conflict are inevitable for the development of "Khudi". In this respect, Iqbal seems to be influenced by Hegel's Philosophy of Dialectics.

Friedrich Hegel, a German philosopher, held that evolution of life depended upon endless struggle and conflict. Marx's theory of "Dialectic-Materialism" was also evolved from Hegel's doctrine. Life as viewed by Iqbal, is always at war. It is an arena for constant adventure and endless struggle. This struggle is not confined to this material world, but it stretches itself beyond the heavens and the stars as well. Iqbal says,

Beyond the stars there are still other worlds,
There are other fields to test man's indomitable spirit.

CONCEPT OF SELF-CONSCIOUSNESS AND THE MAN IN IQBAL'S POETRY

Prof. Dr. A.B.Ashraf
Deptt. Of Urdu Language
& Literature. D.T.C.F
Ankara University.

Fall of the Muslim empires all over the world started in second half of the 18th century and it reached its climax in the 19th century. Tunis, Egypt, Sudan, Libya and many other African and Arab states fell prey to the aggression of Britain, France and Italy. Persia became a target of Russian ambition. Britain annexed India and subjugated the people of the Sub-Continent. Turkey was also at the brink of disintegration and disaster. Allied forces occupied Istanbul, whereas Greek army entered Izmir. But at this critical conjuncture, Turks, were the only Muslim nation which did not lose heart, rather rose to the occasion. With such a great a leader as Mustafa Kamal Pasha at its head, the Turkish army inflicted a humiliating defeat to the Greek Forces and exhibited such a valour that led to the withdrawl of the allies from Istanbul. But this was a unique example of bravery by an individual nation, otherwise all other Muslim states, were virtually licking the dust.

This poor plight of the Muslim all over the world motivated Iqbal to write such a poetry as could infuse in them a new spirit of self-reliance and determination. So through the luminous spark of his poetry he gave a message of hope for freedom, love for action and a spirit for endless struggle. For this message Iqbal construed a

EDITORIAL

Dear Readers!

The latest shining edition of "The Maslak" is glowing in your hands. Whereas every new edition ought to be innovative, we have tried to retain the splendour of the past harmony by decorating the latest edition with heightened innovations. Our magazine can reach upto the lofty heights of literature and language as well with the grace of Allah and your active participations.

"The Maslak" should be the representative of the collective image of Govt. College of Education and we have tried to reach the set standards. You will find different views of interest in our magazine which shows that the evaluation of intelligentia is always here. You will find the subjects from science to the grandeur of literature in the very magazine to satisfy your own ideals.

A lot of efforts are involved in the compiling of this magazine. English section may be little but for the message - receiver, semantics are always vast and deep.

May you enjoy the reading.

Student Editor

Syed Hammad-Ur-Rahman.

The MASLAK

1998

Govt. College of Education
Multan.